لسانی مطالعے
گیان چند

لِسانی مُطالعے

لسانی مطالعے

ڈاکٹر گیان چند

ترقیِ اردو بورڈ
نئی دہلی

جنوری ۱۹۷۲ء (پوسا ۱۸۹۴ء)

پہلا ایڈیشن   دوسرا ایڈیشن ۱۹۷۹ء (۱۹۰۱ شک)

قیمت 7/75 روپے

ORIGINAL TITLE : LISANI MUTALEY

پرنسپل پبلی کیشن آفیسر، بیورو فار پروموشن آف اُردو نے راکیش پریس A-7 نرائنا انڈسٹریل ایریا فیز II نئی دہلی
سے چھپوا کر ترقی اُردو بورڈ، ویسٹ بلاک 8 راما کرشنا پورم نئی دہلی کے لیے شائع کیا۔

پیش لفظ

علم، دنیا کی سب سے بڑی دولت ہے۔ قوموں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ ذخیرۂ علوم ان کی اپنی زبانوں میں دستیاب ہو۔ اردو والوں کی ذہنی اپج، فکری بالیدگی اور ان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے بھی ضروری ہے کہ اردو زبان میں عصری علوم اور فنون سے متعلق بنیادی، معلوماتی اور معیاری کتابیں شائع ہوں۔ چنانچہ ترقی اردو بورڈ/ بیورو فار پروموشن آف اردو نے عصری ضروریات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابوں، بچوں کے ادب، لغات، فنی اصطلاحات اور انسائی کلو پیڈیا کی تیاری کے علاوہ عام مطالعے کی سائنسی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے۔

اب تک بیورو نے خاصی تعداد میں کتابیں شائع کی ہیں جن کو ادبی حلقوں میں کافی پسند کیا جا رہا ہے۔ بعض کتابوں کے تو دوسرے اور تیسرے ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی اشاعتی پروگرام کا ایک حصّہ ہے۔ امید ہے کہ اسے علمی اور ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

بیورو فار پروموشن آف اردو،
وزارتِ تعلیم اور سماجی بہبود،
حکومتِ ہند

انتساب

اپنے مخلص کرم فرما

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

پی ایچ۔ڈی۔ ڈی لٹ (پیرس)

پروفیسر و صدر شعبۂ لسانیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کے نام

فہرست

مقدمہ

اُردو میں لسانیات کی ابتدا ڈاکٹر زور کی کتاب "ہندوستانی لسانیات" سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک سناٹا رہتا ہے۔ آزادی کے بعد ہند و پاک دونوں ممالک میں اس موضوع پر اکا دُکا کتابیں لکھی گئیں۔ پچھلے دس سال سے رسالوں میں لسانیات پر مضمون بھی دکھائی دینے لگے ہیں۔ شروع شروع میں عام قارئین ان مضامین کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے تھے لیکن اب ان کی بھڑک کم ہو گئی ہے

لسانیات کی جدید شاخ تجزیاتی لسانیات ہے جس کا اہم ترین شعبہ صوتیات ہے۔ اُردو میں اس کا مطالعہ بہت ابتدائی منزل میں ہے۔ ابھی تک اُردو میں اس موضوع پر کوئی مکمل کتاب نہیں۔ مضامین معتدبہ ملتے ہیں۔ آئندہ اوراق میں بیشتر اسی کی طرف توجہ کی گئی ہے

میں نے اپنی محدود وسائل کے باوجود اُردو صوتیات کے بعض مسائل پر غور و خوض کیا اور اپنی فکر کے نتائج قلم بند کر لیے۔ ان کے بارے میں میں نے اپنے لسانیات کے استاد، ڈاکٹر اشوک کیلکر، ریڈر شعبۂ لسانیات دکن کالج پونا سے بالتفصیل تبادلۂ خیالات کیا۔ ان سے صاد کرانے کے بعد ہی میں نے انھیں سپردِ قرطاس کیا۔ 'اُردو مصوتے'، 'اُردو کی غنائی اصوات'، اور 'اُردو میں بل اور زور' ایسے مضامین ہیں جن کے بیشتر مشمولات موصوف کی نظر سے گزر چکے ہیں۔

اپنی صوتیاتی کھوج کے ذیل کے نتائج پر فاضل قارئین کی توجہ چاہتا ہوں:

۱۔ اُردو میں ہندی سے مشترک دس مصوتے معروفِ عام ہیں۔ تین خفیف مصوتوں یعنی خفیف اے (نہر)، خفیف اے (سہرا) اور خفیف اَو (کہرام) کو تین مختلف اشخاص نے غالباً ایک دوسرے

سے آزاد طریقے سے دریافت کیا۔ یہ ہیں حیات اللہ انصاری[1] صاحب، شان الحق حقی[2] صاحب اور راقم الحروف[3]۔
بعد میں میں نے ایک چودھواں مصوتہ بھی دریافت کیا جو اُردو سے مخصوص ہے اور ہندی میں نہیں پایا جاتا۔ یہ خفیف اَو (شوا) ہے۔ تفصیل 'اُردو مصوتوں' کے باب میں ملاحظہ ہو

۲۔ اُردو میں جڑواں مصوتوں کی تعیین

۳۔ خفیف ہم مخرج مصوتوں کی دریافت (باندھا، منڈیر، مانجھا، منگانا) جنھیں گلیسن نے PRE-NASALISED STOPS کہا ہے ان کی تفصیل اس مجموعے کے مضمون 'اُردو کی غنائی اصوات' کے آخری حصّے میں ملے گی

۴۔ مشہور ہے کہ ہندی انوسوار ہمیشہ مصوتے کے بعد میں آتا ہے۔ میں نے لہنگا، الہنگا، منہدی جیسے چند الفاظ کی نشان دہی کی جس میں انوسوار ہے لیکن مصوتے کی بجائے ہ کے بعد آتا ہے۔

۵۔ اُردو میں لفظی بل کے قوانین کی دریافت ڈاکٹر اشوک کیلکر نے اپنی انگریزی کتاب ہندی اُردو میں نقل کیا ہے۔

۶۔ اُردو عروض میں لفظی بُل کی کارفرمائی کا انکشاف

اُردو ہندی کے مسئلے پر اس مجموعے کے تین مضامین "اُردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ" "اُردو اور ہندی" اور "زبان کا مسئلہ" میں قاری کو بہت سا مواد ملے گا۔

مجموعے کے مختلف مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے اس لیے اس میں کہیں کہیں تکرار راہ پا گئی ہے اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔

اس مجموعے کی اشاعت کے لیے میں محترمی پروفیسر محمد مجیب، نائب صدر ترقی اُردو بورڈ نیز محبی ڈاکٹر مسعود حسین خاں رکن لسانیات کمیٹی ترقی اُردو بورڈ کا ممنون ہوں۔

گیان چند

---

[1] کشمیری زبان کے لیے ایک رسم الخط از حیات اللہ انصاری اُردو ادب، دسمبر ۶۰ء صفحہ ۵۴-۵۵

[2] اُردو زبان کی رومن املا از شان الحق حقی اُردو نامہ بابت اپریل تا جون ۶۰ء ص ۸۱

[3] اُردو مصوتوں کی صحیح تعداد از گیان چند نیا دور ستمبر ۶۱ء

لسانیات کے مطالعے کی افادیت

اس مضمون کو ایک نجی تجربے کے بیان سے شروع کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ایک بار میرے ایک کرم فرمانے کہا۔

"آپ نے یہ کیا لسانیات پر لکھنا شروع کر دیا ہے۔ کچھ ادبیات پر لکھیے۔ آپ مجھے معاف کریں گے۔ جس طرح پہلے زمانے میں کہا جاتا تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اسی طرح آج کل یہ سچ ہے کہ بگڑا ادیب لسانیات نگار"

ان کا یہ مفروضہ صحیح ہو کہ نہ ہو لیکن اس سے یہ سچائی ضرور سامنے آجاتی ہے کہ اردو میں لسانیات کس قدر نامقبول ہے۔ کسی رسالے میں لسانیات پر کوئی اصطلاحی مضمون لکھیے تو دل کو یہ خلش رہتی ہے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے والے مشکل سے دس افراد ہوں گے۔ بقیہ یہی کہیں گے کہ قابلیت کی نمود کر رہا ہے۔

محمد حسین آزاد نے نیرنگ خیال کے دیباچے میں انگریزی کے مقابلے میں اردو ادب کی تنگ دامانی پر ماتم کیا تھا کہ تہذیب کے دربار میں آج اردو صفِ آخر میں کھڑی ہے۔ کیا تمھیں اس کی یہ بیکسی گوارا ہے؟ انھوں نے جو بات اردو انشا کو پیشِ نظر رکھ کر کہی تھی وہی بات آج لسانیات کو لے کر اردو پر صادق آتی ہے۔ مغربی زبانوں کو تو چھوڑیے ہندوستانی زبانوں کا دربار ہو تو اس میں بھی اردو سب سے پیچھے رہے گی۔ اردو والے لسانیات کیوں پڑھیں اور اس موضوع پر کیوں لکھیں اس مسئلے کے افادی پہلو پر غور کرنے سے پہلے یہ دلیل سامنے آتی ہے کہ اردو والوں کو لسانیات اس لیے پڑھنی چاہیے کہ ہندوستان کی دوسری تمام زبانوں والے پڑھ رہے ہیں۔ چاند پر زندگی کے آثار نہیں لیکن اس کے باوجود امریکہ اور روس دونوں وہاں پہنچنے کی قیمتی دوڑ میں لگے تھے محض اس لیے کہ فریقِ ثانی اس شغل میں لگا تھا اور ایک دوسرے سے پیچھے نہ رہنا چاہتا تھا۔ اردو کو بھی دوسری ہندستانی زبانوں کے دوش بدوش چلنا ہے۔

لسانیات میں اردو کا کیا مقام ہے اس کا اندازہ ہر سال گرمیوں میں منعقد ہونے والے گرمائی

اسکول لسانیات میں ہوتا ہے۔ ان میں تقریباً سوا سو متعلّم شرکت کرتے ہیں۔ پانچ سات کے علاوہ یہ متعلّم دراصل کالجوں اور یونیورسٹیوں کے کسی زبان وادب کے شعبے کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ تعداد ہندی کے معلّموں کی ہوتی ہے اور سب سے کم اردو کے۔ اردو والے دو یا تین سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ واضح ہو کہ نصاب کسی مخصوص زبان سے وابستہ نہیں ہوتا۔ درس صرف انگریزی زبان میں دیا جاتا ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جنوب کی چاروں ریاستوں، مہاراشٹر، گجرات وغیرہ میں ہندی کے پڑھانے والے انھیں ریاستوں کے اصل باشندے ہوتے ہیں۔ مدراس یونیورسٹی کا شعبۂ ہندی تامل بولنے والے اساتذہ پر مشتمل ہے تو میسور بنگلور کا کنڑ بولنے والوں پر۔

لسانیات اسکول میں تمام زبانوں اور ریاستوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔ وہاں اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں لسانیات کے بڑے علما غیر ہندی والوں میں سے ہیں ہندی والے نہیں۔ طلبہ میں بھی (جو دراصل اپنی درس گاہوں میں لکچرر رہتے ہیں) دوسری زبان والوں کو لسانیات میں جو دخل اور درک ہوتا ہے وہ ہندی والوں کو نہیں ہوتا اور اس کی خاص وجہ انگریزی کا ذریعۂ تعلیم ہونا ہے۔ یہ طے ہو جانے کے بعد کہ ہندی والے لسانیات میں کئی دوسری زبانوں سے پیچھے ہیں ہندی اور اردو کا مقابلہ کیا جاتا ہے۔

مختلف یونیورسٹیوں سے ایم۔ اے ہندی کرنے کے بعد ہندی کے کسی لسانیاتی موضوع پر پی ایچ ڈی کرنے والوں کی تعداد دیکھیے وہم وقیاس سے زیادہ ہوتی ہے۔ آگرہ یونیورسٹی کی فہرست نظر سے گزری جس میں اب تک ہندی میں پی ایچ ڈی کرنے والوں کے نام اور موضوع بھی دیے تھے اور ان کے بھی جو آج کل محوِ ریسرچ ہیں۔ اس فہرست میں لسانیات کے اتنے زیادہ اور اتنے متنوع موضوعات تھے کہ دیکھ کر ہوش پرّاں ہو گئے۔ ہندی کی کوئی بولی اور کوئی اہم مصنف باقی نہیں جس کا لسانیاتی مطالعہ نہ کیا گیا ہو۔ کسی کالج یا یونیورسٹی کی لائبریری میں ہندی کا سیکشن دیکھیے موٹی موٹی جلدیں رکھی ہوں گی سور کی بھاشا، تلسی کی بھاشا وغیرہ۔ اردو میں کسی ادیب کی زبان پر ایک کتاب نہیں۔ بلا مبالغہ اردو اور ہندی میں لسانیاتی کتابوں کا تناسب ایک اور پچاس کا ہوگا اس سے کم نہیں۔

اردو میں لسانیات کی قابلِ ذکر کتابیں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں اور یہ جس موضوع پر جس معیار کی ہیں ہندی میں اس موضوع اور اس معیار کی کتابیں اردو کی کتابوں سے کم از کم تیس سال پہلے وجود میں آ چکی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی کو تو سرکاری سرپرستی حاصل ہے، اس کا ہر طرف بول بالا ہے۔ اردو کو کون پوچھتا ہے؟ لیکن پاکستان میں تو اردو کو سرکاری پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ ہم اردو کے ذخیرے پر نظر کرتے ہیں تو ہند و پاک دونوں کی تحریروں کو شامل کر لیتے ہیں کیونکہ ابھی تک اردو ادب کی تقسیم نہیں ہوئی

ہندو پاک کا اردو ادب ایک اکائی ہے۔ اس طرح لسانیات کے باب میں اردو کے بے نہایت افلاس کے سبب اردو میں لسانیات کے ذکر و فکر کی اشد ضرورت ہے۔

بیسویں صدی کے ربعِ اوّل میں گریرسن نے ہندوستان کا لسانیاتی جائزہ لیا تھا۔ یہ جائزہ سرانجام دے کر گریرسن نے ہمارے ملک کی بہت بڑی علمی خدمت کی لیکن اس کا طریقِ کار سائنسی نہ تھا۔ اس نے نثر کے ایک ایک دو صفحات لکھ کر کلکٹروں کو بھیج دیے اور انھوں نے پٹواریوں کی مدد سے ان کا مقامی بولی میں ترجمہ کرا دیا۔ اس ترجمے کو دیکھ کر گریرسن نے فیصلہ کیا کہ کس علاقے کی کون سی بولی ہے اور کس زبان اور بولی کا کون سا علاقہ ہے۔ جہاں زبانوں یا بولیوں کے ڈانڈے ملتے ہیں وہاں کا تشفی بخش مطالعہ لسانیات میں تربیت یافتہ شخص ہی کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے سے اب تک آبادی میں بہت کچھ نقلِ مکانی ہوا ہے جس کی وجہ سے گریرسن کا جائزہ موجودہ صورتِ حال کی صحیح تصویر پیش نہیں کرتا۔ اشد ضروری ہے کہ ماہرینِ لسانیات کی مدد سے ملک کا از سرِ نو لسانیاتی جائزہ لیا جائے۔ مردم شماری کے انداز پر اس جائزے کے لیے دو ہزار والنیٹروں کی ضرورت ہوگی۔ وہ کہاں ہیں! ۱۹۵۳ء تک ہمارے ملک میں صرف دو درس گاہوں کلکتہ یونیورسٹی اور دکن کالج پونا میں لسانیات کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ لسانیات میں تربیت یافتہ والنیٹروں کی ضروری تعداد بہم پہنچانے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں پانچ ہفتے کا اسکول کیا جائے جس کی مدد سے پندرہ بیس سال میں لسانیات کی مُبادیات جاننے والے کافی تعداد میں مل سکیں گے۔ موسم گرما کے یہ اسکول بڑی کامیابی سے چل رہے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ہماری حکومت کب لسانیاتی جائزے کا منصوبہ بناتی ہے۔ آج جو یہ بحث ہوتی ہے کہ پنجاب و ہریانہ یا میسور و مہاراشٹر کے سرحدی اضلاع کی زبان کیا ہے اگر ایک باقاعدہ سائنٹفک لسانیاتی جائزہ ہوا ہوتا تو ہر مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا۔ ہر سوال کا صحیح صحیح غیر جانب دارانہ جواب پہلے سے ہی موجود ہوتا۔ مغرب کے ممالک میں بولیوں کے مفصل اٹیلس بنے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کو بھی زبانوں اور بولیوں کا اٹیلس تیار کرنا ہے۔ ضرورت ہے کہ ایسے لسانیاتی جائزے کے وقت اردو والے لسانیاتی والنیٹر قابلِ قدر تعداد میں مل سکیں تاکہ اردو کے حقوق محفوظ رہ سکیں۔ اردو بولنے والی آبادی کے لحاظ سے ایسے لسانیات داں رضاکار نہ ہونے کے برابر ہیں۔

مختلف یونیورسٹیوں میں ایم اے اردو کے نصاب میں لسانیات کا پرچہ بھی ہوتا ہے، لیکن یہ اکثر محض انگلی میں لہو لگا کر شہید ہونے کے مترادف ہے۔ اردو کے آغاز کے نظریوں اور سرگزشتِ الفاظ جیسے موضوعات کو سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ جب تک تجزیاتی لسانیات نہ پڑھی جائے

زبان کی ساخت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ زبان کی بنیاد آوازیں ہیں۔ اس لیے صوتیات کے مطالعے کے بغیر لسانیات کا علم محض خام اور ناقص ہے۔ صوتیات ہی طلبہ کو سب سے زیادہ بوکھلا دینے والا مضمون ہے۔ الجبرے کی طرح عملی زندگی میں اس کی کوئی افادیت محسوس نہیں ہوتی لیکن ایسی بات نہیں۔ ذیل میں اردو کے مخصوص مسئلے سے قطع نظر عام طور سے لسانیات کے مطالعے کی اہمیت روشن کی جاتی ہے۔

قومیت نے بنی نوعِ انسان کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے پچھلی دو صدیاں سامراجیت کے عروج کا زمانہ تھیں۔ حاکم قوم محکوم قوم کو ایک فروتر مخلوق سمجھتی تھی اٹھارویں صدی میں جب تاریخی و تقابلی لسانیات کو فروغ ہوا تب معلوم ہوا کہ قوموں کی تقسیم محض جغرافیائی ہے نسلِ انسانی کی تقسیم نہیں۔ اسی صدی کے آخر میں جب سر ولیم جونس نے کالی داس کی شکنتلا کا انگریزی میں ترجمہ کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ سنسکرت، یونانی اور لاطینی ایک خاندان کی زبانیں ہیں۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ یورپ کے گورے اور ہندوستان کے کالے باشندے ایک ہی نسل کے ہیں۔ اس سے انگریزوں کے احساسِ برتری کو بڑا دھکا پہنچا لیکن اس سے وسعتِ نظر بھی پیدا ہوئی۔ قوموں کی طرح لسانیات بھی پوری بنی نوع انسان کو ٹکڑوں میں بانٹتی ہے لیکن لسانی گروہ بہت بڑے ہیں اور اکثر انھوں نے ملکی سرحدوں کو مسمار کر دیا ہے مثلاً آئرلینڈ سے بنگال تک ایک نسل ہے۔ انڈونیشیا اور دور افتادہ مدغاسکر کی زبان مماثل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں اہلِ مدغاسکر چل کر انڈونیشیا تک پہنچے۔

رسم الخط کے اشتراک کا پھیلاؤ زبان کے پھیلاؤ سے بھی زیادہ ہے۔ تبتی رسم خط ہندوستان سے ماخوذ ہے۔ چین اور جاپان کے لوگ بہ ظاہر یکساں معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی زبانوں کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے باوجود دونوں کا رسمِ خط ایک ہے۔ اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آتا ہے۔ ایک بار ایک پبلک سروس کمیشن کے صدر نے میرے ساتھ نجی بات چیت میں اردو رسم الخط پر اعتراض کیا کہ اور سب لکھاوٹیں بائیں طرف سے دائیں طرف کو لکھی جاتی ہیں لیکن اردو خط اُلٹی گنگا بہاتا ہے۔ جب میں نے انھیں بتایا کہ اردو اور انگریزی خط ایک ہی نسل سے ہیں تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اردو رسم خط بھی سامی سے ماخوذ ہے اور یونانی رسمِ خط بھی۔ یونانی کے ابتدائی حروفِ تہجی الفا، بیٹا، گاما، ڈیلٹا، عبرانی ابجد کے الف، بیت، جمل اور دالتھ کی ترمیم شدہ شکلیں ہیں۔ حیرت تو یہ ہے کہ بعض انگریزی حروف کی ترتیب آج بھی عربی ابجد سے مماثلت کا اعلان کر رہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

	K	L	M	N
کلمن یعنی	ک	ل	م	ن

Q R S T

قرشت یعنی ت ش ر ق

مختلف ملکوں کی زبانوں کے تقابلی مطالعے سے تاریخ کے بہت سے مسائل حل ہوتے ہیں۔ آریہ نسل کے باشندوں کا اصلی وطن کیا تھا یہ قدیم ترین ہند آریائی زبانوں کے بعض الفاظ سے معلوم ہوسکا ہے۔ قبلِ تاریخ دور میں آریہ کس طرح مختلف گروہوں میں مختلف مقامات پر آباد ہوئے۔ پھر وہاں سے ان کی کون کون سی شاخیں پھوٹیں یہ سب آریائی زبانوں کے باہمی تعلق اور ان کے شجرے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ یونانی سے لاطینی کا نکلنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آریہ پہلے یونان میں بسے اور وہاں سے ان کی ایک ٹکڑی اٹلی میں گئی۔ انگریزی کا جرمن خاندان سے ہونا اور فرانسیسی سے نسبتاً دور رہنا ظاہر کرتا ہے کہ انگریز قوم لاطینی گروہ سے پہلے جدا ہوئی اور جرمن سے اس کے بعد۔ یورپ کے خانہ بدوش قبائل کی ہندوستانی آمیز زبان اس بات کا اشارہ ہے کہ یہ لوگ کسی زمانے میں ہندوستان سے یورپ گئے۔ کشمیری زبان کی باقی ہند آریائی زبانوں سے علیحدگی صاف بتاتی ہے کہ کشمیر میں آریوں کا کوئی دوسرا گروہ آباد ہوا جو بقیہ ہندوپاک کے باشندوں سے الگ تھلگ اس برّعظیم میں وارد ہوا۔

مغرب میں لسانیات کو ریاضی کے انداز پر ڈھالا جا رہا ہے۔ لسانی زمانیات GLOTTO CHROMOLOGY لسانیات کا ایک نیا شعبہ ہے جس سے زبانوں کی عمر کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ایک اندازہ ہے کہ ایک صدی میں زبان کے ذخیرے میں کتنے فی صدی الفاظ میں تبدیلی ہوتی ہے۔ دو قرابت دار زبانوں میں الفاظ کے اختلاف کی مقدار دیکھ کر معلوم کیا جاسکتا ہے کہ یہ کب ایک دوسرے سے جدا ہوئیں۔ اس سے ایک لسانی برادری کے ذیلی گروہوں کے نقلِ مکانی کا زمانہ معلوم ہوسکتا ہے۔

زبان و ادب کا تعلق اتنا عیاں ہے کہ بیان کی ضرورت نہیں۔ زبان کا آغاز اور ارتقا لسانیات کا موضوع ہے جس پر نظر رکھے بغیر ادب کا مطالعہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ محض ادیب اس میدان میں جس سراب میں کھو کر رہ جاتا ہے لسانیات اس سے نکال کر صراطِ مستقیم دکھاتی ہے۔ اردو ادب کے آغاز کے بارے میں ادیبوں نے نہ معلوم کیا کیا طوطا مینا اڑائے۔ جب ماہرینِ لسانیات ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اس موضوع کو لیا تب کوئی مدلّل بات سامنے آئی۔ قدیم ادب کی فرہنگ کی تفہیم میں تو لسانیات سے مدد ملتی ہی ہے، بعض اوقات قدیم ادب کی رسمِ تحریر بھی ماہرینِ لسانیات کے طفیل ہی واضح ہوتی ہے۔

بعض اوقات ادبی مخطوطوں کا زمانہ متعین کرنے میں لسانیات سے مدد ملتی ہے۔ فارسی زبان کے عالم جانتے ہیں کہ نویں صدی کے آخر تک فارسی میں دال اور ذال دو الگ حروف نہ تھے بلکہ متبادل آوازیں تھیں جو حسبِ ضرورت بدلا کرتی تھیں۔ خدا بخش لائبریری بانکی پور میں کیمیائے سعادت کا جو مخطوطہ ہے اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ مصنف امام غزالی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد[۱] نے اس کا معائنہ کیا تو اس میں دال ذال کا وہ فرق نہ پایا جو قدیم کتابت میں ہونا چاہیے۔ اس کی بنا پر انھوں نے طے کیا کہ یہ مخطوطہ غلط طور پر ان سے منسوب ہے۔ اسی طرح فارسی خط[۲] کی کچھ اور خصوصیات ہیں، مثلاً ساتویں صدی ہجری تک کاف بیانیہ 'کہ'، 'کو'، 'کی'، لکھا جاتا تھا۔ بارھویں صدی ہجری تک گ کو ک ہی لکھا جاتا تھا۔ اردو میں پہلے پہل ٹ، ڈ، ڑ کے بالائی ط کے لیے چار نقطوں کا استعمال ہوتا تھا۔ جن مخطوطوں میں ان موقعوں پر ط لکھا ہوا ہو وہ زیادہ پرانے نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح کسی مخطوطے میں ہائے مخلوط کا دو چشمی ھ سے لکھا ہونا اس کے نئے پن پر دلالت کرتا ہے۔ زبان اور کتابت کے ارتقا سے یہ واقفیت تحقیق میں بہت سی لغزشوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ لسانیات کی ایک نئی شاخ ہے اسلوبیات۔ اس میں دریافت کیا جاتا ہے کہ کن آوازوں اور اجزائے الفاظ کی تکرار اور کمی بیشی سے اسلوب میں جان پڑتی ہے۔ یہ شعبہ ابھی عالمِ طفولیت میں ہے لیکن اس سے کسی شاعر یا انشا پرداز کا اسلوب محض ذوقی نہیں رہ جاتا بلکہ اس کے ہیتی تجزیے میں بعض اصولوں کی کارفرمائی دریافت کی جاسکتی ہے۔

- الفاظ آوازوں کے مجموعے ہیں جنھیں رسم الخط کا لباس دے کر کاغذ پر ٹانک دیا جاتا ہے۔ کسی زبان کی آوازوں یعنی مصوتوں اور مصمتوں کو دریافت کرنا صوتیات کا کام ہے اس لیے صحیح رسم الخط صوتیات کی نگرانی ہی میں تیار ہو سکتا ہے۔ کسی زبان کے موجودہ رسم الخط میں جو خامیاں ہیں ان کی گرفت اور تدارک صوتیات ہی کر سکتی ہے۔ جو بزرگ جدید صوتیات سے بے بہرہ ہیں وہ جب اس موضوع پر کچھ لکھتے ہیں تو وہ ہوا میں لاٹھی چلانے کی مثال ہو جاتا ہے۔ جو معالج جسمِ انسانی کی ساخت اور تشریح اعضا سے واقف نہ ہو وہ کیا تشخیصِ مرض کرے گا اور کیا علاج تجویز کرے گا۔

صوتیات کا ایک اور مفید کام یہ ہے کہ جن زبانوں کے پاس اپنا رسم الخط نہیں ہے۔ ان کی آوازوں کا تجزیہ کرے اور اسے ایک رسم الخط دے۔ اگر اسے کسی دوسری زبان کا خط دیا جائے تو اس میں حسبِ ضرورت ترمیم و اضافہ کرے۔ قبائلی زبانوں میں تحریر کا رواج نہیں ہوتا۔ ماہرین صوتیات

---

[۱] و [۲] تحقیق و تصحیح متن کے مسائل از ڈاکٹر نذیر احمد مشمولہ نقوش بابت مارچ ۱۹۶۳ء

ان زبانوں کو سیکھ کر اور آوازوں کی صحیح صحیح تفریق کرکے ان کے لیے رسم تحریر فراہم کرتے ہیں۔ اس طرح ان زبانوں کا عوامی ادب قلم بند کرکے محفوظ کرلیا جاتا ہے۔ کشمیری جیسی ترقی یافتہ اور ہم سے اتنے پاس کی زبان کے معاملے میں یہ کوئی بڑا کارنامہ معلوم نہ ہو لیکن جب دور دراز افریقہ کے قبائل کی اجنبی زبانوں سے سابقہ پڑتا ہے تو ان کی آوازوں کا تعین ہی بڑا مسئلہ ثابت ہوتا ہے۔ ماہرینِ لسانیات اس سے دوچار ہیں جو زبانیں ابھی تک تقریری منزل میں ہیں صوتیات انھیں تو رسم الخط میں ڈھالتی ہی ہے ان کے علاوہ اگر کبھی کبھار ترقی یافتہ زبانوں کے اقتباسات یا الفاظ کو دوسری زبان کے رسم الخط میں لکھنا پڑتا ہے تو صوتیات ہی اس کی مخصوص آوازوں کی ادائیگی کی ضمانت کرتی ہے۔ پنجابی کا مخصوص رسم الخط گورمکھی ہے جو اس کی آوازوں کا احاطہ کرتا ہے لیکن پنجابی کو اگر اردو یا ہندی خط میں لکھنا ہو تو اول الذکر کی چند مخصوص آوازوں کے لیے صوتیات کی مدد سے نشانات وضع کرنے ہوں گے۔ اس قسم کا عمل ہر زمانے میں ہوا ہے۔ فارسی نے جب عربی رسم الخط اختیار کیا تو اپنی مخصوص آوازوں پ۔ چ۔ گ۔ ژ کے لیے مماثل عربی حروف میں نقطوں یا مرکز کے اضافہ سے کام چلایا۔ اردو نے فارسی رسم الخط لیا تو ٹ ڈ۔ ڑ اور ہائے مخلوط والی آوازوں کے لیے نشانات وضع کیے۔ یہ اختراع خواہ کسی نے کی ہو لیکن یہ صوتیات کا عمل تھا اور ان کا مخترع اس حد تک ماہرِ صوتیات تھا۔ آج بھی یہ عمل جاری ہے۔ ہندی میں انگریزی کے اُس مصوتے کے لیے جو آ اور اُو کے درمیان ہے ایک مخصوص ماترا ایجاد کی گئی ہے اور وہ آ کی ماترا کے اوپر ایک اُلٹے قوس کا اضافہ ہے۔ اس نازک مصوتے کی گرفت اور ترجمانی ماہرینِ صوتیات ہی نے کی ہے۔

موجودہ رسوم الخط اپنی زبان کی آوازوں کو بھی سو فی صدی ادا نہیں کر پاتے چہ جائیکہ دوسری زبانوں کی آوازوں کو۔ صحت کے اعلیٰ معیار کو پیشِ نظر رکھ کر بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط ایجاد کیا گیا جس میں حسبِ ضرورت ترمیم و اضافہ سے ہر زبان صحیح صحیح تلفظ کے مطابق ضبطِ تحریر میں لائی جاسکتی ہے۔

عروض اور صوتیات کا تعلق ظاہر ہے۔ شعر کا وزن کیا ہے لغریزے کے طول یا بل کی گوناگوں ترتیبیں۔ انگریزی عروض بل پر مبنی ہے۔ اردو اور ہندی عروض صوت یا لغریزے کے طول پر لیکن لسانی حس یہ بتاتی ہے کہ اردو عروض بھی گاہے گاہے لفظ کے بل سے متاثر ہوتا ہے۔ میں نے اس مجموعے کے ایک مضمون "اردو عروض اور لفظ کا بل" میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اردو عروض کی اصلاح اور تشکیل نو کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے ہمیں ہندی اور انگریزی عروض سے بھی فائدہ اٹھانا ہوگا۔

اور مروجہ عروض کو صوتیات کی اصطلاحوں میں ڈھال کر زیادہ سہل اور زیادہ سائنٹفک بنانا ہوگا۔ عروض صوتیات کے سوا کیا ہے۔ اس کی تراش وخراش صوتیات کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔

ایک سیاح یا مبلّغ افریقہ، آسٹریلیا یا جنوبی امریکہ کے ایسے قبائلیوں کے بیچ پہنچتا ہے جہاں اب تک کوئی باہری آدمی نہیں گیا۔ وہ ان قبائلیوں کی زبان نہیں جانتا اور یہ قبائلی اس کی زبان نہیں جانتے۔ یہ لسانیات ہی کا کرشمہ ہے کہ ان انجان قبائلیوں کی زبان کو سمجھا اور سیکھا جا سکتا ہے اور سیکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مسیحی مشنریوں کی خدمات بھلائی نہیں جا سکتیں۔ قبائلیوں کی تہذیب کو باقی دنیا سے متعارف کرانا انھیں ماہرینِ لسانیات کا کام ہے جن کے لیے زبان سیکھنا ثانوی مقصد تھا۔ امریکہ میں تجزیاتی لسانیات کے فروغ کی یہی وجہ ہے کہ اس کے ذریعے ان قبائل تک رسائی ہو سکی ہے جو دوسروں کے لیے ایک بند کتاب ہیں۔ اصل مقصد ان کو عیسائی بنانا یا سیاسی طور پر اپنا ہم خیال اور پیرو بنانا ہے۔ یہ مبلّغ قبائلیوں کی زبانوں کو اس حد تک سیکھ لیتے ہیں کہ اہلِ زبان کی طرح بول سکتے ہیں۔

امریکہ کی فوج کے تینوں بازو، بحری، برّی اور ہوائی، صوتیات کا شعبہ بھی رکھتے ہیں۔ ان شعبوں میں صوتیات کی مسلسل تحقیق ہوتی رہتی ہے۔ مغربی ممالک نے جس طرح سائنس دانوں کو ایٹم بم، کیمیائی اور جراثیمی آلاتِ حرب کی تحقیق کے لیے حلقہ بگوش کر لیا اسی طرح لسانیات کو بھی فوجی ضروریات میں ملوث کر لیا۔ فوج میں شعبۂ لسانیات کے قیام کی واحد وجہ جاسوسی کے فن کی تکمیل ہے۔ دنیا کا ہر ملک اپنے سفیروں اور فوجیوں کو پیغام بھیجنے کے لیے ایک کوڈ استعمال کرتا ہے جو تھوڑے عرصے کے بعد بدلتا رہتا ہے۔ فوج کے شعبۂ صوتیات کے دو کام ہیں:

۱۔ روز روز اپنی حکومت کے لیے ایسا کوڈ تیار کرنا جو دوسروں کے لیے لاینحل ہو

۲۔ دوسری حکومتوں کے کوڈ کو فاش کر کے ان کے خفیہ پیغام جان لینا

امریکہ میں مجلس اقوام کا بھی دفتر ہے جہاں ہر حکومت کے نمائندے رہتے ہیں اور اپنی حکومتوں سے مراسلت کرتے ہیں۔ گویا جاسوسی کے مواقع سرزمین امریکہ پر کچھ بہتر میسّر ہیں۔ امریکی حکومت ان نمائندوں کے خفیہ پیغام جاننے کے لیے ان کی کوڈ توڑ لیتی ہے۔ اس معاملے میں دوست دشمن کی کوئی تمیز نہیں، ہر ملک کا کوڈ دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کوڈ کو فاش کرنے کے طریقے بالکل وہی ہیں جن سے ماضی کی مردہ زبانوں کے مجہول رسم الخط پڑھے گئے۔

امریکہ میں لسانیات کو بالکل سائنس اور ریاضی بنایا جا رہا ہے۔ لسانیات کی ایک قسم ہے کمپیوٹری لسانیات COMPUTER LINGUISTICS اس کی مدد سے منجملہ اور زبانوں کے ترجمہ

کرنے کی مشین بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ مماثل زبانوں مثلاً مغربی یورپ کی زبانوں میں ایک دوسرے سے مشینی ترجمہ ممکنات میں سے ہے اور لسانیات یہ کرکے دکھائے گی۔ اس کے علاوہ مشینوں کے ذریعے سے دنیا کی تمام زبانوں کے بیچ ایک قدرِ مشترک کی کھوج جاری ہے۔ اس کی تشکیل ہوجائے توکسی بھی زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ مشکل نہ رہے گا۔

اسکولوں میں زبانوں کی جو قواعد پڑھائی جاتی ہے اس میں مختلف اصولوں کے تحت مستثنیات کی فہرست بھی ہوتی ہے جس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ یہ اصول جامع نہیں۔ زبانوں کا مروجہ صرف و نحو بڑا پیچیدہ ہوتا ہے۔ لسانیات کا دعویٰ ہے کہ اس کے اصولوں کے تحت کسی زبان کا صرف و نحو لکھا جائے تو وہ جامع بھی ہوگا اور سہل بھی۔ میں نے اس قسم کی کوئی قواعد نہیں دیکھی۔ ترقی یافتہ زبانوں کی ایسی قواعد نہیں لکھی گئی لیکن قبائلی زبانوں میں سے بعض کی لکھی گئی ہے۔

سنسکرت میں اسم کی آٹھ حالتیں CASES ہوتی ہیں جن کی تقلید میں ہندی کے قواعد نویس بھی آٹھ حالتیں لکھتے ہیں۔ لسانیات نے انھیں مختصر کرکے محض تین حالتوں سے کام چلا لیا ہے، DIRECT , OBLIGUE , VOCATIVE , چند سطروں کے ایک چارٹ میں زبان کے ہر قسم کے اسما (مذکر، مونث۔ واحد، جمع) کی حالتوں کا احاطہ کرلیا جاتا ہے۔ اردو کے افعال مختلف زمانوں اور ان کی گردان کے قواعد بھی بڑے پیچیدہ ہیں۔ لیکن ماہرینِ لسانیات نے ان سب کو ایک چارٹ میں محصور کردیا اور اس میں تمام فعلی تبدیلیاں واضح کردیں۔

معنی کی حامل سب سے چھوٹی اکائی 'مارفیم کی دریافت سے لفظوں کی ساخت اور تبدیلی کا بیان بڑا آسان اور سائنٹفک ہوگیا ہے۔ ہماری قواعد میں مصدر کو بنیادی مادہ مان کر اس میں تبدیلیوں کا ذکر کیا جاتا تھا۔ لسانیات نے مصدر میں سے علامتِ مصدر 'نا' حذف کرکے مادہ کا تعین کیا اور اس میں مختلف اضافوں کو صوتیات کی اصطلاحوں میں ادا کیا۔

دراصل ہماری مروجہ اسکولی قواعد اہل زبان ہی کے پڑھنے کے لیے ہے۔ دوسری زبان والوں کو اس قواعد کے ذریعے زبان سکھانا بڑا بار دِہ ہے۔ جو حضرات امریکیوں اور روسیوں وغیرہ کو اردو پڑھاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ صوتیات اور لسانیات کے صرف و نحو کے بغیر قدم آگے بڑھانا مشکل ہوجاتا ہے۔ ان طلبہ کو اس کی تاب نہیں کہ دو سال تک قواعد پڑھی جائے اور تب زبان سیکھی جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ تین مہینے میں ہی وہ کچھ شُدبُد بول سکیں۔ مغربی ممالک میں ماہرینِ لسانیات نے ایسے طریقے نکالے ہیں جن سے کسی زبان کو تھوڑے عرصے میں سیکھا جاسکتا ہے۔ آج کے مصروف آدمی کے

پاس اتنی فرصت کہاں کہ کئی برس زبان سیکھنے ہی کی نذر کر دیے جائیں۔

مولیر کا ایک کردار چالیس سال تک نثر میں باتیں کرتا رہا۔ جب اسے نثر کی تعریف بتائی گئی تو حیران ہوا کہ جس چیز کو چالیس سال سے استعمال کر رہا ہے اس سے واقفیت بھی نہ تھی ہم سب بھی زبان کو ایک عمر سے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم تو مولیر کے کردار کے زمانے سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم زبان کے بارے میں نہ صرف جانیں بلکہ اس کے دروں کے عارف بھی ہو جائیں۔ زبان کے اس عرفان کے عمل کو لسانیات کہتے ہیں اور اس کے اسرار و رموز کا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

زبان اور علمِ زبان

انسان مدنی الطبع حیوان ہے ۔ ماہرینِ علم الانسان کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ بنی نوعِ انسان کی طفولیت میں بھی کوئی ایسا معاشرہ نہیں ہوا جس میں انسان خاندان کے بغیر تنہا زندگی گذارتا ہو۔ اگر متاہلانہ زندگی انسان کی گھٹی میں پڑی ہے تو یہ با آسانی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ انسان ابتدا ہی سے ترسیل و ابلاغ کا عادی ہوگا کیونکہ ترسیلِ خیالات ہی سے سماج کی شیرازہ بندی ہوتی ہے۔ خیالات کی ترسیل اور جذبات کے اظہار کے لیے انسان نے زبان کی ایجاد کی۔ ترسیل نطق ہی کے ذریعے سے نہیں ہوتی یہ اشاروں سے بھی ممکن ہے۔ اشاروں کا استعمال ازلی اور آفاقی ہے۔ اتنا مہذّب ہوجانے کے بعد بھی انسان اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اشاروں سے بے نیاز نہیں۔ دونوں ہاتھوں کو اوک بنا کر منہ سے لگانا پانی مانگنے کا اشارہ ہے۔ سر کی جنبش سے ہم "ہاں" یا "نہیں" کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح زبان کے کم از کم دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔

۱۔ شعوری آوازیں جن کے ذریعے سے انسان اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتا ہے۔

۲۔ اشاروں کی زبان۔ مخصوص معنی میں اشارے بھی زبان کے زمرے میں شامل کیے جا سکتے ہیں اشارے تین قسم کے ہوتے ہیں:

الف ۔ اشاروں کی سب سے بڑی تعداد وہ ہے جن میں آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، مثلاً ہاتھ یا سر کی جنبش۔ اسکاؤٹوں کی جھنڈیوں کے ذریعے گفتگو۔

ب ۔ جنہیں کان سے سُنا جاتا ہے۔ وقت کی تعین کے لیے گھڑیال بجانا دوڑ کا آغاز کرنے کے لیے پستول چھوڑنا۔ چٹکی بجانا۔ کسی کو بلانے کے لیے سیٹی بجانا۔

ج ۔ سب سے محدود وہ اشارے ہیں جن میں لمس سے کام لیا جاتا ہے۔ حسرت کہتے ہیں:

بزمِ اغیار میں ہر چند وہ بیگانہ رہے

ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

یہ ہاتھ دبانا اندھیرے میں بھی کارگر ہوتا ہے۔

اشارے کو الفاظ کی نسبت یہ فوقیت ہے کہ ایک ہی جنبش پورے کلام کو ظاہر کرسکتی ہے مثلاً کسی

کو بُلانے کا اشارہ۔ اس کے علاوہ اشارہ مدّعا کو مجسّم اور مشکّل کر کے پیش کرتا ہے لیکن ان کے باوجود اشارے صوتی زبان کے مقابلے میں بالکل بے دست و پا ہیں۔ ان کی دنیا بہت محدود ہے۔ یہ روزانہ زندگی کے چند خیالات و جذبات تو ادا کر سکتے ہیں لیکن بیشتر تصورات و تجربات ان کی گرفت سے باہر ہیں۔ مثلاً ذیل کے سیدھے سادے مطالب کو اشارے میں کہنا ممکن نہیں

'میں کل جاؤں گا'

'سچ بولنا چاہیئے'

'تمہارا کیا نام ہے'

ایک خیال یا تجربے کے اظہار کا کوئی بھی روپ دراصل ایک قسم کا رمز یا علامت CODE ہے۔ ہم اس رمز کو آنکھ یا کان سے محسوس کرتے ہیں اور دفعتاً ہمارا ذہن اس تصوّر کو گرفت میں لے لیتا ہے۔ اس تفہیم کے لیے ضروری ہے کہ ان علامات کو استعمال کرنے والے دونوں فریقوں کے ذہن ان سے یکساں مفہوم مراد لیتے ہوں۔ علامات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک میں خیال اور خارجی علامت میں کوئی مشابہت ہوتی ہے مثلاً کسی کو بلانے کے لیے ہاتھ سے اشارہ کرنا یا شاہی سواری کی تصویر۔ دوسری نوع میں اظہار کا روپ خیال سے بالذات کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ من مانے طور پر کوئی بھی علامت کسی بھی خیال کے لیے متفقہ طور پر متعین کر لی جاتی ہے مثلاً اسکول میں ایک مخصوص قسم سے گھنٹی بجانے کے معنی چھٹی ہو جانا۔ کسی کے گھر کے باہر سیٹی بجانے کے معنی اسے باہر بلانا۔ کسی سے ملنے پر ہاتھ کو ماتھے کی طرف لے جانا یا دونوں ہاتھوں کو جوڑنا یعنی اظہارِ تعظیم۔ الفاظ اسی قسم کی رمزیت ہیں صوتی علامت اور اس سے مراد لیے جانے والے تصوّر میں کوئی فطری رشتہ نہیں ہوتا مثلاً آگ۔ کہتے میں جو آواز ہوتی ہے اس میں سوزش یا حرارت نہیں ہوتی اس کے تلفظ سے ہونٹ نہیں جل جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صوتی علامت 'مار' سے اردو میں 'ضرب' فارسی میں 'سانپ' اور انگریزی میں 'بگاڑنا' مراد لیتے ہیں۔ پیڑ کو ہندی میں پیڑ اور فارسی میں درخت کہتے ہیں۔ اس طرح "زبان ارادۃً" پیدا کی گئی من مانی صوتی علامات کا ایک آئینِ مقررہ SYSTEM OF ARBITRARY VOCAL SYMBOLS ہے جس کے ذریعے ایک انسانی گروہ کے افراد اپنے خیالات اور جذبات دوسروں تک پہنچاتے ہیں" انسان درد میں چیختا اور خوشی میں ہنستا ہے لیکن یہ اضطراری آوازیں زبان کا جزو نہیں۔ صرف ارادی آوازیں ہی زبان کہلاتی ہیں۔

زبان کا استعمال محض صوتی علامات ہی کے لیے مخصوص کر لیا گیا ہے۔ ان صوتی علامات کو دوسرے طریقوں میں بھی منتقل کیا جا سکتا ہے۔ کوڈ دو قسم کی ہو سکتی ہے۔ اصل اور ثانوی۔ تقریری

زبان اصلی کوڈ ہے۔ ثانوی کوڈ کسی اصلی کوڈ کی ترسیل و ترجمانی کرتی ہے۔ تحریر ایک ثانوی کوڈ ہے۔ یہ صوتی علامات کو کاغذ یا کسی دوسری سطح پر ساکت کر کے ٹانک دیتی ہے۔ شارٹ ہینڈ۔ تار دینے کی مورس کوڈ بھی اسی قسم کی ثانوی کوڈ ہیں۔

کہا جاسکتا ہے کہ آدمی تنہائی میں بھی تو بڑبڑا سکتا ہے۔ غسلخانے کی تنہائی میں بھی تو گا سکتا ہے۔ پھر ترسیل کی قید کیوں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس غیر معمولی صورت میں ایک فرد خود کو دو شخصیتوں میں تقسیم کر لیتا ہے۔ قائل اور سامع اس سے بھی زیادہ پیچیدہ معاملہ ذہن میں سوچنے کا ہے۔ سوچنے میں بھی تو زبان کا استعمال ہوتا ہے وہاں نہ صوتی علامات ہیں نہ ترسیل ہے۔ ابھی تک ہم نے زبان کی دو شکلیں دیکھی تھیں۔ تقریری اور تحریری۔ تحریر صوتی الفاظ کی ثانوی علامت ہے سوچنا خیالات کے صوتی اظہار سے بھی پہلے کی منزل ہے۔ ہم ذہن میں خیالات کو صوتی علامات کے مقررہ آئین یعنی زبان میں ڈھال لیتے ہیں لیکن ہنوز ان کا خارجی اظہار نہیں کرتے۔ خیالات کی تشکیل ہم انہیں سانچوں میں کرتے ہیں جن سے سماج مراسلت کا کام لیتا رہا ہے۔ سوچنا صوتی علامات سے بے نیاز نہیں ان کا تابع ہے۔ ذہن میں غور و خوض کے بعد خیال صوتی اظہار اور ابلاغ کے لیے بالکل پکّا پکایا تیار ہوتا ہے۔ علم نفسیات ہمیں بتاتا ہے کہ سوچتے وقت سماعت والی رگیں NERVES ہمیشہ برسر کار رہتی ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ نطق کی رگیں بھی ایک حد تک جنبش میں آتی ہیں لیکن پورے طور پر نہیں۔ چنانچہ اس نفسیاتی تجربے سے آپ بھی دوچار ہوئے ہوں گے کہ دیر تک فکر انگیز تحریر کے مطالعے یا دقیق غور و فکر کے بعد گلے میں تھکن کا احساس ہوتا ہے۔

زبان کے باقاعدہ مطالعے کو لسانیات یا علم زبان کہتے ہیں علم زبان ایک طویل نام ہے اس پر لسانیات کو ترجیح دینا چاہیے۔

زبان کا مطالعہ دو طریقوں سے ہو سکتا ہے (۱) زمانے کے ایک مخصوص نقطے میں۔ اور یہ نقطہ زمانۂ حال ہی کا ہوتا ہے (۲) تاریخ کی رو میں عہد بہ عہد ارتقا کو پیشِ نظر رکھ کر۔ ایک زبان کا، ایک مخصوص منزل میں مطالعہ تجزیاتی لسانیات کہلاتا ہے۔ اسے توضیحی لسانیات بھی کہا جاتا ہے۔ زبان کا ایک ڈھانچہ ہوتا ہے، یہ ڈھانچہ کیا ہے، زبان کے مختلف اجزائے ترکیبی اور ان کے باہمی تعلقات کا مطالعہ زبان کا ایک وقت میں مطالعہ کیا جائے تو اس کی ، خت اور ڈھانچے ہی کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے اور یہی بنیادی چیز ہے۔ زبان کے تاریخی ارتقاء کا مطالعہ تاریخی لسانیات کہلاتا ہے۔ اگر ایک خاندان کی دو زبانوں کا تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو اسے تقابلی لسانیات COMPARATIVE PHILOLOGY

کہتے ہیں۔ اگر دو مختلف خاندانوں کی زبانوں کا مقابلہ کرتے ہیں تو اسے لسانی نوعیات TYPOLOGY کہتے ہیں کیونکہ اس میں دو مختلف اقسام کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

انیسویں صدی میں ڈارون نے انسان اور دوسرے حیوانات کے باہمی رشتے اور نسلوں کا تعین کیا۔ اسی طریقے پر زبانوں کے نسلی رشتے اور گزشتہ تاریخ کا بھی مطالعہ کیا گیا۔ تاریخی اور تقابلی لسانیات میں اصولی حیثیت سے فرق ممکن ہے لیکن واقعتاً یہ ایک ہی علم ہے۔ کسی زبان کی اصل جاننے کے لیے پیچھے کی طرف لوٹ کر منزل بہ منزل اس کی کھوج لگائی جاتی ہے۔ جہاں تک اس کی تحریریں اور کتبے ملتے ہیں تاریخی طریقہ ساتھ دیتا ہے۔ اس سے پہلے کی شکلوں کی دریافت اور بازتشکیل اس نسل کی دوسری زبانوں کے تقابلی مطالعے سے ہی ممکن ہے۔ ابتداً اس علم کو تقابلی قواعد اور بعد میں تقابلی لسانیات کہا گیا۔ تقریباً ۱۹۲۵ء میں پراگ اسکول کی بنا کے ساتھ تجزیاتی لسانیات کا دور دورہ شروع ہوتا ہے Philology میں ادب کا مطالعہ بھی شریک ہو جاتا تھا اس لیے اس کی بجائے Linguistics کی اصطلاح رائج کی گئی۔

مناسب یہ دکھائی دیتا ہے کہ پہلے کسی زبان کی ساخت کا مطالعہ کیا جائے بعد میں اس کے تاریخی ارتقا کا لیکن سوءِ اتفاق سے ہوا اس کے برعکس۔ تاریخی لسانیات اور تجزیاتی لسانیات میں ایک رقیبانہ لاگ ڈانٹ، ایک حریفانہ چشمک پائی جاتی ہے۔ ان دونوں کا جھگڑا قدیم و جدید، بوڑھے اور جوان کا جھگڑا ہے۔ تاریخی لسانیات کے وکیل تجزیاتی لسانیات کو ایک عملی مطالعہ کہہ کر سائنس کے زمرے سے خارج کر دیتے ہیں۔ سائنس تو اصول کی دریافت کا نام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان کی ساخت کا مطالعہ قواعد داں کا کام ہے لسانیات کو اس سے کیا مطلب۔ تجزیاتی لسانیات کے جانب دار تاریخی علما پر معترض ہیں کہ وہ زبان کی ساخت فطرت اور سرشت ہی سے واقف نہیں۔ وہ ماہر لسانیات کیونکر ہوئے۔ ایک معنی میں تجزیاتی لسانیات ہی زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ زبان کے ڈھانچے کو منکشف کرتی ہے۔ تاریخی لسانیات تبدیلی اور ارتقاء کا مطالعہ کرتی ہے آج کل دنیا کے تمام بڑے بڑے ماہرینِ زبان تجزیاتی لسانیات ہی سے سروکار رکھتے ہیں۔ تجزیاتی لسانیات کو تاریخ سے یہاں تک چڑ ہے کہ اس کے دائرے میں زبان کی گذشتہ تاریخ قطعاً غیر متعلق اور غیر اہم ہے۔ کسی لفظ یا آواز کے ماضی میں کیا روپ تھے، تجزیاتی لسانیات کو اس کے سننے کی تاب نہیں۔

تقابلی لسانیات اور لسانی نوعیات میں بھی اسی طرح کی لاگ ڈانٹ ہے۔ تقابلی لسانیات میں تاریخی پہلو مدِنظر رکھا گیا۔ نوعیات میں تاریخی مطالعے کا سوال ہی نہیں کیونکہ یہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے کہ زیرِ بحث دو زبانوں مثلاً ہندی اور چینی میں کوئی نسبی تعلق نہیں۔ اس لیے ان کے ڈھانچے اور قواعد

وغیرہ ہی کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ نوعیات کے حامی ایلن W. S ALLEN نے طنز کیا کہ وہی علم وفن سائنٹفک کہا جاسکتا ہے جس میں عمومی اطلاق کی صلاحیت ہو۔ تقابلی لسانیات محض ایک ہی خاندان کی زبانوں کا مطالعہ کرسکتی ہے اس لیے وہ سائنس نہیں اس کے برعکس نوعیات دنیا بھر کی زبانوں کا مقابلہ کرسکتی ہے۔ فریقِ ثانی نوعیات کے وکیلوں پر یہ اعتراض کرتا ہے کہ تم مقابلہ کس چیز کا کرتے ہو، جب دو زبانیں اپنی ساخت اور جبلّت میں بالکل مختلف ہیں تو ان کا ایک ہی سطح پر تجزیہ نہیں ہوسکتا۔

تجزیاتی لسانیات نے زبان کے مختلف اجزا کے مطالعے کے لیے ذیل کی شاخیں قرار دی ہیں۔

۱۔ صوتیات PHONETICS اس میں اصوات کی زیادہ سے زیادہ نزاکتوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یہ شاخ کسی ایک زبان تک محدود نہیں اس میں تمام زبانوں کا مجموعی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یوں کسی ایک زبان یا ایک بولی کی صوتیات پر بھی بحث کی جاتی ہے۔

۲۔ تجصوتیات PHONEMICS اس میں کسی ایک زبان کے صوتیوں PHONEMICS کا تعین کیا جاتا ہے۔ صوتیات میں آوازوں کی زیادہ سے زیادہ نزاکتیں دریافت کی جاتی ہیں لیکن تجصوتیات میں غیر ضروری نزاکتوں کو نظرانداز کرکے صرف انھیں اختلافات کا جائزہ لیا جاتا ہے جو معنی کو تبدیل کرسکتے ہیں۔ اس طرح اصوات کی متعدد ذریات کی گروہ بندی کرکے انہیں کم از کم صوتیوں میں سمیٹ لیا جاتا ہے۔ اس شاخ کو PHONOLOGY بھی کہتے ہیں۔

۳۔ صرف MORPHOLOGY۔ اس میں لفظ کی ساخت کا مطالعہ کیا جاتا ہے مثلاً ایک مادّہ میں سابقے اور لاحقے لگاکر نئے الفاظ کا اشتقاق کیونکر ہوتا ہے۔

۴۔ نحو SYNTAX: اس کا موضوع کلام یعنی جملہ اور فقرہ ہے۔ صرف ونحو کو ملاکر زبان کی قواعد کو کہا جاتا ہے۔

۵۔ معنیات SEMANTICS: اس میں لفظوں اور جملوں کے مفہوم سے بحث کی جاتی ہے۔

تجزیاتی لسانیات پہلی چار شاخوں کے مطالعے پر مشتمل ہے۔ ان میں تجصوتیات اور صرف ونحو کو مرکزی شاخیں قرار دیا جاتا ہے اور صوتیات اور معنیات کو نواحی۔ صوتیات میں چونکہ ان

موشگافیوں سے بحث کی جاتی ہے جو روزانہ ضروریات کے مصرف کی نہیں اس لیے اسے غیراہم قرار دیا گیا ہے۔ معنیات کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے کہ یہ لسانیات کی شاخ نہیں اس کا مطالعہ لغت یا ادب میں کیا جانا چاہیے۔ تجزیاتی لسانیات کے علماء کا ایمان ہے کہ لسانیات کو زبان کی محض ہیئت سے سروکار ہے معنی سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معنیات کا مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہوا ہے۔

راقم السطور کی رائے میں دونوں دعوے انتہا پسندانہ ہیں۔ تجصوتیات صوتیات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ صوتیات کا بالاستیعاب اور مفصّل مطالعہ ہی تجصوتیات کا سنگِ بنیاد ہے۔ جدید لسانیات صوتیات کے مطالعہ پر زیادہ سے زیادہ دقت اور زیادہ سے زیادہ زور دیتی ہے اور اس کے بعد بھی اسے ضمنی مطالعہ کہنے کی جرأت کرتی ہے حالانکہ صوتیات ہی اصل لسانیات ہے۔ اب تو تاریخی و تقابلی مطالعہ بھی صوتیات کا محتاج ہے۔

تجزیاتی لسانیات کا دعویٰ کہ وہ معنی سے کوئی سروکار نہیں رکھتی ایک قسم کی خود فریبی یا ڈھونگ ہے۔ یہ دعویٰ صوتیات کی حد تک تو صحیح ہے۔ لیکن تجصوتیات کو ابتدا ہی سے معنی پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ صوتیے کی تبدیلی معنی کو بدلنے پر قادر ہے۔ صرف و نحو میں کلام و کلمہ کے بامعنی اجزا ہی سے بحث کی جاتی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تجزیاتی لسانیات گو زبان کے بامعنی اجزا ہی سے سروکار رکھتی ہے لیکن اس کا جائزہ ان کے وصل و فصل، ترکیب و ترتیب یعنی ہیئت ہی تک محدود رہتا ہے۔

تصریف کے عمل میں بعض اجزا کے صوتیوں میں تبدیلی ہو جاتی ہے مثلاً 'خرید' اور 'دار' کو ملانے پر ایک "د" حذف ہو کر مرکب خریدار بنتا ہے۔ ہندی الفاظ بھجن اور اپدیشک کو ملا کر بھجنوپدیشک بنتا ہے۔ یہ بحث صوتیے اور صرف دونوں پر نگاہ رکھتی ہے۔ تجصوتیات اور صرف کی اس کڑی کو MORPHOPHONEMICS کہتے ہیں۔ اسے صرف ہی کے تحت شامل کیا جا سکتا ہے اور صرف و نحو کی طرح یہ بھی قواعد کا جزو ہے۔

تجزیاتی لسانیات نے لسانیاتی مطالعہ کے مندرجہ بالا شعبے فراہم کیے۔ تاریخی لسانیات کے تحت کسی زبان کے سابق ارتقاء کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ تقابلی لسانیات زبانوں کی خاندانی گروہ بندی کرتی ہے اور لسانی نوعیات زبانوں کی نحوی گروہ بندی۔ رسم الخط کا مطالعہ لسانیات کا جزو نہیں کیونکہ لسانیات کا موضوع زبان کی تقریری شکل ہے تحریری نہیں۔ پھر بھی زبان سے اس کا گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے لسانیات کے رسم الخط کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

حال میں لسانیات کے مطالعے کے نت نئے شعبے ہوتے جا رہے ہیں جو ابھی عالمِ طفولیت

ہی میں ہیں جنہیں مندرجہ بالا پانچ شعبوں کی طرح تسلیم عام نہیں ملا۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

۱۔ جائزے کے طریقے (FIELD METHODS) اس کی ذیل میں کسی ایسی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں جو ہنوز تحریر نہیں کی گئی اس شعبے کا کام ان اصولوں کو مرتب کرنا ہے جن کی مدد سے زبان سے صحیح نمونے اکٹھے کیے جاسکیں۔ اس شعبہ پر امریکہ میں کام ہوا ہے۔ یورپ کے ماہرین اسے علیحدہ شاخ نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ زبان کے نمونے اکٹھا کرنا لسانیات کا جزو نہیں۔ کام کرنے والا جس طرح جی چاہے مسالہ جمع کرے۔ لسانیات اس فراہم شدہ مسالے کا تجزیہ کرے گی۔

۲۔ اسلوبیات (STYLISTICS) موخرالذکر کو یورپ کے ماہرین لسانیات کی شاخ مانتے ہیں لیکن اکثر امریکی علماء اسے لسانیات کے حصار میں شامل نہیں کرتے۔ اس میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ عبارت کو جذباتی اور شاعرانہ بنانے کے لیے کیا کیا طریقے اپنائے جاتے ہیں۔

۳۔ تدوین اللغات (LEXICOGRAPHY)

۴۔ علم الاشتقاق (LTYMOLOGY)

۵۔ بولیوں کا جغرافیہ (DIALECT GEOGRAPHY)

۶۔ لسانی قدیمیات (LINGUISTIC PALAENTOLOGY)

۷۔ اطلاع کا ریاضیاتی نظریہ (MATHEMATICAL THEORY OF INFORMATION)

لسانیات کے بارے میں اس قدر جان لینے کے بعد ہم غور کرسکتے ہیں کہ یہ سائنس ہے یا آرٹ۔ اس کا مقام کچھ بین بین ہے۔ یہ طبیعی سائنس کے زمرے میں نہیں آسکتی کیونکہ اس کے اصول گو بڑی حد تک صحیح ہیں لیکن فزکس، کیمسٹری کی طرح ان میں قطعیت نہیں۔ لسانیات میں انسانی عنصر میکانکی صحت اور قطعیت کا متحمل نہیں۔ دوسری طرف اسے آرٹ بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ آرٹ افراد کی تخلیق ہوتا ہے۔ وہ جمالیات کی طرف بھی گوشۂ چشم رکھتا ہے۔ زبان افراد کی شعوری تخلیق نہیں۔ معاشیات و سیاسیات کی طرح یہ محض سماجی سائنس بھی نہیں کیونکہ صوتیات کے اصول بڑی حد تک صحیح ہیں۔ اس شاخ کا باقاعدہ مطالعہ لیبارٹری ہی میں ممکن ہے۔ صوتیات اور تجصوتیات علوم طبعی کے لگ بھگ پہنچ جاتے ہیں ایک لفظ کو ادا کرنے کے لیے ہم اوّل ذہن میں خیال کی تشکیل کرتے ہیں پھر اسے اعضائے نطق و سماعت کے ذریعے صوتی روپ دیتے ہیں۔ اس طرح لسانیات کے دو عناصر نفسیاتی اور میکانکی ہیں۔

جو اسے سماجی سائنس اور طبعی سائنس کے درمیان کشاکش میں رکھتے ہیں۔ واضح ہو کہ ہمارے ملک میں سماجی سائنسوں کو آرٹ کی ذیل میں رکھا جاتا ہے۔

لسانیات کا دوسرے علوم وفنون سے تعلق

لسانیات کا سب سے نزدیکی رشتہ مروجہ قواعد سے ہے لیکن دونوں یکساں نہیں۔ سب سے بڑا اختلاف یہ ہے کہ لسانیات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ صرف ونحو اس کے محض دو شعبے ہیں۔ ان شعبوں میں اور مروجہ قواعد میں بھی فرق ہے۔ قواعد کسی ایک زبان سے متعلق ہوتی ہے لیکن لسانی صرف ونحو کے اصول عام طور سے زبانوں پر چسپاں کیے جاسکتے ہیں۔ مروجہ قواعد زبان کے فصیح روپ کا مطالعہ کرتی ہے۔ لسانیات میں نہ کوئی روپ فصیح ہے نہ غیر فصیح۔ یہ محض مطالعے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ بعض اوقات بعض مستثنیٰ اصیغوں کی قدیم تاریخ معلوم کرکے ان کے بارے میں اصول قائم کرتی ہے۔ لسانیات میں استثنیٰ کا ذکر نہیں ہوتا۔ اس کو بھی اصولوں کے تحت لے لیا جاتا ہے۔

ادب سے لسانیات کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ شرح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لسانیات سے قدیم ادب کو اور دوسری زبانوں سے مستعار لفظوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ لسانیات کے لیے ادب مسالہ فراہم کرتا ہے۔ زبان کا تاریخی مطالعہ عہد بہ عہد ادبی نمونوں ہی کے بل پر ہو سکتا ہے۔

تاریخی لسانیات تاریخ سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت، تجارتی تعلقات وغیرہ فریقین کی زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی لسانیات بھی تاریخ کو شمع دکھاتی ہے۔ یورپ اور ویلس کی جپسیوں کی زبان میں ہندوستانی الفاظ کی افراط اس کی شاہد ہے کہ یہ لوگ عہدِ قدیم میں ہندوستان سے چل کر مغرب میں بود وباش کرنے لگے۔

آثارِ قدیمہ قدیم زبانوں کے نمونے محفوظ رکھتی ہے اور ماہر لسانیات ان قدیم کتبوں اور تحریروں کو پڑھ کر آثارِ قدیمہ کی گتھیاں کھولتا ہے۔ لسانی قدیمیات اور بشریات (ANTHROPOLOGY) بھی ایک دوسرے کے لیے مدد معاون ہیں۔

عمرانیات اور لسانیات بھی ایک دوسرے سے متعلق ہیں۔ زبان ایک سماجی فعل ہے۔ عمرانیات ہی سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ مرور ایام کے ساتھ بعض الفاظ کے معنی کیوں پست ہو جاتے ہیں اور بعض کے کیوں بلند۔ جہاں پناہ کے معنی بادشاہ کیوں ہوتے ہیں۔ اور مہتر کے معنی خاکروب کیوں۔ دسترخوان اُٹھانے کو دسترخوان بڑھانا کیوں کہا جاتا ہے۔ زبان نفسیاتی فعل بھی ہے۔ یہ خیال کو ظاہر کرتی ہے اس لیے اس کا نفسیات سے بھی رشتہ ہے معنیات اور زبان کی ابتدا کی کھوج میں خاص طور سے

نفسیات سے مدد ملتی ہے۔

جغرافیہ سے بھی لسانیات کا ربط ہے۔ ہموار میدان میں آمد و رفت اور مراسلت آسان ہوتی ہے وہاں کی زبانوں کا علاقہ دور تک پھیلا ہوتا ہے۔ پہاڑوں اور دشوار گزار جنگلوں میں زبانیں اور بولیاں بہت محدود ہوتی ہیں۔ ایک قدرتی حدِ فاصل کے دونوں طرف زبانیں یا کم از کم بولیاں مختلف ہوتی ہیں۔ ہندوستانی زبانوں میں آسمان سے گرنے والے اور کارخانے میں جمائے ہوئے برف کے لیے ایک ہی لفظ ہے۔ انگریزی میں دو۔ اسکیمو زبان میں کھارے پانی کے برف میٹھے پانی کے برف گرنے والے برف بہنے والے برف وغیرہ کے لیے متعدد الفاظ ہیں۔ شہروں اور مقامات کے ناموں سے زبان کی فطرت اور ارتقار پر روشنی پڑتی ہے۔

علم تشریح الاعضا کا صوتیات سے تعلق ہے کیونکہ صوتیات میں اعضائے نطق کا تفصیلی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ صوتیات کا تعلق طبیعیات سے بھی گہرا ہے۔ آواز ہوا کی لہروں پر کیسے جاتی ہے مصمتہ اور مصوتہ یا غنائی آوازوں سے ہوا کی کیا کیا لہریں بنتی ہیں یہ سب طبعیات سے متعلق ہے سمعی صوتیات ACUSTIC PHONETICS کا مطالعہ تجربہ گاہ ہی میں ہو سکتا ہے۔ جس طرح صوتیات بیشتر طبعیات کا سہارا لیتا ہے۔ اسی طرح لسانیات کی شاخ ریاضیاتی اطلاعی نظریہ COMMUNICATION ENGINEE-RING. سے متعلق ہے۔

لسانیات کے مطالعے سے متعدد فائدے ہیں جن کی تفصیل درج کرنا ممکن نہیں۔ مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ لسانیات سے انسانوں کے بڑے بڑے گروہوں کی یکسانیت اور ایکتا کا اندازہ ہوتا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے آخر میں جب سر ولیم جونس نے ثابت کیا کہ سنسکرت یونانی اور لاطینی کے خاندان کی زبان ہے تو گوروں کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اب تک وہ ایشائیوں کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے لیکن اس کے بعد انہیں بھی اپنا بھائی سمجھنا پڑا۔ لسانیات ہی سے کسی قوم کی تاریخ اور تہذیب کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ مصر و بابل وغیرہ کی تہذیب کے مطالعے میں وہاں کی مردہ زبانوں کی تفہیم سے بڑی مدد ملی۔ قدیم ادب کے مطالعے میں لسانیات سے سہارا ملتا ہے۔

رسم الخط میں اصلاحیں لسانیات ہی کے فیض سے کی جا سکتی ہیں۔ جو زبانیں ابھی تک تحریری نہیں ان کی صوتیات کا تجزیہ کر کے ان کو باقاعدہ رسم الخط دیا جا سکتا ہے۔ دوسری زبانوں کا مطالعہ کرنے میں صوتیات سے بڑی مدد ملتی ہے۔

اہلِ زبان کا سا صحیح تلفظ صوتیات ہی کی مدد سے سیکھا جا سکتا ہے۔ ماہر لسانیات ان زبانوں

پر نہ صرف جلدی عبور حاصل کر سکتا ہے بلکہ انہیں اہلِ زبان کی بول بھی سکتا ہے۔ امریکہ میں تجزیاتی لسانیات کے فروغ کی یہی وجہ ہے کہ غیر ترقی یافتہ زبانوں کو جلدی سے سیکھ کر ان لوگوں میں مذہبی اور سیاسی پروپیگنڈا کرنا مقصود ہے۔ اصطلاحات سازی میں بھی لسانیات کا صرف و نحو بڑا کارگر ہے۔ لسانیات ہی کی تحقیقات سے ترجمہ کرنے والی مشینیں بنائی گئی ہیں اور لسانیات ہی سے ہر ملک اپنی خفیہ کوڈ کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ماہرین صوتیات دوسرے ملکوں کی خفیہ کوڈ کا راز بھی معلوم کر لیتے ہیں۔ امریکہ کی ہوائی اور بحری افواج متعدد ماہرینِ صوتیات کو ملازم رکھتی ہیں جن کی مدد سے دوسرے ملکوں کے خفیہ پیغامات کو پڑھا جاتا ہے۔

زبان کا آغاز

علم الانسان (ANTHROPOLOGY) نے بنی نوع انسان کی عمر متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ زمین سے برآمد کیے ہوئے قدیم ترین انسانی ڈھانچے کسی حد تک بن مانس کی خصوصیات بھی لیے ہوتے ہیں۔ ادھر کچھ سال پہلے تک جاوا سے دریافت شدہ ڈھانچے کی عمر دس لاکھ سال اندازہ کی گئی تھی۔ چند سال قبل افریقہ میں اس سے بھی زیادہ پُرانا ڈھانچہ ملا ہے جس کی عمر پندرہ لاکھ سال سے کم نہیں ممکن ہے کچھ زیادہ ہو جن انسانوں کے یہ ڈھانچے ہیں وہ اتنے پچھڑے ہوئے تھے کہ انھیں بن مانس نما انسان یا انسان نما بن مانس کہا جا سکتا ہے۔

آدمی کو حیوان ناطق اور جانوروں کو بے زبان کہا جاتا ہے۔ واقعی زبان ہے بھی اتنی بڑی نعمت، زبان کی وجہ سے تبادلۂ خیالات اور اظہارِ جذبات ہوتا ہے۔ گویا زبان ہی سماج اور تہذیب کی شیرازہ بندی کرتی ہے۔ بالکل ابتدا میں انسان دوسرے حیوانات کی طرح غوں غاں کرتا ہوگا لیکن مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے اس نے جلد ہی زبان کی تخلیق کر لی ہوگی۔ زبان یا نطق کی ابتداء کیونکر ہوئی۔ یہ سوال علمائے لسانیات کو ہمیشہ پریشان کرتا رہا ہے چنانچہ دورِ جدید میں ۱۶۶۶ء میں[1] ہابس (HOBBS) نے اپنی فلسفہ کی کتاب کے ایک باب میں زبان کے آغاز کے بارے میں بھی بحث کی اس کے بعد سے ماہرینِ لسانیات مسلسل اس پر غور کر رہے ہیں۔ دراصل اس گئے گذرے زمانے کے بارے میں کوئی سائنٹیفک تحقیق ممکن نہیں اس لیے زیادہ تر قیاس آرائی سے کام لیا گیا ہے۔

لسانیات اس کا بھی جواب دینے میں قاصر ہے کہ کیا دنیا کی تمام زبانوں کا منبع ایک ہے یا کئی۔ یہ سوال دراصل نسلِ انسانی کے آغاز کے ساتھ وابستہ ہے۔ کیا حیوان سے انسان کا ارتقاء محض ایک جگہ ہوا یا مختلف مقامات میں۔ دنیا میں زبانوں کے متعدد خاندان ہیں جن میں سے بعض میں اتنا اختلاف ہے کہ ان کے درمیان کوئی خون کا رشتہ تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ زبانوں کی ایک اصل ماننے والے اس کا

---

[1] FOUNDATION OF LANGUAGE BY L. H. GRAY. طبع ۴۳۲

یہ جواب دیتے ہیں کہ اب بھی ایک خاندان کی بعض زبانوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے مثلاً اڑیا اور روسی کو یا ہندی اور انگریزی کو دیکھ کر یہ کون سوچ سکتا ہے کہ یہ ایک مورثِ اعلیٰ کی اولاد ہیں۔ اسی طرح لاکھوں سال میں ایک قدیمی زبان کے اخلاف اتنے مختلف ہو گئے ہیں کہ کوتاہی نظر کی وجہ سے ہم انہیں مختلف خاندان قرار دیتے ہیں۔ دنیا کی تمام زبانوں کو متحدالاصل قرار دینے کا نظریہ سب سے پہلے لیب نٹز (LEIBNITZ) نے پیش کیا جو برلن اکیڈمی کی ۱۷۱۰ء کی روئداد[۱] میں شائع ہوا۔

۱۔ **الوہی نظریہ** زبان کے آغاز کے بارے قدیم ترین نظریہ مذاہب کا ہے جن میں زبان کی اصل الوہی یا الہامی قرار دی گئی ہے۔ بعض مذاہب نے اپنی زبان کو قدیم ترین قرار دیا ہے۔ انجیل کے مطابق ابتدائے انسانوں میں محض ایک زبان رائج تھی۔ اہلِ بابل نے ایک مینار بنایا تاکہ آسمان کی پہنائیوں کی سیر کر سکیں۔ خدا نے اس مخلوق کو سزا دینے کے لیے یہ عتاب نازل کیا کہ انسان ایک دوسرے کی زبان نہ سمجھ سکیں۔ اس طرح دنیا میں بھانت بھانت کی زبانیں رائج ہو گئیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک اصل زبان عبرانی تھی۔ ہندوؤں میں سنسکرت کو دیو بانی کہا گیا ہے۔ بودھوں کے نزدیک پالی پراکرت قدیم ترین زبان ہے۔ اسلامی عقیدے کے مطابق خدا نے حضرتِ آدم کو اشیاء کے نام سکھائے۔ قرآن کلامِ مجید ہے جس کے نتیجے میں عربی آسمانی زبان قرار پاتی ہے۔ جینیوں کے لیے لسانیات کی کئی کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ اردھ ماگدھی پراکرت کو انسان و حیوان کی ازلی زبان مانتے ہیں لیکن یہ بیان غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جینیوں میں قطعاً کوئی زبان دوسروں کی نسبت مقدس نہیں۔ ہاں یہ دعویٰ ضرور کیا گیا ہے کہ تیرتھنکروں کے وعظ کو نہ صرف انسان بلکہ حیوانات بھی سمجھتے تھے۔

آخری تیرتھنکر مہابیر سوامی چونکہ بہار کے رہنے والے تھے وہ اپنی زبان اردھ ماگدھی میں وعظ کرتے تھے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان سے پہلے کے تیرتھنکر جو ملک کے دوسرے مقامات کے باشندے تھے وہ بھی اردھ ماگدھی بولتے تھے۔

مذاہب کے علاوہ بعض افراد[۲] نے بھی اپنی زبان کو ازلی قرار دیا۔ مثلاً سولہویں صدی میں

---

[۱] ایضاً ص ۴۳۳

[۲] بھاشا وگیان (ہندی)، از ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری طبع چہارم ص ۳۰

ولندیزی عالم بے کانس نے ڈچ کو اور اسی زمانے میں دو اور حضرات نے گوتھی (قدیم جرمن) کو اصل زبان مانا ہے۔ کئی بادشاہوں کو بھی انسان کی سب سے پہلی یا فطری زبان جاننے کی کد ہوئی۔ انھوں نے نوزائیدہ بچوں کو جنگل میں اس طرح پرورش کرایا کہ ان کے کانوں میں کسی زبان کا کوئی لفظ نہ پڑ سکے اس قسم کے چار تجربے کیے گئے۔ قدیم مصری بادشاہ سیمائی ٹکس (PSAMMITICHOS) نے دو بچوں کو جنگل میں پرورش کرایا۔ کچھ سال بعد وہ دربار میں لائے گئے تو ان میں سے ایک نے لفظ بیکوس کہا جو فریجین زبان میں روٹی کو کہتے ہیں۔ اس سے نتیجہ نکالا گیا کہ فریجین ازلی زبان ہے۔ حالانکہ ہوا یہ تھا کہ کسی دن روٹی دینے والے فریجین خادم کے منہ سے یہ لفظ نکل گیا تھا۔ تیرھویں صدی کی ابتدا میں شاہنشاہ فریڈرک دوم نے بھی ایسا تجربہ کیا لیکن بچے گویائی سیکھنے سے پہلے ہی مر گئے ۱۵۰۰ کے لگ بھگ اسکاٹ لینڈ کے بادشاہ جیمس چہارم نے بھی دو بچوں کو نظر بند رکھا اور آخر میں حضور نے فیصلہ کیا کہ یہ بہت اچھی عبرانی بولتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے بھی جنگل میں کچھ بچوں کو پرورش کرایا اور جیسا کہ ہونا چاہیے وہ بچے گونگے ثابت ہوئے۔

۱۷۷۲ء میں برلن اکیڈمی[1] نے زبان کے آغاز کے موضوع پر مقالہ نگاری کا ایک انعامی مقابلہ کیا جس میں ہرڈر (HERDER) کا مقالہ بہترین تسلیم کیا گیا۔ اس نے الوہی نظریہ پر دو وقیع اعتراضات کیے (۱) اگر زبان خدا کی تخلیق ہوتی تو وہ بہت باقاعدہ ہوتی لیکن تمام زبانوں میں عجب بے اصولی اور بے ترتیبی پائی جاتی ہے (۲) زبان میں بنیادی الفاظ فعل کے مادّے ہیں جن سے متعدد اسمار کا اشتقاق ہوتا ہے۔ اگر خدا تخلیق کرتا تو ماجرا برعکس ہوتا۔ وہ انسان کو سب سے پہلے چیزوں کے نام سکھاتا۔ فعل بعد میں آتے۔ ۱۸۵۱ء میں گرم نے بھی اپنے مقالہ "آغاز زبان" میں زبان کی بے ترتیبی کو الوہی آغاز کے منافی قرار دیا۔ ان دونوں حضرات نے اپنے طور پر زبان کے آغاز کے بارے میں لکھنا چاہا لیکن وہ کوئی واضح اور معقول نظریہ نہ پیش کر سکے۔ ذیل میں دوسرے نظریوں کی شرح کی جاتی ہے

۲۔ فطری نظریہ: یہ نظریہ فیثاغورث (۶ صدی ق م) ہیراکرٹس (HERAKRITOS) (۵۷۶ تا ۴۸۰ ق م) اور افلاطون (۴۲۹ تا ۳۴۷ ق م) کا ہے۔ افلاطون کے مطابق فطرت نے کسی جبلی ضرورت کے تحت زبان کو جنم دیا چنانچہ اشیاء اور ان کے ناموں میں کوئی فطری تعلق ہوتا ہے۔

ل LANGUAGE BY JESPERSON ص ۲۷

یہ نظریہ محض ایک فلسفیانہ خیال ہے جس کی کوئی علمی اہمیت نہیں۔

۳۔ معاہدہ کا نتیجہ: تیسرا نظریہ زبان کو انسانوں کے باہمی معاہدہ کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ پانچویں صدی ق م میں ڈیموکرٹس[ا] (DEMOKRITOS) اور چوتھی صدی ق م میں ارسطو نے زبان کو باہمی قول و قرار سے مستخرج کیا۔ اسی کو روسو نے ۱۷۵۵ء میں اور واضح کیا۔ اس نے ریاست کی طرح زبان کو بھی سماجی معاہدہ کا نتیجہ قرار دیا۔ اس نظریہ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ جب زبان نہ تھی تو مختلف انسان اشیاء کے ناموں کے بارے میں تبادلۂ خیالات کس وسیلے سے کر سکتے تھے۔

۴۔ حیوانی آوازوں کی نقل: اس نظریے کے مطابق انسان نے جانوروں کی بولیوں کی نقل میں زبان کے اولین الفاظ اختراع کیے مثلاً میاؤں۔ بھوں۔ بھوں۔ میں میں (بکری کی آواز) ہنہنانا۔ رینکنا۔ کاگ۔ (کوا) انگریزی میں CUCKOO (کوئل) COCK وغیرہ۔ اس نظریے کو میکس ملر نے طنزاً BOVE-VOW (کتے کے بھونکنے کی آواز) نام دیا۔ وہ معترض ہے کہ اس قسم کے الفاظ مصنوعی پھولوں کی طرح جامد ہیں، لیکن یہ بات نہیں۔ اردو میں بھوں بھوں سے بھونکنا انگریزی میں ککو سے (CUCKOLD) اور کاک سے (COQUET) مصادر بنے۔

رینان کے مطابق اس نظریے کی تاریخی ترتیب کہ پہلے حیوانات بولے اور اشرف المخلوقات نے ان کی نقل میں زبان ایجاد کی بالکل لغو ہے۔ اس نظریے میں اس حد تک صداقت ہے کہ اس سے ہر زبان کے دس بیس الفاظ کی اصل معلوم ہو جاتی ہے اور بس۔ بقیہ تمام الفاظ کے بارے میں اس سے کوئی رہنمائی نہیں ہوتی۔

۵۔ چیزوں کی جھنکار کی نقل: انسان نے مظاہر فطرت اور مصنوعات انسانی میں متعدد قسم کی گونج اور جھنکار سنی اور انہیں الفاظ میں اسیر کر لینا چاہا۔ اس طرح اولین الفاظ وجود میں آئے۔ انہیں سے دوسرے الفاظ بنتے گئے۔ اس نظریے کو بعض لوگوں نے غلطی سے ڈنگ ڈانگ[ب] (DING-DONG) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ آگے دکھایا جائے گا وہ ایک دوسرا نظریہ ہے۔ زیر بحث نظریہ کا صحیح انگریزی نام (ONOMATOPOEIC) ہونا چاہیے۔ دراصل چوتھے اور پانچویں نظریے ایک ہی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ پہلے میں جانوروں کی آوازیں ہیں اور دوسرے میں بے جان اشیاء کی۔ اردو

ا گرے ص ۴۲۳

ب بھاشا وگیان از بھولا ناتھ تواری ص ۳۰

میں ایسے الفاظ کی مثالیں گڑ بڑ گڑگڑاہٹ۔ گرج۔ چھینکنا۔ کھڑ کھڑ۔ بھڑ بھڑ۔ کھٹ پٹ۔ پٹّا وغیرہ ہیں۔ انگریزی میں ایسے الفاظ اور بھی زیادہ ہیں لیکن ان کے بارے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے جو الفاظ آج صوت نما ہیں۔ وہ اصلاً ایسے نہ ہوں۔ مثلاً انگریزی لفظ (THUNDER) لاطینی میں (TONET) ہے۔ اس کا مادہ (TEN) ہے جس میں بادل کے گرجنے کی کیفیت مفقود ہے۔ انہیں سے ملتے جلتے وہ الفاظ ہیں جن کی آوازیں کیفیات نظارہ کی عکاسی کرتی ہیں مثلاً جگمگ۔ جھلملانا۔ چکا چوند۔ انگریزی میں ZIG-ZAG DAZZLE

اس نظریے پر بھی یہی اعتراض ہے کہ اس قسم کے الفاظ زبان کے کل ذخیرے کا بہت قلیل حصّہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ الفاظ زیادہ قدیم نہیں کیونکہ ہندیوروپی خاندان کی مختلف زبانوں میں جب ان کے ہم معنی الفاظ کا مقابلہ کرتے ہیں تو وہ صوتی مطابقت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے دکھائی دیتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ابتدائی ہندیوروپی زبان کے الفاظ نہیں بلکہ بعد میں صوتی مطابقت کی بناء پر گھڑ لیے گئے ہیں۔ ہمارا موضوع زبان کے ابتدائی الفاظ ہیں بعد کے الفاظ نہیں۔

۶۔ مادّوں کا نظریہ (DING-DONG THEORY) اس کے موجد پروفیسر HEYSE ہیں۔ ان کے شاگرد ڈاکٹر اسٹائن تھال نے اسے تحریری شکل میں شائع کیا لیکن اس کی اہمیت میکس مُلر کی وجہ سے ہے۔ اس نظریے کے مطابق معنی اور صوت میں کوئی پراسرار ہم آہنگی ہوتی ہے۔ فطرت کا یہ قانون ہے کہ جس چیز پر ضرب لگائی جائے اس سے ایک مخصوص جھنکار پیدا ہوتی ہے۔ بنی نوع انسان کی طفولیت میں بشر میں ایک جبلّی صلاحیت تھی کہ ہر بیرونی تاثر درونِ انسان میں ایک صوتی ردِ عمل پیدا کرتا تھا۔ بالفاظِ دیگر اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ آدمی جونہی کسی شے کی جھنکار سنتا تھا، اس کی صدائے بازگشت کے طور پر خود اس کے منہ سے ویسی ہی کوئی آواز نکل جاتی تھی مثلاً دھات پر چوٹ پڑنے کے ساتھ آدمی کے منہ سے منہ سے ٹن اور لکڑی پر ضرب پڑنے سے کھٹ نکلا ہوگا۔ یہ آوازیں ہی وہ مادّے ہیں جن سے زبان کا استخراج ہوا۔ اس طرح کی آوازیں ابتداً بہت زیادہ تھیں لیکن انسان نے ان میں سے تقریباً چار سُو کی بنیادوں پر زبان کی تعمیر کی[۱] زبان کی نشو و نما کے بعد مادّوں کی تخلیق کی ضرورت نہیں رہی اس لیے انسان میں سے یہ صلاحیت جاتی رہی۔

پانینی نے سنسکرت جیسی بے پایاں زبان کو ۱۷۰۶ مادّوں پر مبنی قرار دیا تھا۔

---

[۱] از میکس مُلر لندن ۱۸۶۱ء ص ۲۷ LECTURES ON THE SCIENCE OF LANGUAGE

انیسویں صدی میں EDGEAN[1] نے انھیں گھٹا کر ۵۸۰ تک پہنچا دیا۔ انگریزی کا آریائی الفاظ کا ذخیرہ صرف ۴۶۰ مادوں سے تخلیق ہوا ہے۔ مثلاً ایک مادہ ب ر یا بار سے BURDEN, BEAR, REFERENCE, FERTILE, BIRTH, BORN, BARLEY, BIER, TRANSFER وغیرہ متعدد الفاظ مشتق ہوئے ہیں۔ یہ مادہ فارسی میں بار اور سنسکرت میں بھار ہے۔ اس قسم کے جتنے مادّے ہیں وہ افعال کو ظاہر کرتے ہیں مثلاً بار (لے جانا) مار (رگڑنا) سٹا (رکنا یا روکنا) تان (پھیلانا) یہ مادّے حواسِ خمسہ سے شناخت کی جانے والی مخصوص شے (PERCEPT) پر دلالت نہیں کرتے بلکہ ایسے بہت سے تجربوں کے غیر مرئی جزوِ مشترک (CONCEPT) کو ظاہر کرتے ہیں۔ بعد میں عام تصوّر کو خاص خاص تصوّرات میں تقسیم کر دیا گیا۔

مندرجہ بالا تفصیل سے میکس ملر کا نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔ اس پر کئی اعتراض کیے جا سکتے ہیں۔

(۱) یہ پورا نظریہ محض قیاس پر مبنی ہے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر ایک زمانے میں انسان میں مادّے تخلیق کرنے کی صلاحیت تھی تو وہ ہمیشہ کے لیے فنا کیوں کر ہو گئی۔

(۲) دنیا کی بہت سی زبانوں مثلاً چینی میں سرے سے مادّے اور مشتق کا جھنجھٹ ہی نہیں۔ ان کی توجیہ کیوں کر ہو۔

(۳) مادّے بالفرض چیزوں کی جھنکار کے صدائے بازگشت ہیں لیکن سابقے لاحقے وغیرہ کیوں کر پیدا ہو گئے۔

(۴) زبان اور قواعد کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی تخلیق کے ایک عرصۂ دراز کے بعد انسان نے مادوں کی دریافت کی اور ان پر تصریف کے عمل سے دوسرے الفاظ کا اشتقاق کیا۔ ابتدا میں اسے مادوں کا علم ہی نہ تھا۔

(۵) مؤلف کو اس نظریے پر آخری اعتراض یہ ہے کہ وحشی انسان کے لیے مادّی استدراک (PERCEPT) پہلے آنا چاہیے تھا اور غیر مرئی تصوّر (Concept) بعد میں۔ مثلاً ہمیں معلوم ہے کہ شمالی امریکہ کی چیروزبان میں ہاتھ دھونے، کپڑا دھونے وغیرہ کے لیے مخصوص الفاظ ہیں لیکن محض دھونے کے لیے نہیں یا زولو زبان میں لال گائے، سیاہ گائے، سفید گائے کے لیے مختلف الفاظ ہیں لیکن گائے کے لیے نہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ مادّی تجربے کے لیے لفظ پہلے وضع کیا گیا عام تصوّر کے لیے

---

[1] LECTURES ON THE SCIENCE OF LANGUAGE از میکس ملر لندن ۱۸۹۱ء ص ۳۹

بعد میں۔ بعد میں اس نظریے کو ناکافی سمجھ کر میکس ملر نے ترک کر دیا۔

۷۔ **فجائی نظریہ**: اسے میکس ملر نے تضحیک کے طور پر پوہ پوہ نظریہ کہا۔ کسی جذبے مثلاً درد، خوشی، جوش لذت، یاس، خوف کی شدت میں انسان کے منہ سے اضطراری طور پر کچھ فجائی کلمات نکل جاتے ہیں وہی زبان کا تخم ہیں۔ اُف۔ ہائے۔ واہ۔ آہ۔ اوہ انگریزی میں پوہ پوہ اسی قسم کی آوازوں کے ترجمان ہیں۔ ڈارون نے ان آوازوں کے ادا کرنے کے جسمانی اسباب پر روشنی ڈالی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نظریہ اس قسم کے الفاظ کی صحیح تشریح کرتا ہے لیکن ہر زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد کتنی ہے محض دس بیس۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ الفاظ واقعی فجائی آوازوں کی نہایت ناقص لسانی تشکیل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف زبانوں میں ایک ہی جذبے کا ردِ عمل مختلف الفاظ سے دکھایا جاتا ہے حالاں کہ واقعی یہ ردِ عمل ایک ہی قسم کی غیر ابجدی آوازوں سے ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ فجائی کلمات زبان کا تخم نہیں۔ مروجہ زبان کے عجز و قصر پر بروئے کار آتے ہیں۔ یہ زبان کا جزو نہیں غیر زبان ہیں۔ میکس ملر نے صحیح کہا ہے Language begins where interjection ends.
آخری وقیع اعتراض یہ ہے کہ فجائی کلمات اشتقاق کے نقطۂ نظر سے بالکل جامد ہوتے ہیں۔ ان پر تصریف کا عمل نہیں ہو سکتا پھر یہ الفاظ زبان کو کیوں کر جنم دے سکتے ہیں۔

۸۔ **اجتماعی محنت کا نعرہ**: (Yo-he-Yo-Theory) اس نظریے کا بانی نوائرے (Noire) ہے۔ جب انسان سخت محنت کرتے ہیں تو ہانپنے یعنی تیزی تنفس سے کچھ آرام ملتا ہے۔ تیز سانس کی آمد و رفت سے صوتی تاروں میں ارتعاش ہوتا ہے۔ غیر متمدن انسان جب اجتماعی طور پر کوئی کام کرتے تھے تو سہارے کی خاطر کوئی نعرہ سا لگاتے تھے مثلاً یورپی ملاح کشتی کھیتے وقت یو ہیو اور ہندوستانی مزدور ہیا ہیا کہتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق پہلے الفاظ (Haul) کسی بھاری چیز کو گھسیٹنا (Heave) (کاٹنا) ہوں گے۔ یہ واضح رہے کہ اس نظریے کے مطابق ابتدائی آوازیں اجتماعی مشقت کی پیداوار ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ نظریہ بالکل لغو ہے۔ کسی زبان میں ایسے الفاظ کی تعداد دو تین سے زیادہ نہ ہوگی۔ ڈائمنڈ کو اس نظریے پر یہ بھی اعتراض ہے کہ قدیم ترین زبانوں میں گھسیٹنا یا کھینچنا کے مفہوم کا کوئی مادہ نہیں ملتا۔

۹۔ **اشاری نظریہ**: (TA TA Theory) ڈاکٹر رائے اور ڈارون اشارات کو زبان کا جنم داتا مانتے ہیں۔ ان کے اعتقادات کی زیادہ نکھری ہوئی شکل ٹاٹا نظریہ ہے۔ اس کے مطابق انسان جب محنت

کرتا ہے تو نیم شعوری طور پر اس کے آلاتِ نطق حرکاتِ جسم کی نقل کرتے ہیں جس سے کچھ آوازیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھیں آوازوں نے زبان کو جنم دیا۔ ۱۹۳۰ء میں سر رچرڈ پیجز (Pages) نے اپنی کتاب (Human Speech) میں حرکاتِ دہنی کا نظریہ (Mouth Gesture Theory) پیش کیا جو اس طرح ہے کھانا کھاتے وقت زبان و لب کی جنبش سے کچھ آواز پیدا ہو سکتی ہے اس سے وحشی انسان کو دریافت ہو گیا کہ حلق سے باہر ہوا نکالنے سے آواز پیدا کی جا سکتی ہے۔ آدمی جو کچھ اشارے کرتا تھا غیر شعوری طور پر منہ اور جیبھ اور ہونٹ ان کی نقل کرتے تھے۔ اس طرح مختلف آوازیں پیدا ہوئیں۔

اسی نظریے کو آئس لینڈی زبان کے عالم الگزنڈر جونسن نے ہند یوروپی، عبرانی، قدیم چینی ترکی اور چند اور زبانوں کے مطالعے کے بعد کچھ اور تفصیل سے پیش کیا۔ اس کے مطابق نطق کے ارتقا میں چار منزلیں ہیں۔ پہلی منزل میں آدمی شدّتِ جذبات کو بن مانسوں کی طرح غوں غاں سے ظاہر کرتا تھا۔ دوسری منزل میں اس نے مختلف جانوروں اور بے جان اشیا کی آوازوں کی نقل کی۔ تیسری منزل میں اپنے جذبات اور خیالات کو اشاروں سے ادا کیا۔ زبان اور دوسرے آلاتِ نطق غیر شعوری طور پر ان اشاروں کی نقل کرتے تھے جس سے زبان کا جنم ہوا۔ ابتدائی الفاظ مادّی اشیا کے بارے میں تھے۔ چوتھی منزل میں لطیف خیالات کے لیے بھی الفاظ وضع ہوتے گئے۔ جونسن نے مختلف مصوتوں اور مصمتوں کے آغاز کی طرف بھی اشارہ کیا ہے مثلاً چوں کہ (ر) کے کہنے میں زبان کو آگے بڑھنا پڑتا ہے اس لیے (ر) سے شروع ہونے والے مادّوں کے معنی رفتار (Run) یا دوڑنے کے ہیں۔ (م) سے شروع ہونے والے الفاظ کے معنی خاموشی (Mum) یا بند کرنے کے ہیں۔

یہ نظریہ ایک فلسفیانہ خوش فکری ہے ورنہ اس میں قائل کرنے والی کوئی بات نہیں۔ اعضائے نطق کا حرکاتِ بدن کی تقلید کرنا اور اس کے سہارے آواز کو جنم دینا کچھ سمجھ نہیں آتا۔ بالفرض محال اگر اس طرح کچھ آوازیں پیدا بھی ہو سکیں تو ان سے ابجدی آوازیں اور الفاظ کیوں کر بنے جونسن نے ابتدائی مفرد آوازوں کے جو خواص ظاہر کیے ہیں وہ کسی زبان کے دو چار الفاظ کے بارے میں صحیح ہوں تو ہوں باقی سب الفاظ ان کی تردید ہی کریں گے۔ ملاحظہ ہو کہ اردو میں (ر) سے شروع ہونے والے مادّے "رک" "رہ" رفتار نہیں، سکون ظاہر کرتے ہیں۔

۱۰۔ آواز حرکاتِ بازو کی نقل: ۱۹۵۹ء میں ڈائمنڈ نے اپنی کتاب The History and

(Origin of Language (1st ed. میں ایک نظریہ پیش کیا جس کے مطابق نطقِ انسانی ان آوازوں کے ساتھ پیدا ہوا جو بازو کی محنت کے وقت خود بخود ادا ہوتی ہیں۔ زبان کے ابتدائی الفاظ کاٹنا، پھاڑنا، کھینچنا وغیرہ کے مفہوم کو ظاہر کرتے تھے۔ اس طرح ڈائمنڈ کا نظریہ کسی حد تک یوہیو اور ٹاٹا نظریوں سے مماثل ہے۔ یہ یوہیو سے دو باتوں میں مختلف ہے۔

(الف) یوہیو کے مطابق زبان کی ابتدا اجتماعی محنت سے ہوتی ہے۔ ڈائمنڈ کے یہاں انفرادی طور پر۔

(ب) یوہیو میں محنت کے ساتھ منہ سے آوازیں نکالنے کا مقصد تھکان دور کرنا تھا۔ ڈائمنڈ کے مطابق یہ عمل خود بخود بغیر کسی مقصد کے ہوا۔ ٹاٹا نظریہ بڑی حد تک نفسیاتی ہے لیکن ڈائمنڈ نے ایسا کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ ٹاٹا کے مطابق آلاتِ نطق دست و بازو کی حرکات کی نقالی کرتے ہیں جن کے نتیجے میں بشر نے دریافت کیا کہ اس طریقہ سے آواز پیدا کی جا سکتی ہے۔ ڈائمنڈ کے یہاں آلاتِ نطق لازماً بازو کی حرکت کے متوازی ہی نہیں ہلتے۔

ایک اور شخص مرے (Murray) نے[1] اپنی کتاب History of European Languages اڈنبرا ۱۹۲۳ء میں کچھ ایسا ہی نتیجہ نکالا۔ اس کے نزدیک (۹) ابتدائی مادے شلاً ag، wag، hang، hrag وغیرہ زبان کی بنیاد ہیں۔ ان کے معنی ضرب پہنچانا ہلانا وغیرہ ہیں۔

ساگر یونیورسٹی کے لسانیات اسکول ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے بھی ڈائمنڈ جیسا نظریہ پیش کیا۔ ان کے الفاظ ہیں

Language is vocal reaction to natural and physical conditions

زبان فطری اور جسمانی حالات کا صوتی ردّ عمل ہے۔ مختلف جذبات شلاً پیار، خوف، جھنجھلاہٹ وغیرہ کو ظاہر کرنے کے لیے مخصوص قسم کے شور یا آوازیں تھیں جو ایک گروہ کے بیچ ایک قسم کی کوڈ (code) یا اشارے کا کام دیتی تھیں۔ غیر متمدن انسانوں کی بولی بیشتر گلے سے پیدا ہونے والی غراہٹوں وغیرہ پر مشتمل تھی۔ یہی آوازیں رفتہ رفتہ ارتقا کر کے عرصۂ دراز میں زبان بن گئیں۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ایک ہی خیال یا حالت کو بالکل مختلف طریقے سے ادا کیا جاتا ہے جس سے یہ بحث اٹھتی ہے کہ کیا تمام زبانیں ایک ہی غیر متمدن بولی سے مستخرج ہوئیں یا کوئی سے۔

---

[1] بحوالہ ڈائمنڈ ص ۲۷۴

مندرجہ بالا نظریہ سیاسی ہے۔ آج کل دست و بازو کی محنت میں انسان شاذ و نادر ہی منہ سے آوازیں نکالتا ہے اور اگر کچھ 'ہوں'، 'ہیں'، کرتا بھی ہے تو یہ بے معنی اضطراری آوازیں زبان کے جنم دینے کو کافی نہیں۔ ان سے کہیں زیادہ زوردار اور متنوع آوازیں جانور نکالتے ہیں لیکن وہ زبان کی خالق نہ ہو سکیں۔ سوال یہ ہے کہ غیر متمدن انسان کی حیوان نما غوں غاں نے باقاعدہ ابجدی آوازوں کو کیسے جنم دیا۔

۱۱۔ **نغماتی نظریہ:** (Sing-Song Theory) اس نظریے کا موجد ڈنمارک کا مشہور فاضلِ لسانیات یسپرسن ہے۔ اس کے مطابق زبان کی ایجاد ترسیلِ خیالات کی ضرورت کے تحت نہیں ہوئی بلکہ لہو ولعب کے جذبۂ نشاط کا اُبال ہے۔ وحشی انسان کی ضرورتیں کم تھیں۔ نوجوان اپنا زیادہ وقت ناچ گانے اور پیار محبت میں بسر کرتے تھے۔ موسمِ بہار میں ایک نوجوان نے اپنی محبوبہ کو ایک طویل فقرے hey-and-a-ho-and-a-hey-nonino سے خطاب کیا ہوگا تو اس کے رفقاء نے نوجوان ہی کو اس فقرے سے موسوم کر دیا ہوگا۔ ایک گروہ نے اپنے جانی دشمن کو شکست دے کر مار ڈالا ہو اور سپاہی خوشی کی ترنگ میں لاش کے گرد کود کر ایک بے معنی مترنم فقرہ Tarrara-boom-de-ay الاپنے لگیں تو اس فقرے کو بعد میں کچھ معنی پہنائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہم نے خطرناک آدمی کو مار ڈالا۔ بعد میں اس قسم کے فقروں کو لفظوں میں توڑ لیا جائے گا اور ہر لفظ کے کوئی معنی متعین کر لیے جائیں گے۔ اس طرح زبان کی ابتدا جملے سے ہوتی ہے۔

حیرت ہوتی ہے کہ یسپرسن جیسا بالغ نظر عالم اس قسم کا نظریہ پیش کرے۔ یہ سیدھی سی بات ہے کہ حیوانی غوں غاں کے بعد اگلی منزل یک رُکنی آوازوں مثلاً آ۔ با۔ اے۔ سو۔ وغیرہ کی ہوگی۔ یہ ممکن نہیں کہ نطق کی ابتدا ر پیچیدہ فقروں یا طویل الفاظ سے ہو۔ پھر یہ بھی ثابت نہیں کہ ابتدائی انسان کو ہر دم رقص و موسیقی اور رومان کی فرصت اور چسکا تھا۔

۱۲۔ **ارتباطی نظریہ:** (Contact Theory) اسے نفسیات کے عالم ریویز (G. Reves3) نے پیش کیا۔ انسان مدنی الطبع ہے۔ وہ اپنی ابتدائی خواہشوں (بھوک، شہوت وغیرہ) کو گروہ کے دوسرے افراد تک پہنچانے کے لیے جسمانی لمس اور کسی حد تک آوازوں سے بھی فائدہ اٹھاتا ہوگا۔ ابتدا ر میں یہ اختلاط جذباتی سطح پر رہا ہوگا لیکن بعد میں یہ فکری اور ذہنی ہو گیا ہوگا۔ ضروریات کے ساتھ ساتھ یہ ارتباط اور آوازیں بڑھتی گئی ہوں گی۔ ابتدائی الفاظ کا مفہوم پورے جملوں کے برابر رہا ہوگا۔ بعد میں کئی الفاظ ملا کر جملے بنائے گئے ہوں گے۔ ریویز نے یہ نظریہ حیوانات، غیر متمدن قبیلوں اور بچوں کی نفسیات

کے مطالعے کے بعد پیش کیا لیکن بعض علما کی رائے میں یہ بھی قابلِ اطمینان نہیں۔

۱۲۔ ہنری سوئٹ کا نظریہ: سوئٹ نے زبان کے آغاز کے بارے میں ذیل کا نظریہ پیش کیا:

زبان کا ابتدائی روپ اشاروں اور اصوات دونوں پر مشتمل تھا۔ ابتدائی ذخیرہ الفاظ تین قسم کا تھا۔

ا حیوانات یا ذی روح اشیا کی آوازوں کی نقل پر مبنی مثلاً بھونکنا، کھٹکھٹانا۔

ب نجائی مثلاً آہ۔ وا

ج رمزیاتی (Symbolic) ان سے سوئٹ نے وہ الفاظ مراد لیے ہیں جن کی صوت اور مفہوم میں محض دور کا تعلق ہے مثلاً بچّہ ہونٹ ہلا کر بابا۔ ماما۔ پاپا وغیرہ کہتا ہے ان آوازوں کو ماں باپ نے اپنے پر منسوب کر لیا۔ بعض ضمیر اور افعال بھی کچھ اس قسم کے ہیں مثلاً انگریزی میں Hush Blow وغیرہ۔ شروع میں رمزیاتی الفاظ کی تعداد کافی رہی ہوگی۔ یہ الفاظ زیادہ تر اشیا کے نام ہوں گے۔ پھر لطیف اور غیر مرئی تصورات کے لیے الفاظ کہاں سے آئے۔ اس کی تاویل سوئٹ یوں کرتا ہے کہ مندرجہ بالا الفاظ کی مماثلت پر یا ان کے مجازی معنی لے کر لطیف تصورات کو جامۂ حرف عطا کیا گیا۔ مثلاً جنوبی افریقہ کی ساسوتو زبان میں مکھی کو "ن ت سی" کہتے ہیں۔ مکھی کی طرح چکر لگانا خوشامدیوں کا بھی شعار ہے اس لیے "ن ت سی" کے معنی چاپلوسی کرنے کے ہو گئے۔[1]

سوئٹ نے ابتدائی زبان کے تمام الفاظ میں صوت اور معنی میں کچھ نہ کچھ مناسبت فرض کی ہے حالاں کہ ہر زبان کے زیادہ تر الفاظ میں صوت اور مفہوم بالکل دو لخت ہوتے ہیں۔

ان سب نظریوں میں تھوڑی صداقت ضرور ہے لیکن اس کے باوجود بھی ان میں سے کوئی بھی تشفی بخش نہیں۔ ان میں سے کئی تو زبان کو انفرادی تخلیق سمجھ بیٹھے ہیں یعنی زبان کے سماجی پہلو ترسیل و ابلاغ کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں۔ یہ سارے نظریے زیادہ تر قیاس اور تخیّل سے کام لیتے ہیں کیوں کہ اُس گئے گزرے زمانے کے بارے میں کوئی سائنٹیفک تحقیق ممکن نہیں۔ زبان کے آغاز کی توجیہ کرنا اندھیری کوٹھری میں ٹٹولنے کے مترادف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب پیرس میں لسانیاتی سوسائٹی قائم کی گئی تو اس کے دستور کی دفعہ ۲ میں لکھ دیا گیا:

"سوسائٹی زبان کے آغاز یا ایک عالم گیر زبان کی تخلیق کے بارے میں کوئی مراسلہ منظور نہیں کرے گی۔"

---

[1] لینگویج از یسپرسن ص ۹۶

یسپرسن نے اس مسئلے کی کھوج کے لیے تین موضوعات تجویز کیے ہیں۔ بچّوں کی زبان کا مطالعہ۔ غیر متمدن قبائل کی زبانیں اور موجودہ زبانوں کی قدیم تاریخ۔ مندرجہ بالا نظریوں کے بانیوں میں سے اکثر نے ان کے مطالعے سے فائدہ اٹھایا ہے لیکن اس میں بھی قباحتیں ہیں۔ بچّے وہ زبان سیکھتے ہیں جو ان کے چاروں طرف مکمل حالت میں موجود ہے۔ وحشی انسان کا تخلیقِ زبان کا عمل اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ آج کے غیر متمدن قبیلوں کی زبانیں بھی ابتدائی زبان کی آئینہ دار نہیں کیوں کہ ان قبائل کی زبانیں ہزاروں بلکہ لاکھوں سال کے ارتقا کا نتیجہ ہیں۔ ہاں زبانوں کی گذشتہ تاریخ نسبتاً مفید ہے اس سے ہم ابتدائی زبان کی خصوصیات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو کچھ یوں ہیں:

(۱) ابتدائی زبان کی آوازیں زیادہ مشکل اور پیچیدہ تھیں۔ آج وہ مسلسل استعمال کی خراد پر چڑھ کر زیادہ سہل الادا ہو گئی ہیں (۲) قدیم زبان میں ترنم کا لہجہ غالب تھا (۳) الفاظ زیادہ طویل تھے لیکن ذخیرہ الفاظ کم تھا (۴) مادّی اشیاء کے الفاظ زیادہ تھے لطیف خیالات کے ترجمان الفاظ نہ ہونے کے برابر تھے (۵) قواعد کے اصول کم اور غیر واضح تھے۔ تصریف اور اشتقاق بہت کم ہوتا تھا۔ سابقے۔ لاحقے۔ حروفِ جارّہ نہ تھے۔ فعل میں زمانہ اور اسم میں جنس اور عدد نہ تھا (۶) جملے میں اکثر الفاظ کو ملا دیا جاتا تھا۔ ایک طویل لفظ ایک جملے کا مفہوم ادا کرتا تھا۔

زبان اور بولی

علم زبان کا موضوع زبان ہے لیکن زبان سے کئی معنی مراد لیے جاتے ہیں مثلاً
انسان کے لیے زبان خدا کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔
بے زبان جانوروں پر ظلم نہ کرو۔
ب مصر کی زبان عربی ہے۔

پہلے دو جملوں میں زبان سے مراد بنی نوع انسان کی صلاحیتِ نطق ہے اور آخری جملے میں زبان سے مراد صوتی علامات کا ایک مخصوص نظام ہے۔ فرانسیسی زبان میں ان دونوں کے لیے مختلف الفاظ ہیں اول الذکر کو لاں گاژ (Language) اور موخر الذکر کو لانگ (Langue) کہتے ہیں۔ جب ہم زبان کے آغاز کی بات کرتے ہیں تو ہماری مراد "لاں گاژ" ہوتی ہے جب کہ انگریزی اردو وغیرہ لانگ ہیں۔

اکثر اُردو، ہندی، انگریزی، فرنچ وغیرہ مختلف زبانوں کا ذکر کیا جاتا ہے لیکن ایک لسانی جماعت یعنی ایک زبان کے بولنے والوں کی حد بندی بڑی مشکل ہے۔ ہم برعظیم ہند و پاک میں پیشاور سے مشرق یا جنوب کی طرف سفر کریں تو ہمیں کہیں پر یکایک زبان کے بدلنے کا احساس نہ ہوگا یعنی ہر گاؤں یا شہر والے اگلے گاؤں یا شہر کی زبان کو بآسانی سمجھ سکیں گے۔ فرانس سے اٹلی کی طرف سفر کرتے جائیے زبان میں یوں نامحسوس تبدیلی ہوگی کہ فرنچ اور اطالوی ایک ہی سلسلۂ زبان معلوم ہوگا۔ جرمن اور ڈچ یا ناروے اور سوئیڈن کی زبانوں میں بھی اسی طرح کوئی حد فاصل نہیں، لیکن ایک سرے والے دوسرے سرے کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم ایک زبان کے علاقے سے گزر کر دوسری زبان کے علاقے میں داخل ہوگئے ہیں۔ یہ کیوں کر طے ہو کہ فرنچ اور اطالوی یا پنجابی اور مغربی ہندی کے درمیان خط تقسیم کہاں ہے۔ یہ الگ الگ زبانیں ہیں یا ایک ہی زبان کی بولیاں ہیں۔

ایک عام اصول یہ بنا لیا گیا ہے کہ جو لوگ ایک دوسرے کو سمجھ سکتے ہیں وہ ایک زبان کے بولنے والے ہیں۔ اب سمجھنا ایک اضافی امر ہے۔ گاؤں والوں کی نسبت شہر والے، بے پڑھوں کی

کی نسبت پڑھے لکھے اور ایک خطے میں عمر گزار دینے والوں کی نسبت سیاح اور جہاں دیدہ قسم کے لوگ دور دور تک کی زبانیں سمجھ لیتے ہیں.

ذیل کے دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

اک روز جہاں نو جانا ہے جا قبرے روچ سمانا ہے (بلھے شاہ پنجابی)

بشیرینی خواب آلودہ مژگاں، نشتر زنبور خود آرائی سے آئینہ طلسم موم جادو تھا

(غالبؔ)

ان میں پہلا شعر جو پنجابی کا ہے غالبؔ کے اُردو شعر کے مقابلے میں کہیں زیادہ آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ ہم دسیوں سال انگریزی پڑھنے کے باوجود انگریزی فلموں کے مکالمے نہیں سمجھ پاتے. میسور کے مسلمان جب آپس میں روانی سے اُردو میں بات چیت کرتے ہیں تو ایسا گمان ہوتا ہے جیسے کنڑی میں بول رہے ہوں، ہمارے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ اس طرح دو شخصوں کے درمیان باہم سمجھنے کی مقدار صفر سے لے کر سو فی صدی تک کچھ بھی ہوسکتی ہے۔ کس حد تک قابلِ فہم ہونا ایک زبان کی علامت ہے اور کس نقطے کے آگے دو تقریریں یا عبارتیں دو زبانیں ہو جاتی ہیں ؟

لسانیات کا طالب علم کھڑی بولی کا مطالعہ کرنا چاہے تو کہاں کی اور کس کی بولی کو لے جس کے بعد وہ دعویٰ کر سکے کہ کھڑی بولی میں فلاں آوازیں پائی جاتی ہیں اور اس کے فلاں قواعد ہیں. لسانیات نے اس وادیٔ سنگلاخ میں اپنی بے دست و پائی کا اعتراف کر کے یہ اصول بنایا ہے کہ صحت اور قطعیت کے ساتھ صرف ایک فردِ واحد کی زبان ہی کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

انفرادی بولی کو انگریزی میں (Idiolect) کہتے ہیں. ہر شخص کے بولنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ یہ اس سے ظاہر ہے کہ ہم کسی کو دیکھے بغیر اس کی آواز سے پہچان لیتے ہیں ٹیلی فون تک کی آواز سے شخصیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ عمر کے ساتھ ساتھ ایک فرد کی زبان میں تلفظ، لہجے اور ذخیرۂ الفاظ میں تبدیلی ہوتی جاتی ہے۔ آلات تو یہاں تک ثابت کرتے ہیں کہ ایک شخص ایک لفظ کو ایک بار جس طرح بولتا ہے آئندہ کبھی اس طرح نہیں بول سکتا۔ اس انتہائی صورت کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہم ایک شخص کی عمر کی ایک منزل کی زبان کو انفرادی بولی مان کر آگے بڑھ سکتے ہیں. اب جغرافیائی اعتبار سے ذیل کا سلسلہ ملاحظہ ہو:۔

ا ب ج د

مندرجہ بالا شکل میں چار نقطے انفرادی بولیوں کے مجموعے ہیں جو مختلف مقامات میں واقع

ہیں۔ ب کے افراد ا اور ج دونوں کی بولیاں سمجھتے ہیں۔ ج والے ب اور د دونوں کو سمجھ ہیں لیکن ا اور د والے ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ا اور د دو مختلف زبانیں ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان کے درمیان حدِ فاصل کہاں قائم کی جائے ؟

ہم ا یا د کی ایسی خصوصیات لیں گے جو ایک کو دوسرے سے مختلف روپ دیتی ہیں مثلاً قواعد کے بعض اصول، بعض آوازیں اور بعض بنیادی الفاظ۔ ان کے استعمال کے علاقے کا تعین ہو جائے تو ہم موٹے طور پر ایک لسانی سرحد قائم کر سکیں گے۔ لسانی سرحد پر دراصل ایسی زبان بولی جاتی ہے جو دو زبانوں کے بین بین ہوتی ہے جس میں کچھ خصوصیات اس زبان کی اور کچھ دوسری زبان کی ہوتی ہیں۔ یہ سرحد جامیٹری کا سیدھا باریک خط نہیں ہوتا بلکہ ایک چوڑی سی پیچ و خم والی پٹی ہوتی ہے اس سرحد کے آس پاس ایک دوسری زبان کے جزیرے ہوتے ہیں۔

ایک دوسرے کی زبان کی فہم کی مقدار معلوم کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ مختلف علاقوں کی دو انفرادی بولیوں کو لو۔ ان کے مشترک ذخیرۂ الفاظ کا شمار کرو۔ بعض اوقات دور دور کی بے تعلق زبانوں میں بھی بعض الفاظ ہیئت و معنی دونوں کے اعتبار سے یکساں ہوتے ہیں لیکن وہ محض اتفاق ہوتا ہے۔ مطالعے سے معلوم ہوا ہے کہ ذخیرۂ الفاظ میں اتفاقی مماثلت چار فی صدی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بقیہ الفاظ اگر بہت بڑی تعداد میں مشترک ہوں تو ہم ایسی دو انفرادی بولیوں کو ایک زبان کا حصہ قرار دیں گے۔ اس اصول کا اطلاق بھی اتنا سہل نہیں۔ اشتراک کسے کہا جائے۔ گھوڑا، گھوڑو اور گھڑوا۔ یا سانڈ اور سانڑ۔ یا مارتا ہے اور ماردا ہے۔ یا آٹھ اور اٹھ کو یکساں قرار دیا جائے یا مختلف، بڑی مشکل ہے۔

اس الجھن سے بچنے کا راستہ یوں نکالا گیا ہے کسی کی بات چیت کو ریکارڈ کر لیجیے۔ دوسرے شخص کو یہ ریکارڈ سنا کر معلوم کیجیے کہ وہ کتنے مطالب و ارنکات کو سمجھ سکا۔ اگر وہ بیشتر مطالب کو سمجھ سکا ہے تو دونوں افراد ایک زبان کے بولنے والے ہیں ورنہ نہیں۔

دو شخصوں کا ایک دوسرے کی بات سمجھ لینا مشترک الفاظ کی تعداد پر منحصر ہے۔ دو بولیوں میں مشترک یا مماثل الفاظ پائے جائیں تو اس کی دو تاویلیں کی جا سکتی ہیں :۔ (۱) یا تو یہ دخیل (Loan) الفاظ ہیں (۲) یا یہ دونوں کا آبائی ورثہ ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ دونوں زبانیں ایک خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ملیالم میں کوئی اسی فیصدی سنسکرت الفاظ ہیں اور انگریزی میں تقریباً ۶۰ فی صد فرنچ الفاظ ہیں جو باہر سے داخل ہو گئے ہیں۔ دوسری طرف ہندی اور بنگالی میں الفاظ کا اشتراک ان کے ہم جدی ہونے کی وجہ سے

ہے۔ تاریخی لسانیات کی مدد سے زبانوں کا خاندانی رشتہ متعین ہو جائے تو زبانوں کے وصل وفصل اوران کی لسانی حدود طے کرنا سہل ہو جاتا ہے۔

ہم نے اب تک قابلِ فہم ہونے کو زبان کی حد بندی کا معیار قرار دیا ہے لیکن اس میں بھی کسی قدر پیچیدگیاں ہیں۔ سمجھا جانا منحصر ہے ذخیرۂ الفاظ کے ایک بڑے حصے کے اشتراک اور مشابہت پر۔ ہریانی اور پنجابی میں، اردو اور فارسی میں، انگریزی اور فرنچ میں بہت سے الفاظ مشترک یا مماثل ہیں

شمارِ سبحہ، مرغوب بتِ مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

اس شعر کو ایک ایرانی سمجھ سکتا ہے۔

تو کیا ہریانی اور پنجابی یا انگریزی اور فرنچ کو ایک زبان کی دو بولیاں قرار دے دیا جائے ؟ نہیں! یہاں ہمیں اپنے اصول میں ترمیم کرنی پڑتی ہے۔ زبانوں کے رشتے میں صرف بنیادی الفاظ رہنمائی کرتے بقیہ ذخیرۂ الفاظ کی اہمیت نہیں۔ وہ بنیادی الفاظ کیا ہیں۔

اہم اعضائے جسم کے نام :۔ آنکھ۔ ناک۔ کان۔ ہاتھ۔ پاؤں

خاص رشتے :۔ ماں۔ باپ۔ بیٹا۔ بیٹی۔ بھائی۔ بہن

گنتی کے الفاظ :۔ ایک دو تین چار دس گیارہ بارہ تیرہ بیس اکیس وغیرہ

بنیادی افعال :۔ آنا جانا۔ کھانا پینا۔ چلنا۔ کرنا۔ مارنا

ضمائر :۔ میں۔ ہم۔ تم۔ وہ

ایک ماخذ سے کچھ ہی پہلے جدا ہونے والی دو زبانوں یعنی سگی یا چچیری بہنوں میں یہ الفاظ بھی بڑی حد تک مماثل ہوتے ہیں۔ ملاحظہ ہو :۔

ہندی	مراٹھی	گجراتی	تامل	کنڑ	ملیالم
ناک	ناہ	ناہ	موکو	موگو	موک
کان	کان	کان	چیوی	کیوی	چیوی
کھا	کھا	کھا	تن	تنتو	تنتو
پی	پی	پی	کدی	کدی	کدی

یہ بھی باوثوق پیمانہ نہ ہوا۔ ایک خاندان کی مختلف زبانوں میں بنیادی الفاظ مشترک ہو سکتے ہیں۔ الفاظ کی مماثلت سے زیادہ قابل وثوق یہ اصول ہے کہ قواعد کی مماثلت پر تکیہ کیا جائے۔ تصریف واشتقاق کے قواعد اور کلام کی نحوی ساخت زبانوں کے حصار کی حد بندی کا بہترین ذریعہ ہیں

یہ ایک زبان کی مختلف بولیوں میں مماثل ہوتے ہیں اور مختلف زبانوں میں مختلف۔ فعل کی گردان، اسم و ضمیر کی تعریف، حروفِ جار کا استعمال زبان کی امتیازی خصوصیات ہیں۔

ایک زبان کے بولنے والوں میں جس قدر ملنا جلنا ہوگا اسی قدر ان کی بولی یکساں ہوگی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک بڑے علاقے میں بسنے والے لسانی گروہ میں امتدادِ زمانہ کے ساتھ مقامی خصوصیات پیدا ہوتی جائیں گی۔ یہ اختلافات ایک زبان کو بولیوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایک بولی کے بولنے والوں کی انفرادی بولیوں میں کم و بیش یکسانیت ہوتی ہے۔ کیا قواعد، کیا روزانہ ضرورت کے ذخیرۂ الفاظ دونوں میں مکمل مطابقت معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ بولی کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے "بولی کسی زبان کی وہ ذیلی شاخ ہے جس کے بولنے والوں کو کسی لسانی اختلاف کا احساس نہیں ہوتا۔"[1]

زبان کا علاقہ جتنا بڑا ہوگا اتنی ہی اس میں بولیاں زیادہ ہوں گی۔ یہ علاقہ اگر دشوار گزار ہوگا یعنی اگر اس کے باشندے ایک دوسرے سے کم مل جل پاتے ہوں گے تو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بولیوں کا فرق ہوتا جائے گا۔ غیر متمدن قبائل میں چوں کہ نقلِ مکانی کم ہے اس لیے ان زبانوں میں بولیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ انڈونیشیا کے جزیرہ Celebes میں سیکڑوں بولیاں ہیں۔ نیوگنی میں اس سے بھی زیادہ ہیں۔ صفحۂ زمین سے محو ہونے سے قبل چھوٹے سے جزیرے تسمانیہ کے جنگلیوں کی تعداد محض پچاس رہ گئی تھی اور وہ چار بولیاں بولتے تھے جن میں آنکھ، ناک، سر کے لیے الگ الفاظ تھے۔[2]

زبان بولیوں کے مجموعے کا نام ہے لیکن جب ہم کسی کتاب میں ہندی، اُردو یا انگریزی زبان کے نمونے پڑھتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ یہ الفاظ اس زبان کی ہر بولی کا مشترک حصہ ہیں، نہیں بلکہ یہ کتابی زبان بھی ایک بولی کی منزہ صورت ہے جو بعض غیر لسانی وجوہ سے مؤقر ہوگئی ہے۔ کسی زبان کی سب سے اہم بولی کو معیاری زبان قرار دیا جاتا ہے۔ بولنے والوں کی یا مقام کی اہمیت سے کوئی بولی اہم ہوکر معیاری ہو جاتی ہے۔ معیاری زبان کے تعین میں اور دوسری بولیوں کی تقابلی اہمیت میں ذیل کے اسباب میں سے کوئی ایک یا کئی کارفرما ہوتے ہیں۔

۱۔ سیاسی اقتدار والے علاقے مثلاً راج دھانی کی بولی معیاری زبان بن جاتی ہے۔ دلی کی اردو لندن کی انگریزی اور روم کی لاطینی بولیاں اپنی زبان کی معیاری شکل قرار پائیں۔ پونا کی مراٹھی بھی اسی

1, Linguistic change by Sturtevant. P. 146. Chicago. 1961

2. " " " " P. 153 " "

اسی وجہ سے معیاری مانی گئی۔

۲۔ کسی مقام کی دینی برتری بھی وہاں کی بولی کو اہم کر دیتی ہے۔ متھرا کی برج بھاشا اور ایودھیا کی اودھی معیاری تسلیم کی جاتی تھیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایک زمانے میں برج اور اودھی کو زبان کا مرتبہ حاصل تھا۔ امرتسر کی بولی کو پنجاب کی معیاری زبان قرار دینے کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سکھوں کا مقدس مقام ہے۔

۳۔ جس بولی میں جتنا ادب ہوگا اسی مناسبت سے اس کی اہمیت ہوگی۔ مغربی ہندی کی بولیوں میں ماضی میں برج اور آج کھڑی بولی سب سے اہم ہے۔ مشرقی ہندی میں اودھی بقیہ دو بولیوں یعنی بھیگی یا چھتیس گڑھی سے کہیں زیادہ اہم ہے اور اس کی وجہ ان کے ادب کی کیفیت وکمیت ہے۔

اگر کسی وجہ سے معیاری زبان کی اہمیت کم ہوجاتی ہے تو وہ محض بولی ہو کر رہ جاتی ہے اور کوئی دوسری بولی معیاری زبان کا رتبہ حاصل کرلیتی ہے۔ شاہ جہاں کے عہد تک جب آگرہ ہندوستان کا دارالخلافہ تھا، برج ہندی کا معیاری روپ تھی اور کھڑی بولی محض ایک بولی تھی۔ شاہ جہاں نے جب دارالسلطنت دلی کو منتقل کر دیا تو کھڑی بولی معیاری زبان ہوگئی اور برج محض ایک بولی ہو کر رہ گئی۔

معیاری زبان تعلیم وادب، نظم ونسق، تہذیب اور مجلس کی زبان ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کی اہمیت اور وقعت روز افزوں ہوتی جاتی ہے۔ یہ مختلف بولیوں کے درمیان مشترک زبان کا کام دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیاری زبان میں بات چیت کرنا تہذیب اور مرتبت کی نشانی سمجھا جاتا ہے اور بولی کا استعمال تہذیب وتعلیم وامارت سے بے بہرہ ہونے کی علامت۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معیاری زبان شہروں سے بولیوں کو نکال کر ان کی جگہ پر قابض ہو جاتی ہے۔ بولیوں میں ادب کی تخلیق رک جاتی ہے اور معیاری زبان ہی ادب کی زبان بن جاتی ہے۔

معیاری زبان اور بولی کے کئی روپ ہوتے ہیں

ادبی زبان سب سے زیادہ فصیح اور قواعد وضوابط میں جکڑبند ہوتی ہے۔ اس سے نیچے دوسرے موضوعات کی تحریری زبان ہوتی ہے مثلاً اخبار یا تاریخ اور جغرافیہ کی کتابوں کی زبان معیاری زبان کی تقریری شکل اس سے زیادہ وارستہ ہوتی ہے۔ کتابوں میں زبان جس طرح لکھی جاتی ہے اس طرح کوئی بولتا نہیں ورنہ گفتگو کو مصنوعی اور کتابی کہا جائے گا۔ اسی طرح تقریر کا روزمرہ تحریر میں پیش نہیں کیا جاتا کیوں کہ بولنے میں جلدی کی خاطر لفظوں کے تلفظ کو کچھ نہ کچھ مختصر اور مسلسل کیے بغیر چارہ نہیں۔

معیاری زبان ہی کی قدرے مختلف شکل بعض پیشوں کی طبقاتی زبان ہے مثلاً انجینیر، ڈاکٹر، وکیل

مذہبی قائدین، کھلاڑی، کرخندار اور آڑھتی کی زبان۔ ہندوستانی طلبا کی زبان میں انگریزی الفاظ، مولویوں کی زبان میں عربی و فارسی الفاظ، پنڈتوں کی بھاشا میں سنسکرت الفاظ کی بہتات ہوتی ہے۔

معیاری زبان میں بولنے والوں کی تعلیمی اور معاشی حالت کے اعتبار سے کئی درجے ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے یا مرفہ الحال طبقے زبان کا پاکیزہ روپ استعمال کرتے ہیں۔ تعلیم سے محروم یا معاشی اعتبار سے فروتر افراد اس کو کسی قدر مسخ کر کے بولتے ہیں۔ ان کی زبان کو ہم پست معیاری زبان (Sub-Standard Language) کہیں گے۔ اسے شہروں کے کم پڑھے لکھے لوگ، طبقۂ متوسط کی نچلی سطح کے افراد[1] (Lower-middle) کاری گر، مستری، خوانچے والے، چھوٹے دوکاندار استعمال کرتے ہیں۔ گویا یہ معیاری زبان کی غیر فصیح شکل ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ملک کی مشترک زبان کے طور پر یہی رائج ہوتی ہے۔ ہندوستان کی عوامی قومی زبان کوئی ہے تو یہ ہے جس کا ایک دلچسپ نمونہ بمبئی کی اُردو ہے۔

معیاری زبان کسی زبان کی سب سے اہم بولی کا نام ہے۔ اس کے علاوہ زبان میں دوسری مقامی بولیاں بھی شامل ہوتی ہیں اور لسانیات کے طالب علم کو ان میں بہت زیادہ دل چسپی ہوتی ہے۔ بڑی زبانوں کی بولیاں بھی خاصے بڑے علاقے پر پھیلی ہوتی ہیں۔ چنانچہ یہ کچھ اور ذیلی بولیوں (Sub-dialects) میں بنٹ جاتی ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ ہر بارہ کوس کے بعد پانی اور بانی (آواز یا زبان) بدل جاتے ہیں۔ اتنا بھی نہ سہی تو تقریباً ستّر اسّی میل بعد یعنی ایک ضلع کے ساتھ ساتھ بولی بدل جاتی ہے۔ مغربی ہندی کی ایک بولی ہے کھڑی بولی۔ کھڑی بولی کی ذیلی بولیاں، سہارنپور کی بولی، ضلع بجنور کی بولی، رامپور کی بولی وغیرہ ہیں۔ ان علاقوں کے رہنے والے ان کے نازک اختلافات کو بخوبی پہچانتے ہیں۔ مثلاً سہارنپور کی زبان میں نون غنہ کے اعلان کا رجحان ہے۔ بجنور میں طویل مصوتے (Vowel) کے بعد آنے والے مصمتے (Consonant) کو کسی قدر مشدد کر دیا جاتا ہے مثلاً "آگّے"، "بوتّی"۔ مرادآباد میں بعض ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں جن سے آس پاس کے اضلاع والے ناواقف ہیں مثلاً "بِہاری کرنا" بمعنی اڑالینا "صوفی" بمعنی امرود۔

بولی کی سب سے زیادہ مسخ شدہ شکل کو گنوارو بولی (پیٹوا Patois) کہتے ہیں! اس کا علاقہ تو مختصر ہوتا ہی ہے، یہ غیر مہذب اور جاہلانہ بھی سمجھی جاتی ہے۔ جس طرح معیاری بولی کی غیر فصیح شکل کو پست معیاری بولی کہا گیا تھا اسی طرح علاقائی بولی کے پست تر گروپ کو گنوارو بولی

1, Bloomfield. Language 1955 P. 50

کہہ سکتے ہیں۔

ایک بحث ہے کہ زبان اور بولیوں کا تاریخی رشتہ کیا ہے۔ کیا امتدادِ زمانہ کے ساتھ ایک زبان بنٹ کر بولیوں میں تقسیم ہو گئی یا مختلف بولیاں مل جل کر زبانیں بن گئیں، یعنی بولیاں پہلے آئیں یا زبان؟

ریناں[1] (Renan) اور میکس مولر کا خیال ہے کہ زبان کا فطری ارتقا انتشار سے اتحاد کی طرف ہے۔ ابتدا میں انسانی بولیاں متعدد ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ میل جول کے ساتھ اُن کے اختلافات کم ہوتے گئے اور وہ ایک زبان کی شکل میں گٹھ گئیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ابتدا میں خاندان گوتر، ذات پات اور قبیلے تھے جو بعد میں قوم کی شکل میں منظم ہو گئے۔ امریکی ماہرِ لسانیات وھٹنے[2] اس نظریے کے خلاف ہے۔ اس کی رائے ہے کہ زبان پہلے آئی اور وہ آہستہ آہستہ بولیوں میں تقسیم ہو گئی۔ کچھ اور عرصے کے بعد یہ بولیاں خود زبان کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں اور ان سے پھر بولیاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایسی بدیہی بات ہے جس کے ثبوت کی ضرورت نہیں۔ زبانوں کی تاریخ اس کی سب سے بڑی شاہد ہے۔ ہند یورپی یا ہند آریائی کی تاریخ کے آئینہ میں دیکھیے، زبانیں کس طرح بولیوں کو جنم دیتی ہیں۔

لسانی تاریخ میں یہ واقعہ عام ہے کہ بولیاں ایک دوسرے سے جُدا ہو کر مختلف زبانیں بن جاتی ہیں۔ اطالوی یا فرنچ یا جرمن اور ڈچ کسی زمانے میں ایک زبان کی دو بولیاں تھیں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ سو دو سو سال میں برطانیہ اور امریکہ کی انگریزی یا ہندوستان اور پاکستان کی اُردو دو مختلف زبانیں ہو جائیں۔ اس کے برعکس شاذ و نادر ایسا بھی ہوتا ہے کہ زبان زوال پذیر ہو کر محض بولی رہ جاتی ہے۔ برج اور اودھی کو عہدِ وسطیٰ میں زبان کا درجہ حاصل تھا۔ اب وہ ہندی کی بولیاں ہو کر رہ گئی ہیں۔ میتھلی اور راجستھانی کو بھی ہندی والے بولی قرار دینا چاہتے ہیں۔ کون جانے کہ لسانی جبر کے زیر اثر کچھ زمانے کے بعد پنجابی بھی ہندی کی بولی بن کر رہ جائے۔

معیاری زبان میں پھیلنے کا رجحان ہوتا ہے وہ پاس پڑوس کی بولیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ روم کی لاطینی بولی آس پاس کی کئی بولیوں کو کھا گئی۔ معیاری زبان اور بولیاں ایک دوسرے کو متاثر بھی کرتی ہیں۔ انبالے کی ہندی پر ہریانی کا اثر اور بنارس کی ہندی پر بھوجپوری کے اثرات

1, Language and the Study of Language by Whitney. London 1884 P. 177

2, " " " " " " P. 180

ہیں ۔ اُردو کی دکھنی بولی پر مراٹھی کے اثرات ہیں اور جہاں تک لہجے کا تعلق ہے آندھرا کی اُردو تلگو لہجے میں اور میسور کی اُردو کنڑ لہجے میں بولی جاتی ہے ۔اس کے ساتھ ساتھ علاقائی بولیاں معیاری بولی سے ذخیرۂ الفاظ بلکہ بعض اوقات قواعدی روپ بھی لیتی جاتی ہیں۔

بولیوں میں زندگی کا حرکی خوں رواں دواں ہوتا ہے۔ یہ ارتقار پذیر ہوتی ہیں۔ معیاری زبان ادب اور قواعد کی اسیر ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ ہر قدم پر سند کی تلاش کرتی ہے۔ روزمرّہ سے بیگانہ ہو کر یہ روایت پسند اور ماضی پرست ہو جاتی ہے۔ بولیاں مستقبل کا آئینہ ہوتی ہیں۔ آخرِ کار معیاری زبان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تقریر سے بچھڑ کر پیچھے رہ گئی ہے۔ ہار کر اور جھنجھلا کر اُسے بولی کا ساتھ دینا پڑتا ہے شروع شروع میں وہ جن لسانی تبدیلیوں پر ناک بھوں چڑھا کر انھیں تحقیر کے ساتھ ٹکسال باہر قرار دیتی ہے ایک عرصے کے بعد اُسے وہی اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ معیاری بولی کی زندگی کی شرط یہی ہے کہ وہ بولیوں کی طرف سے مغائرت نہ برتے اور ان کے ذخیرۂ الفاظ سے استفادہ کرتی رہے ورنہ سنسکرت کی طرح قواعد بند ہو کر ٹھٹھر جائے گی۔ معیاری زبان اس ندی کی طرح ہے جس کی سطح کے اوپر برف کی جامد تہہ جمی ہو لیکن اس کے نیچے موجِ تہہ نشیں مچل رہی ہو۔ یہ امواجِ تہہ نشیں بولیاں ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ گفتگو عموماً بولی ہی میں کی جاتی ہے۔ معیاری زبان صرف پُرتکلّف موقعوں کے لیے ہوتی ہے۔ کلاس روم عدالت ، اسمبلی ، لکچر ہال وغیرہ میں بھلے ہی باقاعدہ ٹکسالی معیاری زبان بولی جائے ، گھر میں آکر ہر شخص کا رجحان بولی کی طرف ہو جاتا ہے۔

تقریری روپ سے زیادہ کنارہ کشی اور لغت و قواعد کے زیادہ احترام کے باعث بعض اوقات زبانیں مر بھی جاتی ہیں یعنی ان کا بولنے والا کوئی نہیں رہتا۔ سنسکرت اور عبرانی اس کی مثالیں ہیں لیکن ان کی خاکستر پر دوسری نسل پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسری کئی وجوہ سے بھی زبانیں مردہ ہو جاتی ہیں۔ یعنی کبھی تو ان کے بولنے والے تنازع للبقا میں پسپا ہو کر ختم ہو جاتے ہیں جس طرح تسمانیہ والے گئے گزرے ہو گئے ، یا جنوبی ہند میں ٹوڈا تقریباً ختم ہو چکے ہیں یا ریڈ انڈین روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ بعض صورتوں میں ایک زبان کے بولنے والے سیاسی یا تہذیبی حیثیت سے دوسری زبانوں کے زیرِ اقتدار آکر آہستہ آہستہ اپنی زبان کو ہاتھ سے گنوا دیتے ہیں۔ امریکہ کے حبشیوں نے اپنی زبانیں چھوڑ کر انگریزی اختیار کر لی ہے۔ آئرلینڈ میں جہاں کی زبان انگریزی سے مختلف خاندان کی تھی ، اب عام طور سے انگریزی بولی جاتی ہے۔ ماضی کے طویل دھندلکے میں متعدد چھوٹی زبانیں اس طرح کالعدم ہو گئی ہیں کہ ان کا نام لیوا بھی صفحۂ ارض پر موجود نہیں۔ چنانچہ یہ یقینی ہے کہ گردِ تاریخ میں دفن ہو جانے والی زبانوں کی تعداد

زندہ زبانوں سے کہیں زیادہ ہے۔

بعض اوقات احیائیت یا علاقائیت کا جذبہ بولی کو ایک وقعت عطا کر دیتا ہے۔ میتھلی اور راجستھانی کو زبان کا مرتبہ دلانے کی ایک نحیف سی تحریک ہے جس کے زیرِ اثر ان بولیوں میں ادب کی کچھ نہ کچھ تخلیق کی جا رہی ہے۔ بھوجپوری میں فلمیں بن رہی ہیں۔ پرشوتم داس ٹنڈن اودھی میں بات چیت کرنے میں زیادہ آسودگی محسوس کرتے تھے۔ بلوم فیلڈ کے مطابق جرمنوں میں پچھلی ایک صدی میں بولیوں کے لیے ایک رومانی لگاؤ کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ طبقۂ بالا کے بعض جرمن گھر میں بولی ہی میں گفتگو کرتے ہیں۔ سوئزرلینڈ کے جرمن اپنے گھروں اور پڑوسیوں سے مقامی بولی میں بات چیت کرنا پسند کرتے ہیں۔

بولی انسان کی بنیادی ضرورتوں/ہوا، پانی، سادہ خوراک کی طرح ہے۔ معیاری زبان ہماری ان ضروریات کی طرح ہے جو تہذیب نے پیدا کر دی ہیں مثلاً ریل/بجلی، ابتدا میں یہ آسائش رہی ہوں گی لیکن اب ان کے بغیر زندگی مشکل ہے۔ ادبی زبان ان آسائشوں کی طرح ہے جو خواص کے لیے ہوتی ہیں مثلاً موٹر، ٹیلی فون، قصر و ایوان۔ تہذیب کے فروغ کے لیے ان سبھی کی ضرورت ہے۔

اُردو مصوّتے

مصوّتوں کی ادائیگی میں پھیپھڑوں سے خارج ہونے والی ہوا صوتی تاروں کے تنگ کوچے سے رگڑ کھاتی ہوئی نکلتی ہے اور اس کے بعد خلائے حلق یا منہ میں کہیں کسی رکاوٹ یا رگڑ سے دوچار نہیں ہوتی۔ مصوّتوں کی تفریق ذیل کے تین امور پر مبنی ہے: (۱) زبان کے اگلے، وسطی اور پچھلے حصّوں میں سے کون سا حصّہ اوپر اٹھتا ہے (۲) یہ حصّہ کس قدر اوپر اٹھتا ہے اور منہ کس قدر کھلتا ہے (۳) ہونٹ مدوّر ہو جاتے ہیں یا کشیدہ رہتے ہیں۔ زبان کے اگلے حصّے سے ادا ہونے والے مصوّتے کو اگلا مصوّتہ، وسطی حصّہ سے ادا ہونے والے کو وسطی اور پچھلے حصّے سے ادا ہونے والے کو پچھلا مصوّتہ کہہ سکتے ہیں۔ وسطی مصوّتہ صرف ایک ہے جو اُردو میں فتح اور صوتیاتی رسم الخط میں [ə] سے ظاہر کیا جاتا ہے۔

اُردو میں خفیف مصوّتوں کو اعراب یا حرکت اور طویل مصوّتوں کو حرفِ علّت کہا جاتا ہے۔ جامعۂ ازہر میں شعبۂ صوتیات میں ان سب کو "حرکت" کہتے ہیں لیکن یہ اصطلاحیں اطمینان بخش نہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے ان کے لیے مصوّتہ کی اصطلاح استعمال کی جو Vowel کا موزوں ترین ترجمہ ہے۔ اُردو صوتیات میں اب اس اصطلاح کا عام طور سے چلن ہو گیا ہے۔

اُردو میں مصوّتوں کی تعداد کے بارے میں سائنٹیفک ڈھنگ سے بہت کم لکھا گیا ہے جب کہ ہندی میں اس سلسلے میں بڑی موشگافیاں کی گئی ہیں۔ چوں کہ اُردو اور ہندی اساسی طور پر یکساں زبانیں ہیں۔ اسی لیے اس موضوع پر غور کرتے ہوئے ہم اُردو علمار کے ساتھ ہندی کے ماہرینِ لسانیات کے بیانات سے بھی استفادہ کریں گے

اُردو مصوّتوں کی تعداد پر غور کرنے سے پہلے اگر ہم متنازع اصوات کے بارے میں کسی فیصلے پر پہنچ جائیں تو بہت سی الجھنوں سے محفوظ رہیں گے وہ دو آوازیں ہیں: اَے (ए) اور اَو (औ) سوال یہ ہے کہ یہ واحد مصوتے ہیں یا جُڑواں مصوّتے۔

۱۔ ہندی کے علماء ڈاکٹر شیام سندر داس[1] اور ڈاکٹر دھریندر ورما[2] کے مطابق یہ جڑواں مصوتے ہیں لیکن ڈاکٹر ورما اردو میں ان کو جڑواں مصوتے کہنے پر مصر نہیں۔

۲۔ ڈاکٹر زور[3] کی رائے میں اَے واحد مصوتہ ہے لیکن اَو جڑواں ہے۔ ڈاکٹر گراہم بیلی نے پنجابی میں اور ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے بنگالی میں اَے کو واحد مصوتہ قرار دیا ہے۔

۳۔ ڈاکٹر گراہم بیلی[4] کے نزدیک اُردو میں یہ دونوں مصوتے اکثر واحد بولے جاتے ہیں لیکن شاذونادر انھیں جڑواں بھی بول دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں[5] کا بھی یہی مسلک ہے۔

۴۔ ڈاکٹر اودے نرائن تواری[6]۔ چودھری محمد نعیم[7]۔ ڈاکٹر کیلاش چند بھاٹیا[8] اور سرسوتی سرن کیف[9] ان دونوں آوازوں کو واحد مصوتہ قرار دیتے ہیں۔

سنسکرت میں اِے۔ اَے۔ اَو۔ اُو۔ چاروں کو جڑواں مصوتہ مانا گیا ہے۔ اُس زمانے میں ان کا تلفّظ اسی طرح ہوتا ہوگا بعد میں اِے اور اُو کو واحد بولا جانے لگا لیکن اَے اور اَو جڑواں ہی رہے۔ چنانچہ ہندی رسم الخط میں اَے اور ائی کے لیے ایک ہی علامت ऐ ہے۔ اَو اور اوُ کے لیے ایک علامت औ ہے۔ آج کیفیت یہ ہے کہ مشرقی ہندی میں ان آوازوں کو جڑواں مصوتے کے طور پر بولنے کا رجحان ہے لیکن کھڑی بولی کے علاقے میں ان کو قطعی اور واضح طور پر واحد بولا جاتا ہے۔ فصیح اُردو میں انھیں وصلی طور پر بولنا دہقانیت سمجھا جائے گا مگر ہندی کے

---

[1] بھاشا وگیان، طبع پنجم صہ ۱۳۲

[2] ہندی بھاشا کا اتہاس، طبع چہارم صہ ۱۱۱۔ اس مضمون میں آئندہ ان دو مصنفین کا نام آنے پر انھیں کتابوں کی طرف اشارہ سمجھنا چاہیے۔

[3] Hindustani Phonetics

[4] اُردو اور ہندی کا تلفظ، مترجم چودھری محمد نعیم۔ اردو ادب۔ دسمبر ۱۹۵۶ء صہ ۹۳

A Phonetic Phonological study of the world in Urdu P.9

[5] ۔[6] ہند بھاشا کا اُدگم اور وکاس۔ صہ ۳۱۸ طبع اوّل

[7] اُردو ادب، دسمبر ۱۹۵۶ء صہ ۱۰۰

[8] ہندی اکشر مشمولہ رج رشی ابھی نندن گرنتھ صہ ۵۴۹

[9] ہندوستانی صوتیات مطبوعہ نیا دور، مارچ ۱۹۶۱ء صہ ۱۱

ماہرین اَے اور اَو کو جڑواں مصوتہ کہنے پر مصر ہیں۔

جڑواں مصوتے کا تلفظ کرتے وقت اعضائے نطق ایک مصوتے سے ابتدا کرتے ہیں اور پھسل کر دوسرے مصوتے پر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح کہ دونوں آوازیں ایک ہی کوشش اور ایک ہی جھٹکے میں ادا کی جاتی ہیں۔ جڑواں مصوتے کا تلفظ اگر دیر تک جاری رکھا جائے تو پہلے مصوتے کی آواز ابتدا ہی میں ختم ہو جائے گی اور آخری مصوتہ جاری رہے گا۔ مثلاً آئی یا ائی کو اگر ہم دیر تک جاری رکھیں تو محض اِی کی آواز سُنائی پڑے گی یعنی جڑواں مصوتہ سالم حیثیت میں دیر تک ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اَے اور اَو کو ہم کتنی ہی دیر تک کھینچ کر بول سکتے ہیں اور ہر موقع پر ان کا پورا تلفظ سُنائی دے گا۔ اس طرح یہ طے ہو جاتا ہے کہ اَے اور اَو واحد مصوتے ہیں۔

ان دو مصوتوں کے علاوہ ذیل کے ۸ مصوتوں پر عام طور سے اتفاق ہے: اِی، ई -اِ، इ

اِے ए اَ، अ آ، आ او، ओ اُ، उ اوٗ ऊ

ڈاکٹر شیام سندر داس اور ڈاکٹر دھریندر ورما نے ہندی کی تمام بولیوں مثلاً اودھی، برج میں کل ملا کر ۱۹ مصوتے قرار دیے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے: ۸ مندرجہ بالا مصوتے + ایک انگریزی مستعار الفاظ مثلاً لارڈ، کانگریس وغیرہ کا مصوتہ ऑ دس برج اور اودھی وغیرہ کے مصوتے۔

ڈاکٹر کیلاش چند بھاٹیا کی رائے میں ہندی میں گیارہ مصوتے ہیں۔ اَے + اَو + انگریزی مصوتہ ऑ + ۸ مندرجہ بالا مصوتے۔

ڈاکٹر دھریندر ورما (محض اردو کی حد تک) ڈاکٹر اودے نرائن تواری، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور چودھری محمد نعیم نے محولۂ بالا تحریروں میں مصوتوں کی کل تعداد دس مانی ہے یعنی اَے + اَو + ۸ مندرجہ بالا مصوتے۔

ہم ان دس مصوتوں کو مان کر آگے بڑھتے ہیں۔

مختلف اُردو الفاظ کے تلفظ پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اردو میں کم از کم چار اور مصوتے ہیں جن کی طرف علمائے لسانیات نے توجہ نہیں کی ـــــ وہ چار مصوتے خفیف اِے، خفیف اَے، خفیف اُو، خفیف اَو ہیں۔ مصوتوں کو طویل اور خفیف کہنا سائنٹیفک نہیں کیوں کہ جو مصوتے بہ ظاہر ایک دوسرے کی طویل اور خفیف آوازیں سمجھی جاتی ہیں دراصل ان کا مخرج قدرے مختلف ہوتا ہے یعنی طویل مصوتے کو ادا کرنے میں اسی نوع کے خفیف مصوتے کی نسبت زبان ذرا زیادہ اوپر کو اٹھتی ہے لیکن طویل اور خفیف کہہ کر بات سمجھانے میں جو سہولت ہے اس کے بغیر چارہ بھی نہیں۔ چنانچہ

لسانیات کا ہر عالم ان عام فہم اصطلاحات کو استعمال کرتا نظر آتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ فرق بالکل بے بنیاد بھی نہیں۔ طویل مصوتوں کو ہم کتنی بھی دیر تک کھینچ سکتے ہیں لیکن مختصر مصوتے کو ایک لمحے میں ختم کر دینا پڑتا ہے۔

مندرجہ بالا چاروں مصوتوں اس قدر عام فہم نہیں جتنے کہ دوسرے مصوتے ہیں ذیل میں ان کے وقوع کی صراحت کی جاتی ہے۔

(ا) خفیف اِے یا زیر مجہول۔

۱۔ ساکن ہ یا ح سے قبل مثلاً محنت۔ سہرا۔ احتیاط

۲۔ فاعل کے وزن کے ان عربی الفاظ میں جن میں مادّے کا دوسرا حرف ح یا ع ہے مثلاً سانحہ۔ سامعہ۔ واقعہ۔

۳۔ فارسی اضافت میں اگر وہ خفیف ہو۔ اس مقام پر طویل کی بجائے خفیف مصوتہ ہی زیادہ فصیح مانا گیا ہے ع

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو

۴۔ بعض متفرق الفاظ میں مثلاً محن۔ عوض۔ یہی۔ کہ۔ کا پہلا مصوتہ

(ب) خفیف اَے یا زبر مجہول۔ اسے زبر مجہول کہہ کر ہم سادہ زبر کو زبر معروف کہہ سکتے ہیں۔ ان دونوں آوازوں کا فرق اہل اور اصل ان دو الفاظ میں صاف سنائی دیتا ہے۔ زبر مجہول کا وقوع یہ ہے:

۱۔ ساکن ہ یا ح سے قبل مثلاً کہنا۔ محفل۔ شہر۔

۲۔ اگر لغت کے اعتبار سے وسطی ہ یا ح کے دونوں طرف زبر معروف ہوتا ہے تو وہ زبر مجہول میں بدل جاتا ہے مثلاً محل۔ ٹہک۔ بہکنا۔

(ج) خفیف اَو یا پیش لین کا وقوع۔

ہائے مفتوح یا حائے مفتوح یا ع مفتوح سے قبل مثلاً جہلا۔ کہن۔ محرّر۔ محترم معطل یا معلی

یہ مصوتہ ہندی الفاظ میں نہیں ملتا۔

(د) خفیف اُو یا پیش معروف کا وقوع

۱۔ ساکن ہ یا ح سے قبل مثلاً کہرام۔ محسن۔ نہر۔

۲۔ بعض متفرق الفاظ میں مثلاً بہت - پہنچنا - اوہوہو - وہی۔ ان سب میں یہ ہ سے قبل ہے یا بعد میں

۳۔ فارسی عطف میں اگر خفیف مصوتہ بولا جائے تو پیش معروف ادا ہوگا مثلاً

دردوغم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

ذیل کی آریائی زبانوں میں زیر مجہول اور پیش مجہول کا سراغ ملتا ہے:
قدیم ہندیوروپی[1]۔ اوستا[2]۔ پالی[3]۔ پراکرت[4]۔ اپ بھرنش[5]۔ قدیم برج[6]۔ اودھی[7]۔ کشمیری[8]۔ اردو ہندی اور جملہ دراوڑی زبانیں۔

زیر مجہول قدیم برج اور کشمیری میں ملتا ہے۔ پیش مجہول بنگلہ میں بھی عام ہے ڈاکٹر گراہم بیلی نے اپنے مضمون "اردو اور ہندی کا تلفظ" میں اردو کے خفیف مصوتوں اِے۔ اَے۔ اُو۔ کا ذکر کیا ہے لیکن ان کے وقوع کے بارے میں وہ الجھے ہوئے ہیں۔ حیات اللہ انصاری صاحب نے اپنے مضمون 'کشمیری زبان کے لیے ایک رسم الخط' میں اردو میں ان مصوتوں کے وجود کا پتہ دیا۔ ادھر اردو نامہ[10] میں جناب شان الحق حقی نے ان مصوتوں کو اپنے طور پر دریافت کیا۔ خفیف اُو کے وجود کا عرفان کسی کو نہ تھا۔ ذیل کے دو نقشوں میں ان مصوتوں کی صراحت کی جاتی ہے۔ علامات I.P.A. کے بجائے امریکی چارٹ سے لی گئی ہیں۔

---

[1] شیام سندرداس ص ۱۴۲
[2] ایضاً ۱۴۳
[3] ایضاً ۱۵۱
[4] ایضاً ۱۵۲
[5] ایضاً ۱۵۲
[6] دھریندر ورما ص ۱۰۴ تا ۱۰۷
[7] ایضاً
[8] کشمیری زبان کے لیے ایک رسم الخط از حیات اللہ انصاری مطبوعہ اردو ادب، دسمبر سنہ ۶۰ء ص ۵۵-۵۴
[9] اردو ادب دسمبر سنہ ۵۶ء میں ۹۶ و ۹۷ مترچودھری محمد نعیم
[10] اُردو زبان کی رومن املا اردو نامہ بابت اپریل تا جون سنہ ۶۱ء ص ۸۱
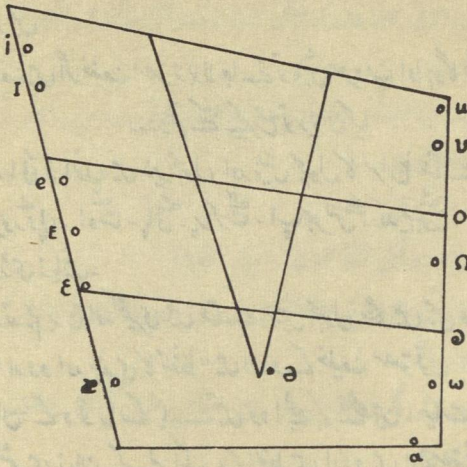
ذیل میں ان کے مخرج اور اردو نام درج کیے جاتے ہیں۔

	Front Rounded		Central Rounded		Back Unrounded	
High	i	یائے معروف			u	واؤ معروف
Lower High	I	زیر معروف			ʊ	پیش معروف
Higher mid	e	یائے مجہول			o	واؤ مجہول
Mean mid	E	زیر مجہول			Ω	پیش مجہول
Lower mid	ɛ	یائے لین			ɔ	واؤ لین
Higher low	æ	زبر مجہول	ə	زبر معروف	ɯ	پیش لین
Low					ɑ Unrounded	الف ممدودہ

لیکن ان غیر معروف شکلوں سے بہتر یہ ہے کہ خفیف اور طویل مصوتوں کو ذیل کے دو گروہوں میں درج کیا جائے۔ طویل مصوّتوں کو خفیف کے آگے دو نقطے لگا کر ظاہر کیا جائے۔

خفیف		طویل	
i	u	i:	u:
e	o	e:	o:
ɛ	ə	ɛ:	ə:
	a		ɑ

استاذی ڈاکٹر سبرامنیم پروفیسر تامل کیرل یونیورسٹی نے میرے تلفظ کا مشاہدہ کر کے انکشاف کیا کر آئے۔ گائے۔ فائدہ وغیرہ کا خفیف [ئے] سہرا اور سانحہ کا خفیف [اِے] سے مختلف مصوتہ ہے۔ میرا مشاہدہ بھی اس کی تائید کرتا ہے۔ جڑواں مصوتے Diphthong کے آخر میں آنے والے خفیف [ئے] کو ادا کرنے کے لیے سہرا کے [اے] کی نسبت زبان کسی قدر زیادہ اوپر کو اٹھتی ہے اور زیادہ آگے کو بڑھتی ہے۔ اس لیے ہم اسے صوتیاتی رسم الخط میں [ê] سے ظاہر کر سکتے ہیں

مذکورہ بالا مصوتے کی مماثلت پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ آؤ۔ کھوؤ کا خفیف [ô] بھی گہر۔ معلی کے [o] سے زیادہ بلند ہوگا۔ [e] اور [ê] کے طریق تلفظ کا اختلاف آئینے میں صاف دکھائی دیتا ہے لیکن [ə] چوں کہ زبان کے پچھلے حصے سے ادا ہوتا ہے اس لیے اسے دیکھنا ممکن نہیں۔ جیساکہ آگے دکھایا جائے گا ان دونوں مصوتوں کی صوتیاتی حیثیت نہیں۔ کیا [ê] کی مماثلت پر [î] اور [û] کا بھی وجود ہے؟ ممکن ہے ہو۔ دراصل جڑواں مصوتے کے آخر میں آنے والے چاروں خفیف مصوتوں پر لیبارٹری میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس وقت تک ان کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کچھ کہنا احتیاط کے خلاف ہے۔ مزید کام کرنے والوں کے لیے دعوت ہے کہ وہ ان رگ ہائے گل کی موشگافیاں کریں۔ فی الوقت ہم اُردو میں ۱۶ مصوتے تسلیم کر سکتے ہیں۔

اب دیکھنا چاہیے کہ ان مصوتوں میں صوتیے کا مرتبہ کتنے رکھتے ہیں۔ دس قدیم مصوتوں کی صوتیاتی حیثیت تو مسلّم ہے۔ اقلی جوڑوں کے ذیل کے تین سلسلے ملاحظہ ہوں:۔

۱۔	یائے معروف	کھیل	میل	۔
۲۔	زیر معروف	کِھل	مِل	۔
۳۔	یائے مجہول	کھیل	میل	دیر
۴۔	یائے لین	۔	مَیل	دَیر

۵۔	زبر معروف	کھَل	مَل	دَر
۶۔	الف ممدودہ	کھال	مال	دار
۷۔	واوٗ لین	کھَول	-	دَور
۸۔	واوٗ مجہول	کھُول	مُول	-
۹۔	پیش معروف	کھُل	مُل	دُر
۱۰۔	واوٗ معروف		مُوٗل	دوُر

ان مثالوں سے مندرجہ بالا دس مصوتوں کا تضاد ثابت ہو جاتا ہے۔ بقیہ ۶ مصوتوں کو ان کے مماثل مصوتوں سے مقابلہ کر کے پرکھنے کی ضرورت ہے۔ ذیل کے نقشوں میں ان مخففات کا استعمال کیا گیا ہے:

c مصمتہ یعنی Consonant v مصوتہ یعنی Vowel

v̄ طویل مصوتہ v̆ خفیف مصوتہ

f.v آزادانہ تغیر یعنی free Variation

[h] اور [ə] اپنی آوازوں ہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اب اوّل [ɛ] کے وقوع کا مقابلہ اپنی مماثل آوازوں [ə] اور [ɛ] سے کیا جاتا ہے۔

دوسرے موقعوں پر	‎-h-‎	‎-hc‎	‎-h #‎	
-	سحر، مہک	محفل	کہہ	ɛ
✓	f.v	-	-	ə
✓	-	-	-	ɛ:

اس طرح [ɛ] بقیہ دونوں مصوتوں میں سے کسی کا بھی ہم صورت ہو سکتا ہے چوں کہ یہ (ə) کے ساتھ ایک ماحول میں آزادانہ تغیر میں ہے اس لیے اسے (ə) کا ہم صورت قرار دیا جائے گا۔

دوسرا نقشہ پیش کرنے سے قبل چند امور کی صراحت ضروری ہے۔

۱۔ فارسی عطف و اضافت کا مصوتہ اگر خفیف ہو تو اس کے بعد وقفہ، اتصال Open Jun- (ctuure) نہیں ہوتا مثلاً ذیل کے مصرعوں میں:

ع خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ع پر جو معشوقی آب وگل میں ہے

ہم دردِ سر اور آب وگل کا تلفظ ایک لفظ کے طور پر کرنے کے لیے مجبور ہیں اس لیے اپنے جائزے میں ان الفاظ کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ذیل میں مثال کے طور پر دردِ سر، جامِ آب، شعلۂ شبنم، آب وگل کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ان سب کا زیر بحث مصوتہ خفیف ہے۔

۲۔ (e:) اور (ɛ:) کا تقابلی جوڑا دہ اور دیہہ ملتا ہے۔ اس لیے [e] کے ماحول میں [e:] کا وقوع تلاش کرنے کی مزید ضرورت نہیں۔

ان مشاہدات کے ساتھ ذیل کے مماثل مصوتوں کا وقوع ملاحظہ ہو۔ یہاں صرف (e) اور (ê) کے وقوع کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔

	# -h	-h #	C-hC	C-hV̄	C-V̄	# -va	C-hə	C-C	V-#	V-C	C-ə
e	احترام	دہ	سہرا	سانحہ	جامعہ جامِ آب	عوض	محن	دردِ سر	–	–	واقعتاً
ê	–	–	–	–	–	–	–	–	آئے	رائتہ	–
i	–	–	ترا	ربا	–	–	–	پسر	آئی	آئنہ	–
y	–	–	–	–	نیاریا کامیاب	–	–	–	–	–	ناریل

مندرجہ بالا نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ (ê) دو آوازوں (e) اور (y) کے ساتھ تکملی بٹوارے میں ہے۔ مماثلت کی بنا پر ہم اسے (e) کا ہم صوت قرار دیں گے۔ آخرالذکر (i) اور (y) دونوں سے تضاد کی حالت میں ہے اس لیے اسے صوتیہ کی حیثیت دی جائے گی۔

[ɔ, o, ə] کا وقوع اس طرح ہے۔ اس نقشے میں صرف انھیں تین مصوتوں کے وقوع کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

	C-həC	C-əC	*hC	C+hC	C-C	v̆-#	v̆-C	v̆-
ə	گھر- محرم	معلّی	—	—	-	—	—	—
o	—	—	عہدہ	کہرام	آب وگل	—	—	—
ô	—	—	—	-	—	ناؤ- کھیوڑ	باوُلا	شعلۂ و شبنم
o:	موہن	—	—	کوہسار	ٹھوکر	ô کے ساتھ F.V	—	ô کے ساتھ F.V
u	—	—	—	—	مُحَل	تاؤ	—	بالا مٹو
ʋ	—	—	—	-	—	ô کے ساتھ F.V	—	ماؤھو
ə:	شوہر	—	-	-	فی الفور	—	—	—

اس نقشے کے مطابق [ɔ] [o] اور [ô] آپس میں تکملی بٹوارے میں ہیں اس لیے ان تینوں کو ایک صوتیہ /o/ کا ہم صوت قرار دیا جائے گا۔ یہ صوتیہ /o:/ /u/ /ʋ/ /ə:/ چاروں سے تقابلی بٹوارے میں ہے اس لیے اس کی صوتیائی حیثیت میں کوئی شبہ نہیں۔ اس طرح ہم سولہ مصوتوں میں ذیل کے بارہ کو صوتیہ کی حیثیت دینے پر مجبور ہیں :-

/i:/i/e:/e/ɛ:/ə/a/ə:/o/o:/u/u:/

اتنے زیادہ مصوتوں کو صوتیہ قرار دینا قابلِ تشفی نہیں۔ کیوں نہ ہم کسی دوسرے طریقے سے تجزیہ کریں۔ میری تجویز ہے کہ اردو میں طول (Length) کو ایک صوتیہ قرار دیا جائے۔ یہ نہ مصوتہ ہے نہ مصمتہ بلکہ ایک وصف کے طور پر دونوں میں ضم ہو کر آسکتا ہے۔ اس طرح طویل مصوتوں کو صوتیہ کا مرتبہ دینے کی ضرورت نہ رہے گی۔ امریکی علماء نے انگریزی کے طویل مصوتوں کو جڑواں مصوتہ Diphthong قرار دے کر صوتیوں کے زمرے سے خارج کر دیا یا کوبسن (Jacobson) نے اپنی کتاب Preliminaries to speech analysis میں انگریزی مصوتوں کی جو فہرست دی ہے اس میں صرف خفیف مصوتے شامل ہیں۔ ڈاکٹر سبرامنیم نے ملیالم زبان کے صوتیوں کے چارٹ میں طویل مصوتوں کو شامل نہیں کیا۔ ڈاکٹر بابو رام سکسینہ[۲] کے مطابق قدیم سنسکرت فاضل صوتیات پانینی نے ई, उ کو

---

[۱] جب کہ دوسرا مصمتہ ھ نہ ہو

[۲] سامانیہ بھاشا وگیان (ہندی) طبع ششم ص ۱۰۱

ایک ہی صوتیہ قرار دیا تھا۔ ڈاکٹر سکسینہ بھی اس کے مؤید ہیں اور وہ ماترا (طول) کو ایک علیحدہ صوتیہ تسلیم کرتے ہیں۔

[a] کو روایتی طور پر ہم /ə/ کی طویل شکل کہہ سکتے ہیں۔ حالاں کہ ان دونوں آوازوں میں وہ گہری مماثلت نہیں جو بقیہ خفیف وطویل مصوتوں کے جوڑوں میں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس طرح دوسرے طویل اور خفیف مصوتوں کے مخرج بالکل پاس پاس ہیں اسی طرح ان دونوں مصوتوں کے مخرج ایک دوسرے سے نزدیک ترین واقع ہوئے ہیں۔ [a] کو /ə/ کی طویل شکل قرار دینے سے نظام میں باقاعدگی کا حق بھی ادا ہو جاتا ہے

مندرجہ بالا تجزیے کے مطابق اُردو میں ذیل کے ۷ مصوّتے صوتیے قرار پائیں گے:

/i /e/ɛ/ə/ɔ/o/u/

ان میں سے /e/ کے دو ہم صوت ہیں۔ [e] اور [ê]

/o/ کے بھی دو ہم صوت ہیں [o] [ô]

اُردو کے جڑواں مصوّتے

جڑواں مصوتے سے مراد (Diphthong) ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے 'زبان اور علم زبان' میں جڑواں مصوتے کی اصطلاح ہی استعمال کی ہے۔ چودھری محمد نعیم[1] نے اس کا ترجمہ مخلوط یا مخلوط مصوتہ' کیا ہے سرسوتی سرن[2] صاحب کیفؔ کے مطابق جامعہ الازہر میں اس کے لیے موصلی مصوتہ کی اصطلاح رائج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مخلوط مصوتہ سے مصوتوں کا وہ انضمام ظاہر نہیں ہوتا جو (Diphthong) کی خصوصیت ہے، مؤصلی مصوتہ میں اس کی طرف اشارہ ہے لیکن اسے سہل کر کے، وصلی مصوتہ کیوں نہ کر لیا جائے۔ (Diphthong) کا ایک اہم عنصر دو مصوتوں کا جوڑ ہے۔ انگریزی سابقہ 'di' ثنویت پر دال ہے کیوں کہ اس کے مقابلے میں تین مصوتوں کے وصل کو (Triphthong) کہتے ہیں اس لیے مناسب ہے کہ اردو اصطلاح میں دو کے عدد کی طرف بھی کچھ اشارہ ہے۔ جڑواں مصوتے میں جڑنے کا شعور بھی ہے اور دو کا بھی۔ اس لیے جب تک کوئی بہتر اصطلاح وضع نہ ہو ہم اسی کا استعمال کریں گے۔

جڑواں مصوتہ ایک (Vowel Glide) ہے یعنی اس کی ادائیگی میں اعضائے نطق ایک مصوتے کے مخرج سے رواں ہو کر تیزی کے ساتھ دوسرے مصوتے کے مقام تک پہنچتے ہیں یعنی یہ محض دو مصوتوں کے اجتماع کے مترادف نہیں۔ اس میں کئی شرائط ہیں۔

۱۔ دونوں مصوتے ایک کوشش اور سانس کے ایک جھٹکے میں ادا ہونے چاہئیں اس طرح کہ سُننے میں وہ گویا واحد آواز معلوم ہو۔

۲۔ یہ ہمیشہ ایک صوت رُکن Syllable ہوتا ہے۔

۳۔ اصولاً اس میں آواز کی گونج میں کوئی نشیب و فراز نہیں ہوتا لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے

---

[1] اُردو اور ہندی کا تلفظ از گراہم بیلی مترجمہ چودھری محمد نعیم۔ اردو ادب۔ دسمبر ۱۹۶۵ء ص ۹۷

[2] ہندوستانی صوتیات نیا دور۔ فروری ۱۹۶۱ء

پہلے اور آخری اجزا میں سے ایک نسبتاً زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اگر ابتدا نمایاں ہوتی ہے تو اسے گراؤ (واؤ معروف کے ساتھ) جڑواں مصوتہ کہتے ہیں۔ اگر آخری جزو نمایاں ہوتا ہے تو اُسے اُٹھاؤ جڑواں مصوتہ کہتے ہیں۔ دوسری زبانوں کی طرح اُردو کے بھی تقریباً تمام جڑواں مصوتے گراؤ ہوتے ہیں۔

جڑواں مصوتے کے تعین میں لغزشوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔

یہ ایک رکن ہوتا ہے۔ صوتیات میں رکن کی حد بندی اور شناخت سب سے پیچیدہ امر ہے جڑواں مصوتے کے لیے ایک رکنی ہونا سب سے مقدم شرط ہے۔ اگر تلفظ میں دو ارکان ہو گئے تو وہ مصوتی خوشہ ہو جائے گا جڑواں مصوتہ نہیں۔ جڑواں مصوتہ کے دونوں اجزا کو اپنی انفرادیت ختم کر دینی ہوتی ہے۔

دو مختلف المخرج مصوتوں کے تواتر کو ہم سہل بنانے کے لیے نیم مصوتہ (و) اور (ی) کا سہارا لیتے ہیں۔ اس موقع پر ان مصوتوں کو Glide کہتے ہیں۔ اردو میں انھیں لغزیہ کہا جا سکتا ہے۔ جب دو مصوتوں کے بیچ لغزیے کا عمل ہوتا ہے تو انھیں جڑواں مصوتہ کہنا درست نہیں کیوں کہ جڑواں مصوتہ خالص مصوتوں کے امتزاج کا نام ہے۔ نیم مصوتہ کا نہیں مثلاً پیا، پیے، ہوا، ہوئے، سویا، کھویا۔

ان میں نہ صرف آخری مصوتے سے پہلے لغزیہ آتا ہے بلکہ یہ سب الفاظ دو رکنی بھی ہیں۔ اگر ان میں نیم مصوتہ نہ بھی ہوتا تب بھی یہ محض مصوتی خوشے رہتے کیوں کہ یہ تنفس کی ایک جھونک میں ادا نہیں ہوتے۔ مثلاً اعادہ اور معانی کے دو مصوتوں ia اور ua میں لغزیہ نہیں لیکن یہ مصوتی خوشے ہیں جڑواں مصوتے نہیں۔

ہندی کتاب راج رشی ابھی نندن گرنتھ میں ڈاکٹر کیلاش چند بھاٹیا کا عالمانہ مقالہ ہندی اکشر (رکن) شایع ہوا ہے۔ موصوف نے ہندی (صوت) رکن کے رازہائے سربستہ کو ٹٹولا ہے۔ انھوں نے ایک سے لے کر پانچ ارکان تک کے متعدد الفاظ درج کیے ہیں اور ان میں صوت رکن کی حد بندی کی ہے۔ ہمارے لیے دو رکنی الفاظ (ص ۵۶۰ تا ۵۶۶) سب سے زیادہ اہم ہیں کیوں کہ ان میں جہاں کہیں رکن کا فصل دو مصوتوں کے بیچ میں ہوتا ہے وہ دونوں مصوتے جڑواں مصوتوں کی تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ذیل کے مخففات کے ساتھ زیادہ اہم شکلیں درج کی جاتی ہیں۔

v = خفیف تر مصوتہ $\bar{v}$ = طویل تر مصوتہ c = مصمتہ

مصوتہ کے آگے ~ کا نشان مصوتہ کا غنائی ہونا ظاہر کرتا ہے۔ چھوٹی لکیر۔ (رکن کی تقسیم کی علامت ہے۔

آؤ (طویل اُو کے ساتھ) v̄-v̄

مائی۔ کوئی۔ سوؤ (آخری مصوتہ طویل ہے) Cv̄-v̄

سائیں۔ لاؤں (آخری مصوتہ طویل ہے) Cv̄-v̄~

[1] मई हुआ रुई लिए हुए Cv-v̄

हुआँ Cv-v~

میاں Cv-Cv̄~

कुआँ Cv~-vC

ان مثالوں کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذیل کے مصوتی خوشے جڑواں مصوتے نہیں بن پاتے۔

ao:, ai, o:i:, ea:, au:, əv:, ua,

ui:, ie:, ue:, uo:, ia, uə,

ان میں آئی۔ اُئی۔ اُئے پر خاص طور سے توجہ کی ضرورت ہے یعنی کئی اور گئے کا آخری مصوتہ طویل ہو تو یہ بھی جڑواں مصوتے نہیں رہتے۔ مزید تجزیہ کرنے پر کچھ اور اصول دکھائی دیتے ہیں:

ا۔ دو طویل مصوتے ملا کر کبھی جڑواں مصوتے نہیں ہو سکتے کیوں کہ وہ الگ الگ رُکن بن جاتے ہیں جب کہ جڑواں مصوتہ کا ایک جزو دوسرے کے مقابل میں دھیما رہتا ہے جس کی وجہ سے اسے Consonantal Vowel کہتے ہیں۔ مثلاً (ai) کا آخری جزو لیکن اگر دوسرا جزو بھی طویل ہو جائے (ai:) تو پھر یہ جڑواں مصوتہ نہیں رہے گا۔

۲۔ جڑواں مصوتے میں دوسرا جزو کبھی طویل نہیں ہو سکتا یعنی v̄-v کی شکل بھی محض مصوتی خوشہ ہے۔ بظاہر یہ چونکا دینے والا انکشاف ہے لیکن یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ مشہور

---

[1] ان الفاظ کا مطلوبہ تلفظ اردو خط میں ظاہر کرنا مشکل ہے اس لیے ہندی کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ مناسب یہ تھا کہ بین الاقوامی صوتی تحریر میں لکھا جاتا لیکن صوتی رسم الخط اہل مطبع اور عام قارئین کے لیے ایک چیستاں بن جاتا ہے۔

ماہر صوتیات ڈینیل جونس[1] نے انگریزی بولیوں کے جو اہم و غیر اہم ۲۱ جڑواں مصوتے درج کیے ہیں ان میں کسی کا آخری مصوتہ طویل نہیں۔ جونس[2] نے ایک اور معرکے کی بات لکھ دی ہے کہ جڑواں مصوتہ کی ادائیگی میں پہلے مصوتہ کو ادا کرنے کے بعد اعضائے نطق دوسرے مصوتے کے آخری مقام تک نہیں پہنچتے۔ اس کے لگ بھگ پہنچنا کافی ہے کیوں کہ آخری نقطہ تک پہنچنے سے جڑواں مصوتے کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اب یہ جانی پہچانی بات ہے کہ (آ) کے علاوہ دوسرے طویل مصوتوں کی ادائیگی میں زبان کو جس قدر اونچا اٹھانا پڑتا ہے اگر اس سے تھوڑا کم اُٹھایا جائے تو اس سے مماثل خفیف مصوتہ ادا ہو جائے گا۔ یعنی جونس کے مفروضے کے مطابق جڑواں مصوتے کے آخر میں ہمیشہ خفیف مصوتہ ادا کیا جاتا ہے خواہ رسم الخط کی بوالعجبیوں کے باعث ہم طویل مصوتہ ہی لکھتے ہوں۔ اگر ہم نے زبان کو تھوڑا اور اوپر اٹھا کر طویل مصوتہ ادا کر دیا تو یہ جڑواں مصوتہ نہیں رہے گا۔ گویا جڑواں مصوتہ کا ادا کرنا کارگہِ شیشہ گراں سے گزرنا ہے مثلاً ذیل کے مصرعوں میں خط کشیدہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

	مصوتی خوشے	جڑواں مصوتے	
əi:	ایک جاتا ہے تو ہوتے ہیں گرفتار کئی	کئی دن سے بخار آتا ہے	ai
əe:	قربان حبابِ لبِ دریا کہ پئے مرگ	ہم بھی ہوں در پئے انکار تو کچھ دور نہیں	əe
ai:	نہ آئی پر نہ آئی	ہونٹوں پہ ترے دیکھوں ہنسی آئی ہوئی سی	ai
ae:	ہر چشم کو پریوں کا اکھاڑا نظر آئے	ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے	ae
ao:	آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی	آؤ کچھ دیر سیرِ باغ کریں	ao
aū:	خاک میں جاؤں سب کو ملا کر	پاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر	aū
o:i:	بیمار کو تجھ غم کے دینی تھی دوا کوئی	کوئی مرتا ہے کیوں خدا جانے	o:i
o:e:	جا سوئے سیلانی بن میں	کچھ آج کل نظر آتے ہیں کھوئے کھوئے ہوئے	o:i
ui:	سادہ روئی نے تو کھویا دل و دیں سے دیکھیں	دنیا میں کسی فرد کو یکسوئی نہیں ہے	u:i

۲۔ جڑواں مصوتہ کا دوسرا مصوتہ ہمیشہ ساکن ہوتا ہے۔ اس سے دو نتیجے برآمد ہوتے ہیں:

(الف) دو خفیف مصوتوں کا یکجا ہونا بھی لازماً جڑواں مصوتہ کے پہچان نہیں۔ چند خفیف مصوتے

۱؎ An outline of English Phonetics. طبع ہشتم۔ ص ۹۸ ص ۵۸

۲؎ ایضاً ص ۵۸

جڑواں مصوتوں کے طور پر آتے ہیں بقیہ میں ہر جزو اپنی انفرادیت بحال رکھتا ہے اور یہ دونوں اجزا ایک کوشش یا ایک جھٹکے میں ادا نہیں ہوتے مثلاً ذیل کے مصوتی خوشے ملاحظ ہوں جن میں دونوں مصوتے خفیف ہیں لیکن جنھیں ادا کرنے میں صاف دو جھٹکے سنائی دیتے ہیں۔

əə مع الخیر۔ معاً۔ تعلق əɔ معلی۔ معلق əu ہوالشانی

جڑواں مصوتے کو Vowel Glide بالکل صحیح کہا گیا ہے۔ اس کی ادائیگی میں ایک مصوتے سے دوسرے مصوتے تک سبک روی اور سہولت کا احساس رہنا چاہیے۔ معاً میں وہ سبک روی کہاں۔

(ب) ہمارے مسلمہ جڑواں مصوتوں کا دوسرا مصوتہ بھی اگر کسی لفظ میں متحرک ہو کر آتا ہے تو وہ جڑواں مصوتے کی خاصیت کھو کر محض مصوتی خوشہ رہ جاتے ہیں مثلاً əi اور ai معروف جڑواں مصوتے ہیں لیکن اٹھۃ اور مائل میں یہ جڑواں مصوتے باقی نہیں رہتے کیوں کہ یہاں (i) آگے آنے والے مصمتہ سے وابستہ ہو گیا ہے جس کی وجہ سے ایُ اور آئ کے دونوں مصوتے دو جھٹکوں میں ادا ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں انگریزی لفظ fine fila کا تلفظ ملاحظ ہو یہاں ai جڑواں مصوتہ ہے جب کہ اردو لفظ فاعل۔ مائل۔ خائن میں یہ کیفیت نہیں۔

جڑواں مصوتوں کی انھیں نزاکتوں اور پیچیدگیوں کی وجہ سے ڈاکٹر دھریندر ورما[1] یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ" دو سچے جڑواں مصوتوں اور محض پاس میں آنے والے دو یا دو سے زیادہ مصوتوں میں خواہ اصولی نقطۂ نظر سے امتیاز کیا جا سکے لیکن عملاً دونوں میں بھید کرنا کٹھن ہے۔۔۔۔ اسی لیے یہاں جڑواں مصوتے اور مصوتی خوشے میں فرق نہیں کیا گیا ہے۔۔۔ گر دو خفیف مصوتوں کے اجتماع کو سچا جڑواں مصوتہ مانا جائے تو ادبی ہندی میں اَے اور اَو ہی جڑواں مصوتے مانے جائیں گے۔"

ہم مندرجہ بالا الجھنوں کا حل تلاش کر چکے ہیں۔ جڑواں مصوتے میں طویل مصوتے کی بھی سمائی ہے اور اَے اور اَو جڑواں مصوتے نہیں۔ اہلِ زبان انھیں مفرد ہی بولتے ہیں۔ ڈاکٹر دھریندر ورما کی طرح ڈاکٹر اودے نرائن تواری[2] کو بھی اسی مشکل کا احساس ہے۔ دونوں حضرات نے جو نمونے پیش کیے ہیں ان میں جڑواں مصوتوں اور مصوتی خوشوں میں امتیاز نہیں کیا۔ ان نمونوں میں

---

[1] ہندی بھاشا کا اتہاس طبع چہارم ص ۱۱۰

[2] ہندی بھاشا کا اُدگم اور وکاس طبع اول ص ۲۲۲

بعض ایسے خوشے بھی ہیں جن کا تلفظ خلافِ معمول درج کیا گیا ہے۔ دراصل ان میں لغزیہ (ی) یا (و) شامل کر کے بولا جاتا ہے مثلاً

oa	ओआ	مثال: سوآ کھوآ	یہاں اویا۔ سویا۔ کھویا چاہیے
ia	इआ लिया दुनिया		ایا۔ لیا۔ دنیا چاہیے
io	इओ बियोग		ایو۔ وِیوگ چاہیے
ie	इए दिए लिए		اے۔ دیے۔ لیے۔ چاہیے
va	उआ बुआ जुआ		اُوا۔ بُوا۔ جُوا۔ چاہیے
ea	सेआ खेआ ऐआ		اےیا۔ کھےیا۔ سےیا چاہیے

لغزیے کی آواز کانوں کو صاف معلوم ہو جاتی ہے۔ اس میں کسی دبدھا کی گنجائش نہیں۔ مثلاً یہ تین تلفظ ایک دوسرے سے ممیّز ہیں

۱۔ کیا	क्या	kya	استفہامیہ
۲۔ کِ آ	किआ	kia	ڈاکٹر دھریندر کے مطابق املا
۳۔ کِیا	किया	kiya	کرنا کا ماضی

ان تینوں میں کوئی بھی جڑواں مصوتہ نہیں۔ مصوتے اور لغزیے کے اجتماع کی ایک صورت اور اس کے دو مماثلات ملاحظہ ہوں

۱۔	e : v	دیو۔ نیولا۔ ریوڑی
۲۔	e : o	کشتی کھیو۔ انڈے سیو
۳۔	e : o:	کھےؤ۔ سےؤ

کھیو اور سیو کے تلفظ کی دو سہل صورتیں ممکن ہیں۔ ۱۔ آخر میں نیم مصوتہ (و) بولا جائے ۲۔ آخر میں طویل اُو (ؤ) ملفوظ کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان دونوں تلفظوں سے ہٹ کر یہ بھی ممکن ہے کہ اے کے بعد خفیف اُو بول سکیں۔ میرے لیے اس تلفظ میں کوئی دشواری نہیں۔ یہ جڑواں مصوتہ ہے جب کہ اوپر کی مثال میں پہلا مصوتہ اور نیم مصوتہ کا خوشہ ہے اور تیسرا ایسا مصوتی خوشہ ہے۔ جو دو ارکان پر مشتمل ہے۔

ے ہندی بھاشا کا اُدگم اور وکاس طبع اول ص ۳۲۲

لیکن (o:v) و (o:o:) و (o:o) کی کیفیت مختلف ہے۔ ان میں پہلی اور دوسری شکلیں تلفظ کے اعتبار سے سہل ہیں لیکن یہ جڑواں مصوتے نہیں۔ تیسری شکل جڑواں مصوتہ ہے لیکن اس کا ادا کرنا دشوار اور غیر واضح ہے۔ اس کی آخری آواز کو جوں ہی واضح کیا جائے گا وہ (و) یا او جیسی ہو جائے گی۔ عام بولنے والا کوئی صوتیات کا آموختہ تو دُہراتا نہیں۔ وہ پہلی یا دوسری شکل سے کام لے گا اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں o:o جیسا جڑواں مصوتہ نہیں بولا جاتا۔ جہاں تک مجھے علم ہے ہندی میں جڑواں مصوتوں کی کوئی فہرست نہیں ملتی۔ ڈاکٹر گراہم بیلی نے ۲۲ - ۱۹۲۱ء کے درمیان اُردو اور ہندی تلفظ سے متعلق ایک مضمون لکھا تھا۔ اس[1] میں انھوں نے اُردو میں پانچ جڑواں مصوتے قرار دیے۔

اَے اَو اَی (جیسے لفظ گئی میں)
اُ (انگریزی لفظ Pull کے مصوتے سے ملتا جلتا)
اُو (یہ اطالوی [u] یا فرانسیسی [ou] کی طرح ہوتا ہے

حقیقت یہ ہے کہ ان میں نمبر تین کے سوا کوئی جڑواں مصوتہ نہیں۔ باقی چاروں واحد مصوتے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے Hindustani Phonetics میں اُردو کے جڑواں مصوتوں کی فہرست دی ہے۔ ان[2] کے مطابق اُردو میں ذیل کے چھ جڑواں مصوتے ہیں۔

۱۔ اَو	مثال	خوف		
۲۔ آؤ	مثال	ناؤ		
۳۔ آئے	مثال	لائے		
۴۔ اَئی	مثال	فیاض		
۵۔ اِؤ	مثال	شِئو	Siu	اُردو علامت ئ
۶۔ Eo	مثال	نیولا	Neola	اُردو علامت ئے

میری رائے میں پہلا واحد مصوتہ ہے پانچواں جڑواں مصوتہ ہے لیکن اُردو کے کسی لفظ میں اس کے وجود کا پتہ نہیں چلتا مثال کے طور پر جو لفظ شِئو دیا ہے اس کا صحیح تلفظ نیم مصوتہ "و" کے ساتھ ہے

---

[1] اردو اور ہندی کا تلفظ۔ اردو ادب دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۹۷ [3] ص ۴۹
[2] ایضاً ص ۴۹

اس لیے وہ جڑواں مصوتہ نہیں مانا جاسکتا۔ نمبر ۶ eo دو ارکان پر مشتمل ہے جس کی وجہ سے وہ جڑواں مصوتے کی حدود میں نہیں رہتا۔ مثال کے لفظ نیولا کا تلفظ بھی خلاف واقعہ ہے۔ اہلِ زبان اسے نیم مصوتہ "و" کے ساتھ بولتے ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر زور کی فہرست میں محض دوسرا، تیسرا اور چوتھا جڑواں مصوتے ہیں وہ بھی اس شکل میں جب کہ ان کا دوسرا مصوتہ خفیف بولا جائے۔

چودھری محمد نعیم[1] لکھتے ہیں کہ اپنے کام کے سلسلے میں انھوں نے اُردو میں بیس جڑواں مصوتے تلاش کیے ہیں۔ صفحہ ۱۰۰ پر رقم طراز ہیں:

Diphthong یہ دو مصوتوں سے مل کر بنتا ہے۔ مثلاً پائے۔ لائی۔ پیو۔ بوئے۔

ظاہر ہے کہ جڑواں مصوتوں کے لیے محض دو مصوتوں کا اتصال کافی نہیں۔ پیو جڑواں مصوتہ نہیں کیوں کہ اس میں لغزیہ (ی) شامل ہے۔ اس کے علاوہ یہ دو رُکنی لفظ ہے۔

اُردو کے جڑواں مصوتوں میں بعض بہت کم الفاظ میں اور بعض زیادہ میں۔ ذیل میں اول اہم اور پھر غیر اہم جڑواں مصوتوں کا شمار کیا جاتا ہے۔

نمبر شمار	صوتیاتی تحریر	اردو تحریر	مثال
۱۔	əi	اَئی	ئیہ، بڑھئی، فیاض۔ لفظ کے درمیان میں اس کے بعد ہمیشہ لغزیہ "ی" آتا ہے۔
۲۔	əe	اَئے	گئے؛ ع کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
۳۔	əu	اَوُ	گؤ۔ کوا۔ اول۔ لفظ کے درمیان میں اس کے بعد ہمیشہ لغزیہ "و" آتا ہے۔
۴۔	ai	آئی	نائی پڑھائی۔ آئیے۔
۸	ae	آئے	فائدہ۔ رائے۔ پائگاہ
۶۔	ao	آوَ	ناوَ۔ گھاوَ۔
۷۔	au	آوُ	تاؤ۔ جڑاؤ۔ کماؤ۔ یہ جڑواں مصوتہ غنائی شکل میں اُردو کے متعدد افعال میں آتا ہے۔
۸۔	o:i	اُوئی	کوئی۔ روئیے۔

---

[1] اردو ادب دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۹۷

۹۔	o:e	اوُے	روئے۔ سوئے
۱۰۔	o:u	اُوُ	کھوؤ۔ یہ جڑواں مصوتہ غنائی شکل میں متعدد افعال میں ملتا ہے۔ سادہ حیثیت سے اس کا استعمال شاذ ہے
۱۱۔	ui	اُئی	چھوئی موئی۔ تحریر میں اس جڑواں مصوتہ کا پہلا مصوتہ طویل لکھا جاتا ہے لیکن بولنے میں اکثر خفیف ہی بولا جاتا ہے۔

اُردو کے غیر اہم یعنی کم واقع ہونے والے جڑواں مصوتے یہ ہیں:

۱۲۔	e:i	اِے ئی	کھیئی
۱۳۔	e:o	اِے وُ	کھیو۔ سیو
۱۴۔	e:u	اِے وُ	جنیو
۱۵۔	ɛ:e	اَے ئے	روپیئے
۱۶۔	u:i	اوُئی	یکسوئی۔ روئی

مندرجہ بالا مثالوں پر بعض حضرات کو شبہ ہو سکتا ہے کہ ان کا آخری مصوتہ خفیف نہیں طویل بولا جاتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ الفاظ دونوں طرح ادا کیے جا سکتے ہیں۔ اگر آخری مصوتہ طویل ہے تو جڑوان مصوتہ باقی نہیں رہتا۔ جڑواں مصوّتے کا تلفظ مصوتی خوشے سے کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اہلِ زبان تیزی سے بولتے ہیں اس لیے اکثر مندرجہ بالا جوڑوں کا آخری مصوتہ خفیف ہی بولا جاتا ہے۔ شعر میں یہ پہلو بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ اَئی۔ اَے۔ اور اُئی کے علاوہ باقی جوڑوں کا آخری مصوتہ طویل کر کے باندھا جائے تو کچھ غیر فطری سا معلوم ہوتا ہے۔

غیر اہم جڑواں مصوتوں میں سے پہلے چار کا وقوع اتنا شاذ ہے کہ اوپر جو مثالیں درج کی گئی ہیں فی الوقت ان کے علاوہ اور کوئی لفظ میرے ذہن میں نہیں آتا۔ ui اور u:i میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ وہی الفاظ بعض اوقات ایک طرح اور بعض اوقات دوسری طرح بول دیے جاتے ہیں۔ گویا یہ دونوں جڑواں مصوتے ایک طرح سے آزادانہ تغیر ہیں ہیں۔ بولنے میں سہولت کی خاطر ui کو ترجیح دی جاتی ہے۔ مصوتوں کے برعکس جڑواں مصوتوں کی تعداد میں کوئی قطعیت نہیں۔ اُردو کے بعض علاقوں اور بعض حضرات کے تلفظ میں کچھ اور بھی جڑواں مصوتے ہو سکتے ہیں لیکن کھڑی بولی

کے علاقے میں مندرجہ بالا جڑواں مصوتے ہی سُننے میں آتے ہیں۔ یہ ظاہر کردینا بھی مناسب ہوگا کہ اُردو میں ہندی کی نسبت جڑواں مصوتوں کا رواج کم ہے۔ مثلاً ذیل کے الفاظ اُردو کو زیادہ عزیز نہیں۔

کھیئی۔ کاؤ۔ اپجاؤ۔ کھوؤ۔ بردِکھوا۔ ٹکٹوا۔

جڑواں مصوتوں میں سے بیشتر غنائی شکل میں بھی ملتے ہیں۔ غنائیت جڑواں مصوتے کی ابتدا کے بعد بقیہ تمام جزو پر طاری رہتی ہے۔ ذیل کے جڑواں مصوتے غنائی حالت میں ملتے ہیں۔

۱۔ e:ĩ کھیئیں

۲۔ ə̃ حالی ع گئیں اور آئیں چاندنی راتیں (بروزن فعلن فعلن فعل فعولن)

۳۔ aĩ ع آئیں بہت دنیا میں بہاریں

۴۔ aẽ ع کچھ گائیں کلیلیں کر رہی تھیں

ع جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

۵۔ aõ ع کیا لیجیے چھوڑے گاؤں کا نام

ع پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

۶۔ ɔũ ع پاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر

۷۔ o:ĩ روئیں

۸۔ o:ẽ ع تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے

۹۔ o:ũ ع حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

۱۰۔ uĩ ہوئیں

۱۱۔ u:ĩ چھوئیں

ان میں سے نمبر ۱۔ ۲۔ اور ۱۱ بہت کم لفظوں میں ملتے ہیں۔

جس طرح دو مصوتوں کے وصل سے جڑواں مصوتہ بن جاتا ہے اسی طرح ایک مصوتہ اور نیم مصوتہ (وٗ) کا وصل بھی جڑواں مصوتے سے بالکل مماثل ہوجاتا ہے۔ اصطلاحاً انھیں جڑواں مصوتہ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ Diphthong کے دونوں اجزا مصوتہ ہوتے ہیں لیکن ذیل کی صورتوں میں نیم مصوتہ بھی وہی کام سرانجام دے رہا ہے۔

۱۔ i:ʋ نیو ۲۔ iʋ شِو

۴۔ e:ə ویو۔ ریوڑی ۴۔ əə ویشنوؔ۔ مادھوؔ

۵۔ əa باولا۔ آنولہ۔ سانولہ ۶۔ o:ə سوؤ۔ اسٹوو

ذیل میں کچھ مصوتی خوشے مع مثالوں کے درج کیے جاتے ہیں تاکہ جڑواں مصوتہ اور مصوتی خوشے کا فرق اور واضح ہو سکے۔

i:a	شیعہ	əu:	شعور۔ رؤف۔ رعونت
ia	اجارہ	ai:	آئینہ۔ آئی
e:i:	کیئی	ae:	آئے
e:a	میعاد	ao:	آؤ
e:o:	کیوڑ	au:	ماؤف۔ کاؤس
e:u:	جنیو	ɔə	معلی۔ معلق
eə	واقعتاً	o:i:	کوئی
ea	جامعہ۔ واقعہ	o:e·	روئے
ɛ:a	ریعان	o:o	سوؤ
ə:i	واقعی۔سعید۔گئی	o:ũ:	روؤں
əə	معاً۔ تعلق	ui:	مُعین۔ ہوئی
ɘa	سعادت۔ معاذاللہ	u:e:	بوئے گل۔ پانی چوئے گا۔
uə	ہوالشانی	ua	معاشرت۔ معاہدہ
u:e	بوئے گل	u:õ:	شمع روؤں۔ ہندوؤں

جڑواں مصوتے سے بھی آگے Triphthong ہوتی ہے جس میں تین مصوتے اس طرح ادا کیے جاتے ہیں کہ وہ ایک جھٹکے میں ادا کیے جاتے ہیں اور مل کر ایک رُکن ہوتے ہیں۔ ان میں جڑواں مصوتے کے برعکس یہ آزادی ہے کہ یہاں ابتدا اور انتہا میں نشیب لیکن وسط میں ایک فراز ہوتا ہے جب کہ جڑواں مصوتے میں کم از کم اصولی حیثیت سے نشیب و فراز نہیں ہونا چاہیے۔ اُردو میں کوئی سچا Triphthong دکھائی نہیں دیتا۔ ذیل میں چند ایسی مثالیں درج کی جاتی ہیں جہاں کسی جڑواں مصوتے کے اردگرد کچھ مصوتے اور نیم مصوتے جمع ہو گئے ہیں۔

əiya تیار

ایوب ۔ قیوم	əiyu:
اوّل	əuwu:
کوّا ۔ قوّال	əuwo
آیئے	aiye:
رعنائیاں،	aiyã
بھائیو	aiyo:
روئیے	o:iye:
چہ میگوئیاں	o:iyã
چہ میگوئیوں	o:iyõ:
سوئیاں	u.iyã
خوشبوئیوں ۔ حیلہ جوئیوں ۔ سوئیوں	u:iyõ:
معیّن	oəiyə
گوئیے ۔ روئیے	əvəiye
رویا ۔ گویا	avəiya
گویّوں	əvəiyõ:

اُردو کی غُنّائی اصوات

غُنّائی اصوات ان آوازوں کو کہتے ہیں جن کے ادا کرنے میں آواز پیدا کرنے والی ہوا ناک سے خارج ہو۔ سانس کے ناک یا مُنھ سے خارج ہونے یا نہ ہونے سے ذیل کی صورتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں:

۱۔ غیر غنائی آوازیں۔ حلق سے ناک میں جانے والا راستہ بند ہو جاتا ہے اور سانس محض منہ سے نکلتا ہے۔

۲۔ غنائی مصمتے۔ سانس محض ناک سے خارج ہوتا ہے۔ منہ کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

۳۔ مصوتوں کی غنائیت۔ سانس بیک وقت ناک اور منہ دونوں سے باہر نکلتا ہے۔

غنائی مصمتے: ہندی میں پانچ غنائی مصمتے ہیں म न ण ञ ङ ان سب کی وصلی صورت کو ایک انوسار (ं) سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً سمواد بند۔ گھنٹا۔ چنچل۔ گنگا میں۔ اُردو میں عام طور سے صرف م اور ن دو غنائی مصمتے کہے جاتے ہیں۔ دیکھیں اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔

ङ کے لیے کہا گیا ہے کہ یہ ج۔ جھ۔ چ۔ چھ کے پہلے آنے والا نوسوار ہے لیکن اب ہندی میں یہ عام[1] طور سے مان لیا گیا ہے کہ یہ محض ایک فرضی مصمتہ ہے جس کی آواز وصلی ن سے مختلف نہیں۔ مثلاً رنج اور سنت کی غنائی آواز میں کوئی فرق کرنا بے بنیاد ہے۔

ण اُردو میں ہم اسے (ڻ) سے ادا کر سکتے ہیں۔ ادبی ہندی بانگرو یا پنجابی کے برعکس اُردو میں ڻ کی آواز نہیں ہوتی۔ کھڑی بولی بولنے والے ڻ کو ہمیشہ ن سے بدل لیتے ہیں۔ اُردو بھی اسی اصول کی پیروی کرتی ہے۔ ڈاکٹر دھریندر ورما[2] تسلیم کرتے ہیں۔

" ڻ ہندی کی بولیوں میں قطعاً استعمال نہیں ہوتا۔ یہ ہمیشہ ن سے بدل لیا جاتا ہے۔ مثلاً چرن

---

[1] دھریندر ورما۔ ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۱۱۹ [2] ص ۱۲۰

گنیش۔ گن۔"

ݨ سے کیا مُراد ہے۔ اسے صوتی رسم الخط میں کیوں کر ادا کیا جائے۔ عام طور سے اسے معکوسی غنائی مصمتہ (ɳ) سے ادا کیا جاتا ہے لیکن غور کرنے پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ गण کا آخری مصمتہ گڑ کے آخری مصمتے کی طرح ملفوفی (Flapped) آواز ہے۔ مشہور ماہر صوتیات ڈاکٹر اشوک کیلکر راقم الحروف کے نام ایک ذاتی مکتوب میں لکھتے ہیں کہ ڈنڈا کے ण کو غنائی معکوسی مصمتہ مان کر (ɳ) سے ادا کیا جائے اور गण کے ण کو ملفوفی مصمتہ مان کر (ɽ̃) لکھا جائے یعنی ڑ پر غنایت کی علامت لگا دی جائے۔ ساگر یونیورسٹی کے رمیش چندر مہروترا[1] بھی اپنے ایک مضمون میں ان دونوں آوازوں کو بالترتیب بندشیہ اور معکوسی ملفوف مصمتہ مانتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مضمون کے اگلے ہی صفحے پر رقم طراز ہیں۔

"مصمتہ کے ساتھ غنائیت کی علامت کا استعمال غلطی ہے مثلاً ण کو ड़ँ لکھنا صحیح نہیں۔"

سوال کیا جا سکتا ہے کہ گڑ کے ڑ اور गण کے ݨ میں سوا اس کے کیا فرق ہے کہ آخرالذکر کے معکوسی ملفوف مصمتہ میں غنائیت بھی شامل ہو گئی ہے۔ ڈینیل جونز[2] کے مطابق غنائیت بندشیہ اور غنائی مصمتوں کے سوا کسی بھی آواز میں واقع ہو سکتی ہے۔ گلیسن نے بھی غنائیت کو مصوتوں تک محدود نہیں کیا۔ اس کے نزدیک منہ سے ادا ہونے والے Resonant[3] مصمتے بآسانی غنائے جا سکتے ہیں اور (ر) بعض زبانوں میں اسی قسم کا مصمتہ ہے۔ اگر (ر) کو غنایا جا سکتا ہے تو (ڑ) کو کیوں نہیں۔

ڈاکٹر رمیش چندر مہروترا اپنے ہندی مضمون میں لکھتے ہیں:

"ہندی بولنے والے گھنٹا۔ انڈا۔ میں (ݨ) بولتے ہیں۔ (ن) نہیں۔"

اسی لیے موصوف گھنٹا اور गण کے غنائی مصمتوں کو ایک ہی آواز کی دو قسمیں سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر گراہم بیلی[4] ان سے بھی دو قدم آگے بڑھ کر لکھتے ہیں۔

---

[1] ہندی اور سنسکرت میں انوسوار۔ مشمولہ مدھیہ بھارتی۔ حصہ دوم ۵۹ء ہندی مجلہ ساگر یونیورسٹی ص ۸۰-۷۹

[2] An Outline of English Phonetics 1956 edition P. 212.

[3] An Introduction to Descriptive Linguistics 1961 edition P 250

[4] اردو اور ہندی کا تلفظ مترجم چودھری محمد نعیم مشمولہ اردو ادب دسمبر ۱۹۵۶ء ص ۹۰

"کوزی (ل) اور (ن) اُردو میں عام ہیں مگر یہ آوازیں صرف (ٹ۔ ڈ) سے پہلے ہی ملتی ہیں اس لیے لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ معمولی (ل) اور (ن) ادا کر رہے ہیں۔ اگر (ٹ۔ڈ) صحیح ادا کیے جائیں گے تو کوزی (ل) اور (ن) خود بخود ادا ہوجائیں گے۔"

کوزی (ن) سے مراد ण ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک گھنٹا اور انڈا کے نون کو ण کے بجائے ہم مخرج ن کی قسم قرار دینا زیادہ صحیح ہے۔ ڈاکٹر دھریندر ورما رقم طراز ہیں۔

"سنسکرت الفاظ میں ٹ۔ ڈ سے پہلے آنے والا ण ہندی میں بالکل ن کی طرح ہوگیا ہے۔ مثلاً پنڈت میں ݨ کی جگہ ن بولا جاتا ہے۔"[1]

ڈاکٹر مسعود حسین خاں لکھتے ہیں۔

"ن کی آواز جب کسی دوسرے مصمتے سے قبل واقع ہوتی ہے تو ہم آہنگ ہوجاتی ہے۔"[2]

یہ مسلّم ہے کہ انڈا میں ن معکوسی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ غذائی مصمتہ سماعی اعتبار سے رنڈا کی ن سے بالکل مماثل ہے اور ञ کے ण سے قطعاً مختلف۔ آخر رنج اور پنج کا ن تالوئی ہے جس کی وجہ سے تلفظ کے اعتبار سے لثوی ن سے مختلف ہوجاتا ہے۔ اس کے باوجود ہم اسے ن کی قسم ہی قرار دیتے ہیں۔ اسی اصول پر معکوسی اسپھوٹوں کے ماقبل (ن) کو کیوں نہ ہم مخرج (ن) کی ذیلی صورت تسلیم کرلیں۔ اگر ہم ایسا کرنے میں تامل کریں گے تو پلٹا اور پلڑا کے (ل) کو بھی معکوسی (ل) قرار دینا پڑے گا اور اس طرح اُردو زبان کے نظام اصوات میں معکوسی کا غیر ضروری اضافہ کرنا ہوگا۔

بہرحال اُردو میں ण کا وجود نہیں۔ ہم انڈا کے ن کو ण کہہ کر خواہ مخواہ ایک صوتیے کا اضافہ نہ کریں گے۔ ہندی میں خواہ کچھ بھی کہا جائے اُردو کی حد تک انڈا کا (ن) ہم مخرج (ن) ہے (ݨ) نہیں۔

م۔ یہ صرف دولبی (ب۔پ) اور لب دنتی مصمتوں (ف۔و) کے ساتھ ہم مخرج ہوسکتا ہے۔ مثلاً امبر۔ شمبھو۔ چمپا۔ ہموار۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ دولبی آوازوں کے ساتھ صرف (م) مخرج ہوسکتا

---

[1] ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۱۹۴

[2] اردوے معلّٰی لسانیات نمبر ص ۱۱۹

ہے (ن) نہیں۔ دنبہ۔ عنبر۔ سنبھل۔ تانبا وغیرہ میں (ن) لکھنا رسم الخط کی بوالعجبی ہے۔ ہم (م) بولتے ہیں لیکن رسم الخط سے گمراہ ہو کر سمجھتے ہیں کہ (ن) بول رہے ہیں۔

مندرجہ بالا آوازوں کے پہلے ہم مخرج یا واصل ہونے والا (م) بجائے خود کوئی نئی آواز نہیں چھپا اور جمنا کے (م) کو مختلف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں لب دنتی آوازوں کے قبل (م) خود لب دنتی ہو جاتا ہے۔ اس طرح (م) کے دو ہم صوت قرار دیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ لب دنتی مصمتوں سے قبل آنے والا (لب دنتی م) مثلاً ہموار میں۔

۲۔ بقیہ سب مقاموں پر آنے والا (دولبی م) مثلاً مال۔ چھپا۔ کم۔

(ن) اپنے بعد آنے والے بعض بندشی مصمتوں کے ساتھ ہم مخرج ہو سکتا ہے۔ اس کے بارے میں دو اصول[1] پیش نظر رہیں تو ہم بہت سی اغلاط سے محفوظ رہیں گے۔

۱۔ ہم مخرج یا وصلی ن (Homorganic n) صرف بندشی مصمتوں کے قبل آتی ہے۔

۲۔ ہم مخرج ن مختلف المخرج ن سے کوئی علیحدہ آواز نہیں۔

ن کا تلفظ کار عضو نوکِ زبان ہے اور مقامِ تلفظ اوپری مسوڑا۔ ہم مخرج (ن) اس (ن) کو کہتے ہیں جو اپنے متعاقب بندشی مصمتے کے نقطۂ تلفظ سے ادا ہو۔ زبان دونوں مصمتوں کو ادا کرکے ہی نقطۂ تلفظ سے جنبش کرتی ہے۔ نوکِ زبان کی قلمرو محدود ہے یعنی دانت سے لے کر تالو تک۔ اس طرح اُردو میں صرف ت۔ تھ۔ د۔ دھ۔ ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ چ۔ چھ۔ ج۔ جھ کے قبل آنے والا (ن) ہم مخرج ہوتا ہے۔ بقیہ تمام مصمتوں سے پہلے آنے والے ن کو مختلف المخرج ن (non-homorganic n) کہہ سکتے ہیں۔ لیکن مصوتوں سے قبل آنے والے ن (مثلاً نام۔ بنا وغیرہ میں) یا لفظ کے آخر میں آنے والے ن (بن۔ میں) مختلف المخرج کا اطلاق بے معنی ہے کیوں کہ ان موقعوں پر ہم مخرج یا مختلف المخرج ہونے کا سوال ہی نہیں۔ ہمیں (ن) کی ذیلی اصوات محض نقطۂ تلفظ کی بنا پر طے کرنا ہوں گی وصل و فصل کی بنا پر نہیں۔ مثلاً ایک انگریزی مثال لیجیے Shun اور Shunt اس میں Shunt کا (ن) ہم مخرج ہے اور Shun کا مختلف المخرج۔ لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ دونوں سو فیصدی لثوی مصمتے ہیں ہم انھیں کس طرح مختلف ذیلی اصوات قرار دے سکتے ہیں۔ اُردو میں بن اور ہنس (ایک پرندہ) ایسی مثالیں ہیں۔ واضح ہو کہ ہم بم اور پمپ کے م کو مختلف المخرج اور ہم مخرج میں تقسیم

---

[1] یہ اصول مجھے ڈاکٹر اشوک کیلکر ریڈر تجزیاتی لسانیات پونا یونیورسٹی نے دیے۔

نہیں کرتے۔ صوتیوں اور ان کی ذیلی اصوات سے متعلق کسی انگریزی یا ہندی تحریر میں مختلف المخرج اور ہم مخرج ن کی تقسیم نظر سے نہیں گزری۔ ہم محض مقام تلفظ کی بنا پر (ن) کی مختلف اقسام قائم کریں گے جو یوں ہوں گی۔

۱۔ (دنتی ن) ت۔ تھ۔ د۔ دھ سے ماقبل

۲۔ (معکوسی ن) ٹ۔ ٹھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ سے ماقبل

۳۔ (عقب لثوی ن) ش سے ماقبل

۴۔ (تالوی ن) چ۔ چھ۔ ج۔ جھ سے ماقبل

۵۔ (لثوی ن) بقیہ سب موقعوں پر یعنی

ا۔ بقیہ سب مصمتوں سے قبل مثلاً منفی۔ تنکا۔ انسان۔ منشی۔ منہا

ب۔ مصوتوں سے قبل مثلاً نور۔ بنا

ج۔ لفظ کے آخر میں مثلاً گردن

یہ سب قسمیں آپس میں تکملی بٹوارے میں ہیں۔

(نؐ) یہ سنسکرت کے ایک لفظ دانگ مے کے علاوہ کسی اور لفظ میں منفصل آزاد حیثیت سے نہیں آتا۔ ہمیشہ ک۔ کھ۔ گ۔ گھ کے پہلے ہم مخرج ہو کر آتا ہے۔ مثلاً ڈنک۔ ڈنکا۔ پنکھ۔ پنکھا۔ گنگا۔ سنگھ کنگھا۔ ڈاکٹر زور[1] اور پروفیسر سرور[2] نے اردو میں اس مصمتے کے وجود کو تسلیم کیا ہے۔ بقیہ اُردو والے اس آواز کو غلط فہمی سے ن سمجھتے ہیں لیکن اس کا مخرج ن سے اس قدر مختلف ہے کہ اسے کسی طرح کھینچ تان کر بھی (ن) کا ہم صوت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اُردو کے بعض اہلِ قلم (ن) کی دو قسمیں کرتے ہیں

۱۔ ہم مخرج ن (وصلی ن) جس میں دنتی۔ لثوی۔ معکوسی۔ تالوی کے علاوہ غُنّائی ن یعنی کو بھی شامل کرتے ہیں۔

۲۔ مختلف المخرج ن یا فصلی ن۔ اس تجزیے کو ذرا تفصیل سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک صوتیوں کی تعداد کا تعلق ہے میرے اور مندرجہ بالا تجزیے میں ن اور نؐ کی جملہ آوازوں

---

[1] Hindustani Phonetics ص ۶۴

[2] زبان اور علم زبان ص ۵۹

کو دو ہی صوتیوں میں محصور کیا جاتا ہے۔ فرق صرف یہ رہ جاتا ہے کہ ڹ کو وصلی ن کی ایک شکل سمجھا جائے کہ علیحدہ صوتیہ۔

جیساکہ پیشتر لکھا گیا (ن)، کا بنیادی نقطۂ تلفظ اوپری مسوڑا ہے لیکن بعض متعاقب مصمتوں کی ہمدردی میں یہ نقطۂ تلفظ تھوڑا بہت آگے پیچھے سرک سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نقلِ مکان بنیادی نقطے کے آس پاس ہی رہنا چاہیے زیادہ دور نہیں ورنہ وہ صوت ہی باقی نہ رہے گی۔ہم مخرج ن کا نقطۂ تلفظ بنیادی مقام یعنی اوپری مسوڑے سے ایک درجہ نیچے یعنی اوپری دانت یا ایک درجہ اوپر یعنی نرم تالو تک کھسک سکتا ہے۔ ڹ کے تلفظ میں عضوِ تلفظ کار زبان کا پچھلا حصہ ہے اور نقطۂ تلفظ نرم تالو۔

ا۔ نوکِ زبان اوپری مسوڑے اور

ب۔ زبان کے پچھلے حصے اور نرم تالو میں بُعد مشرقین ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ڹ کسی طرح ن نہیں۔ اُردو رسم الخط سے گمراہ نہ ہوئیے۔

ن کی مندرجہ بالا ہم مخرج اور مختلف المخرج تقسیم سے ان بےچاری آوازوں پر کتنا ستم ہوتا ہے ایک مثال سے اندازہ ہوگا "بن" اور "بنتا" کی (ن) صریحاً ایک ہیں لیکن مندرجہ تجزیے کے مطابق ان دونوں میں کوئی ربط اور رشتہ ہی نہیں۔ یہ زبان کے مزاج کو مجروح کرنا ہے۔

"بن" کی "ن" ادا ہوتی ہے نوکِ زبان اور اوپری مسوڑے سے "بنتا" کی (ن) نوکِ زبان اور اوپری دانت سے ادا ہوتی ہے۔ "دنگا" کا غنائیہ زبان کے پچھلے حصے اور نرم تالو سے ادا ہوتا ہے۔ جو کو (ن ڹ) کا ہم صوت قرار دینے والے حضرات "بنتا" اور "دنگا" کے غنائی مصمتوں کو ایک کنبے میں رکھتے ہیں حالاں کہ ان کے آلاتِ تلفظ دو انتہاؤں پر واقع ہوئے ہیں لیکن اس کے برعکس وہ "بن" اور "بنتا" کے ن کو جن کا آلۂ تلفظ مشترک ہے اور مقامِ تلفظ میں محض ایک درجے کا فرق ہے، علیحدہ قرار دیتے ہیں۔ صوتی مماثلت کا تقاضا عیاں ہے یعنی بن اور بنتا کی ن کو ایک گروہ میں رکھا جائے اور دور افتادہ دنگا کے غنائیہ کو دوسرے گروہ میں۔

میری رائے میں (ڹ) (ن) سے اسی قدر مختلف ہے جس قدر گمبھیر کا (م) "سنت" اور "سنگ" کے غنائی مصمتوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا سنت اور سمت میں۔ اب چند اسناد ملاحظہ ہوں مندرجہ بالا تمام آوازیں انگریزی میں بھی ہیں۔

ہم مخرج ن range. inch, hant, hunt.

ڹ Ring, Ink

گ سے پہلے مختلف المخرج ن Ingredient , incorrect inculcate
لیکن انگریزی کے مشہور عالم ماہرین صوتیات گلیسن[۱] اور ڈینیل جونس[۲] /ن/ کو /ن/ سے
مختلف صوتیہ قرار دیتے ہیں اور ہم مخرج ن اور مختلف المخرج ن کے اختلاف کو درخورِ اعتنا بھی نہیں
سمجھتے۔ یہی حال ہندی کے علمار کا ہے۔ ڈاکٹر اودے نرائن تواری[۳] /ङ/ کو ہندی کا صوتیہ مانتے
ہیں محض ہم مخرج ن کو صوتیے کا مقام نہیں دیتے۔

عام خیال یہ ہے کہ ںٓ اور دوسرے انوسوار یعنی ہم مخرج غنائی مصمتے صرف مصوتوں کے
بعد آ سکتے ہیں۔ انوسوار کے معنی ہیں سور یعنی مصوتے کے بعد، لیکن ذیل کے الفاظ میں یہ قاعدہ غلط
ہو جاتا ہے۔

لہنگا۔ بہنگی۔ مہنگا۔ ہانگی۔ مہنگائی۔ مہندی

میرا خیال ہے کہ ان موقعوں پر ھ لغزیہ (Glide) کا فائدہ دے رہی ہے۔ یاکوبسن
(Jacobson) نے اپنی کتاب Fundamentals of Language میں (ی)
اور (و) کے ساتھ ھ کو بھی لغزیہ قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر بابو رام سکسینہ[۴] بھی انگریزی میں یہ تین لغزیے تسلیم
کرتے ہیں۔ ڈاکٹر بھولاناتھ تواری[۵] نے جیل کے مسخ شدہ تلفظ जेहल میں ھ کو لغزیہ قرار دیا ہے بہنگا
اور مہندی وغیرہ میں بھی ھ اسی طرح سے آتی ہے۔

اس طرح اُردو کے تمام غنائی مصمتوں کو تین صوتیوں /م/ ن/ ںٓ/ میں گروہ بند کیا
جا سکتا ہے۔

غنائیت (Nasalisation) جیسا کہ پیچھے لکھا گیا غنائی مصوتے کے تلفظ میں
بیک وقت ناک اور منہ دونوں سے سانس باہر نکلتا ہے۔ اُردو کے تیرہ مصوتوں میں غنائیت کی
مثالیں ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

۱۔ An Introduction to Descriptive Linguistics: ed: 1961 P 50
۲۔ An Outline of English Phonetics: eddition 1956 P 170
۳۔ بھاشا شاستر کی روپ ریکھا (ہندی میں) از ڈاکٹر اودے نراین تواری ۱۹۶۳ء ص ۱۱۷
۴۔ سامانیہ بھاشا وگیان (ہندی میں) طبع ششم ص ۱۰۲
۵۔ بھاشا وگیان طبع سوم ص ۳۱۲

اینٹ ۔ سنچائی ۔ سینک ۔ سائیں ۔ مائیں ۔ اینٹھ ۔ گنوار ۔ سانس ۔ بھونک ۔ پہنچ ۔ گانوں ۔ جونک ۔ کنواں ۔ گھونٹ ۔

تین خفیف مصوتوں ۔ زیر مجہول ۔ زبر مجہول ۔ پیش لین (یعنی خفیف او) میں غنائیت کی کوئی مثال نہ مل سکی ۔ اُردو کے صوتی نظام میں مصیتی، بندشیہ اور مصیتی ایفریکیٹ مصمتوں سے قبل مصوتی غنائیت نہیں ملتی ۔ ان موقعوں پر ایک غیر معمولی صورت دکھائی دیتی ہے ۔ اس کی وضاحت کے لیے اوّل گلیسنؔ کا ایک مشاہدہ ملاحظہ ہو ۔

Perhaps more common are pronasalised stops. In these the oral closure slightly precedes the velic closure The result impresses American often as a stop preceded by a short homorganic nasal [^{m}b], [^{n}c] etc

کسی اور زبان میں اس کی مثال ہو کہ نہ ہو، اُردو میں ضرور ہے ۔ پ ۔ ب ۔ ت ۔ د ۔ ٹ ۔ ڈ ۔ ک ۔ گ ۔ چ ۔ ج ۔ اور ان کے منفوس روپوں کے قبل مصوتی غُنائیت مصوتے کی غُنائیت نہیں رہتی بلکہ متعلقہ غُنائی مصمتے کی ایک خفیف جھلک شامل کر لیتی ہے ۔ مثال کے طور پر دو لفظ لیجیے ۔ طنبورہ ۔ بندھا ۔ یہاں ب اور دھ سے پہلے ہی خفیف سا غُنائی مصمتہ شامل ہو جاتا ہے ۔ غُنائی مصمتے کے شمول کے معنی یہ ہیں کہ منہ سے ہوا کا اخراج بند ہو گیا لیکن ناک کے راستے جاری رہا ۔ مصوتہ اس آواز کو کہتے ہیں جس کے تلفظ میں سانس منہ سے بے روک ٹوک باہر نکلتا رہے ۔ طنبورہ کہنے میں جب منہ کا راستہ بند ہو گیا تو مصوتہ اور مصوتی غُنائیت کہاں رہی ۔ یہ تو خالص غُنائی مصمتہ ہو گیا جو اپنی نوعیت میں (۱) خفیف ہے اور (ب) مابعد اسپھوٹ کے ساتھ ہم مخرج ہے ۔ اس خفیف ہم مخرج غُنائیے (Short homorganic Nasal) کی مختلف اقسام متعلقہ غُنائی مصمتوں کے ساتھ نہیں بلکہ مصوتی غُنائیت کے ساتھ ہم صوت ہوتی ہیں ۔ تفصیل یہ ہے ۔

۱ ۔ (خفیف ہم مخرج م) ب ۔ بھ سے پہلے مثلاً طنبورہ ۔ سابھر ۔

۲ ۔ (خفیف ہم مخرج دنتی ن) د ۔ دھ سے پہلے مثلاً سندلیسا ۔ باندھا ۔

Descriptive Linguistics P. 249 ۵

۳۔ (خفیف ہم مخرج معکوی ن) ڈ۔ ڈھ سے پہلے مثلاً منڈیر۔ مینڈھا۔
۴۔ (خفیف ہم مخرج تالوی ن) ج۔ جھ سے پہلے مثلاً منجیرا۔ مانجھا۔
۵۔ (خفیف ہم مخرج ݩ) گ۔ گھ سے پہلے مثلاً منگانا۔ سونگھا۔
۶۔ (مصوتی غُنّائیت) بقیہ سب موقعوں پر مثلاً اونٹ۔ ہونٹ۔ لڑکوں۔

ان تمام اصوات کو ہم ایک صوتیہ /غُنّائیت/ کی ذیل میں رکھیں گے کیوں کہ یہ تکملی بٹوارے میں ہیں۔ غُنّایت کی صوتیاتی حیثیت کو قطعی طور پر طے کرنے کے لیے اس کا مقابلہ مماثل آوازوں سے کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے ہم اقلی جوڑے پیش کریں گے۔ جہاں اقلی جوڑے دستیاب نہیں وہاں مماثل جوڑوں سے کام چلایا جائے گا۔

۱۔ سادہ مصوتہ اور مصوتی غُنّائیت کا تضاد۔ ساس۔ سانس۔
۲۔ مصوتی غُنّائیت اور ہم مخرج ن کا تضاد۔ (ہنس) (ہنسنا کا فعل امر) ہنس (ایک پرندہ)
۳۔ خفیف غنّائیوں اور معمولی ہم مخرج غُنّائیوں کا تضاد
ا۔ سنبھل (فعل امر) سمبھل (ضلع مرادآباد کا ایک قصبہ)
ب۔ مُنڈی (منڈی ہوئی داڑھی) مُنڈی (ایک بوٹی جس کا عرق نکالتے ہیں)
ج۔ منگا (منگانا کا امر) ننگا
د۔ بھانجی (بھانجی مارنا) بھانجی (بہن کی لڑکی)

مندرجہ بالا مثالوں سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ /غُنّائیت/ ایک صوتیہ ہے جس کے چھ ہم صوت ہیں۔ اس طرح اُردو میں کل چار غُنّائیے صوتیے قرار پاتے ہیں۔

/م/ن/ݨ/ غُنّائیت/

اُردو کا صوتی تجزیہ

صوتیات کے مطالعے سے یہ حیرت خیز انکشاف ہوتا ہے کہ کسی لفظ بلکہ کسی حرف یعنی آواز کو دُنیا کے کوئی بھی دو آدمی یکساں طور پر ادا نہیں کرتے۔ اس سے بھی زیادہ پریشان کن یہ دعویٰ ہے کہ ایک شخص کسی لفظ یا مفرد آواز کو ایک بار جس طرح ادا کرتا ہے آئندہ کبھی بالکل اس طرح ادا نہیں کر سکتا۔ ایک ذکی الحس آلے کائموگراف کے سامنے جب کوئی لفظ یا آواز بولی جاتی ہے تو اس میں لگے ہوئے کاغذ پر ہوا کی لہر کا ایک گراف بن جاتا ہے۔ اب اگر ہم سو بار ک ک کہیں تو ہر دفعہ یہ گراف کچھ نہ کچھ بدلا ہوا ہو گا۔

اصوات کا یہ تنوع اور فراوانی سائنسی مطالعے کے لیے بڑا دردِ سر ہے۔ مثال کے طور پر "آیا" اور "دنیا" میں (ی) کی آواز مختلف سُنائی دیتی ہے انھیں ایک آواز قرار دیا جائے یا دو۔ اس کا حل یہ نکالا گیا ہے کہ اس طرح کے نازک اختلافات والی مماثل آوازوں کو مجموعی طور پر ایک صوتیہ (Phoneme) قرار دیا گیا۔ روزانہ کے کام کاج میں ہم صوتیوں سے غرض رکھتے ہیں نہ کہ صوت سے صوتیہ میں شامل مختلف آوازوں کو ہم صوت (Allo- Phone) کہا جاتا ہے۔

دو صوتیے کم و بیش ایک ماحول میں واقع ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں جب کہ ہم صوت کبھی ایک ماحول میں نہیں پائے جاتے۔ ماحول سے مراد لفظ کی ابتدا' وسط یا آخر ہے۔ نیز کسی مخصوص آواز کے ماقبل یا مابعد آنے والی آوازیں بھی ماحول کا جزو ہیں بشرطیکہ وہ زیرِ بحث آواز میں کسی حد تک ترمیم کا باعث ہوں۔ اگر دو آوازیں دو لفظوں میں اس طرح واقع ہوں کہ سوا ان آوازوں کے باقی تمام آوازیں یکساں ہوں اور صرف ایک ایک آوازوں کے اختلاف کی وجہ سے ان الفاظ کے معنی مختلف ہو گئے ہوں تو ان آوازوں کو صوتیہ قرار دیا جائے گا اور ان الفاظ کو اقلی جوڑا (Minimal pair) مثلاً مال اور حال۔ مال اور میل۔ مال اور مار۔ ہم صوت مختلف ماحول میں واقع ہوتے ہیں اور کبھی ایک ماحول میں واقع بھی ہو جائیں تو معنی میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتے۔ ہر زبان کے بیشتر حروفِ تہجی عام طور سے

صوتیے ہوتے ہیں۔ صرف ایک دو حروف ایسے ہو سکتے ہیں جنھیں صوتیے کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا اور صرف دو چار صوتیے ایسے ہوتے ہیں جو حروفِ تہجی میں آزاد حیثیت پانے سے رہ گئے ہوں۔ ماہر صوتیات کا کمال ہے کہ ایک زبان کی اصوات کا تجزیہ کرتے وقت آوازوں کے زیادہ سے زیادہ نازک اختلافات کی نشان دہی کر سکے۔ لیکن صوتیوں کے تعین میں کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک زبان کی جملہ آوازوں کو کم سے کم صوتیوں میں اسیر کیا جا سکے۔ یعنی اصوات کی فہرست جتنی جامع اور مفصل ہو خوب ہے۔ اس کے برعکس صوتیے جتنے کم ہوں اسی قدر سہولت اور کفایت کا حق ادا ہوتا ہے۔ صوت اور صوتیے کا صحیح تصور اور تعین ایک پیچیدہ کام ہے جس کے لیے لسانیات کی دو اہم شاخیں صوتیات اور تجھوتیات (Phonemics) وجود میں آئی ہیں۔

آج کل اُردو رسم الخط اور املا کی اصلاح کے موضوع پر مضامین کا تواتر لگا ہوا ہے۔ رسم الخط کے موضوع پر غور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ تو طے ہو جائے کہ اُردو میں کتنے صوتیے ہیں تاکہ ان کے لیے علیٰحدہ واضح علامت مقرر کی جا سکیں۔ اگر کسی صوتیے میں کچھ ایسے ہم صوت ہوں جن کا اختلاف صریحاً سنائی دے تو ان کے لیے بھی رسم الخط میں اہتمام کرنا ہوگا۔

— ❊ —

اُردو مصمتوں کے پانچ نقشے میری نظر سے گزرے ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر زور کی انگریزی کتاب Hindustani Phonetics میں ص ۶۴ پر

۲۔ پروفیسر سروری کی کتاب 'زبان اور علمِ زبان' میں ص ۵۹ پر

۳۔ جناب سرسوتی کرن کیفؔ کے مضمون 'ہندوستانی صوتیات' مشمولہ نیا دور مارچ ۱۹۶۱ء میں ص ۱۲ پر۔

۴۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے مضمون مشمولہ "اردوئے معلّٰی" لسانیات نمبر میں ص ۱۱۵ پر

۵۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مضمون مشمولہ "اردوئے معلّٰی" لسانیات نمبر میں ص ۲۲۲ پر

میرے نزدیک اُردو میں جو مصمتے صوتیے کا مرتبہ رکھتے ہیں انھیں ذیل کے نقشے میں پیش کیا جاتا ہے۔ نقشے میں میں نے خود ساختہ اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ بعض دوسری اصطلاحوں سے میں مطمئن نہیں لیکن چوں کہ انھیں کچھ لوگوں نے استعمال کیا ہے اس لیے سہولت کی خاطر میں نے بھی انھیں لے لیا ہے۔ (نقشہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

اُردو کے مصمتی صوتیے

	دولبی		لب دنتی		دنتی		لثوی Alubolar		معکوسی		عقب لثوی Palato Alubolar		تالوئی Palatal		نرم تالوئی Velar		لہاتی Uvular		گلوئی
	غیر مصیتی	مصیتی	غیر مصیتی	مصیتی	غیر مصیتی	مصیتی	غیر مصیتی	مصیتی	غیر مصیتی	مصیتی	غیر مصیتی	مصیتی	غیر مصیتی	مصیتی	غیر مصیتی	مصیتی	غیر مصیتی	مصیتی	غیر مصیتی
بندشیہ	پ	ب			ت	د			ٹ	ڈ					ک	گ	ق		
ایفرکیٹ Affricate													چ	ج					
غُنائی		م						ن								ں			
Lateral پہلوئی								ل											
Flapped دستکی								ر		ڑ									
صفیری			ف				س	ز			ش	ژ					خ	غ	ہ
نیم مصوتہ				و										ی					

میرے نقشے میں اور دوسرے حضرات کے نقشے میں بعض جزئیات میں فرق ہے۔ مثلاً

۱۔ بعض حضرات نے ن۔ ل۔ ر۔ س۔ ز۔ میں سے کچھ کو یا سب کو دنتی آوازوں میں شامل کیا ہے۔ میں نے ڈینیل جونز Danial Jones کی تقلید میں ان پانچوں آوازوں کو لثوی قرار دیا ہے میرا تلفظ بھی اسی کا شاہد ہے۔ واضح ہو کہ پاننی نے رس کو دنتی آواز لکھا ہے لیکن آج اس کا تلفظ اوپری مسوڑے سے ہوتا ہے۔

۲۔ اکثر حضرات نے چ۔ چھ۔ ج۔ جھ کو بندشی آوازوں کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ میرے نزدیک ان آوازوں ایفرکیٹ قرار دینا صحت کے زیادہ قرین ہے۔

۳۔ ف کو بعض نقشوں میں لبی (دولبی) آواز قرار دیا ہے۔ اُردو اور انگریزی ف صاف صاف لب دنتی ہے۔ آئینے کے سامنے بول کر دیکھ لیجیے۔

۴۔ و کو مندرجہ بالا تمام نقشوں میں صیفری آواز ظاہر کیا گیا ہے اور بیشتر میں لب دنتی کی بجائے دولبی۔ دولبی صیفری آواز اسپینی اور وسط جرمانی میں ملتی ہے۔ ہمارے (و) سے مماثل انگریزی میں دو آوازیں ہیں (v) اور (w)۔ (v) ہمارے (و) کی طرح لب دنتی ہے لیکن وہ صیفری آواز ہے یعنی اس کے ادا کرنے میں ہوا بہت تنگ راستے سے جدوجہد کے ساتھ نکلتی ہے۔ اردو (و) نیم مصوتہ یعنی غیر جہدی frictionless ہے۔ اس کے ادا کرنے میں ہوا کا راستہ نسبتاً کشادہ رہتا ہے۔ انگریزی میں (w) دولبی نیم مصوتہ ہے جو اُردو میں عام طور سے نہیں پایا جاتا۔ اُردو الفاظ میں (و) صرف (ں) کے بعد دولبی ہو جاتا ہے۔ I.P.A. کے رسالے میں صریحاً لکھا ہے کہ ہندی (و) لب دنتی نیم مصوتہ ہے۔

۵۔ بعض حضرات نے (ہ) یعنی ہائے ہوز کی آواز کو اُردو مصمتوں میں شامل ہی نہیں کیا۔ معلوم نہیں کیوں؟

یہ جزئیات کی باتیں تھیں۔ اب کچھ اہم تر امور پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

مندرجہ بالا نقشے میں ڑ۔ ڑ۔ ن۔ کی صوتیاتی حیثیت میں بعض حضرات کو شبہ ہو تو ہو، بقیہ مصمتے ایسے ہیں جن کی صوتیاتی حیثیت کو ثابت کرنا تحصیل حاصل ہوگا۔

(۱) اس مجموعے میں شامل مضمون 'اُردو کی غُنّائی اصوات' میں مفصل مطالعے کے بعد طے کیا گیا ہے کہ اُردو میں تین غُنّائی مصمتے صوتیے کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ /م/ اس کے دو ہم صوت ہیں (دولبی م) اور (لب دنتی م)

۲۔ /ن/ اس کے پانچ ہم صوت ہیں۔ (دنتی ن)۔ (معکوسی ن) (عقب لثوی ن) (تالوی ن) و (لثوی ن)۔

۳۔ /نں/

ان کے علاوہ /غُنائیت/ بھی ایک صوتیہ ہے جس کے چھ ہم صوت ہیں

(۱) (خفیف ہم مخرج م) (خفیف ہم مخرج دنتی ن) (خفیف ہم مخرج معکوسی ن) (خفیف ہم مخرج تالوئی ن) (خفیف ہم مخرج نں) اور (مصوتی غُنائیت)

(۲) /ل/ کے دو ہم صوت ہیں

و۔ معکوسی مصمتوں سے قبل (ل) کا تلفظ بھی ایک حد تک معکوسی ہو جاتا ہے۔ مثلاً الٹا۔ پلڑا، ہیں۔

ب۔ بقیہ موقعوں پر آنے والا (ل) مثلاً لڑکا۔ عل۔

(۳) میں نے /ڈ/ اور /ڑ/ کو جداگانہ صوتیہ قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ پیشتر میں اپنے بعض مضامین میں لکھ چکا ہوں۔ ان کا خلاصہ ایک بار پھر درج کیا جاتا ہے۔

اگر ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ /ڈ/ لفظ کے درمیان آتا ہے یا نہیں تو ہم ان سب مرکب الفاظ کو شمار میں لے سکتے ہیں جن میں ڈ کے بعد کھلا اتصال Open Juncture نہ ہو۔ اس طرح نڈر۔ سڈول۔ لاڈلا۔ ڈگڈگی۔ ڈبڈبانا۔ ڈگڈگا کر پانی پینا جیسے مرکب یا مرکب نما الفاظ بھی ہمارے جائزے میں شامل ہوں گے۔ دوسری طرف گڈریا۔ اُجڈ۔ کھڈ۔ گڈمڈ۔ آڈمبر۔ اڈانا جیسے الفاظ ہمارے مفید مطلب ہیں۔ گڈریا اگرچہ مرکب لفظ ہے لیکن لاحقہ کا اضافہ /ڈ/ سے دو ہے۔ ان سب الفاظ میں /ڈ/ جس ماحول میں آتا ہے اسی ماحول میں دوسرے الفاظ میں /ڑ/ بھی ملتا ہے۔ ہمیں اجڈ اور اجڑ کا ایک اقلی جوڑا بھی مل جاتا ہے۔

مقامات کے ناموں سے کسی علاقے کی زبان کا مزاج بڑی خوبی سے ظاہر ہوتا ہے کیوں کہ مقامات کے نام اپنی قدامت کے باعث زبان کا اصلی رنگ محفوظ رکھتے ہیں۔ ہردوار میں ایک مقام بھیم گوڈا ہے وہاں کی بولی میں گوڈا گھٹنے کو کہتے ہیں۔ ضلع بجنور میں تین گاؤں کے نام بڈیرن۔ گڈانہ गुडाना اور بڈگرہ बुडगारा ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کھڑی بولی کو دو مصوتوں یا ایک مصوتہ اور مصمتہ کے درمیان (ڈ) کو قبول کرنے سے کوئی بھڑک نہیں۔ یہ اس کے لیے ایک معمول کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈالڈا جیسے ہندوستانی لفظ اور سوڈا جیسے انگریزی لفظ ہماری زبان میں اس طرح

سے کھپ گئے ہیں کہ کسی کو ان کی صوتی ساخت و بندش میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ مندرجہ بالا الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ /ڈ/ ہر مقام پر اور ہر ماحول میں واقع ہوتا ہے۔

(۴) /ژ/۔ یہ۔/ز/ سے مختلف صوتیہ ہے۔ دو اقلی جوڑے ملاحظہ ہوں

زیاں ژیاں (شیر ژیاں)

ظرف (ظ۔ز) ژرف

ایک اور مماثل جوڑا زال اور ژالہ ہے۔

(ژ) اردو کے زیادہ الفاظ میں نہیں آتا لیکن ز کے ساتھ اقلی جوڑوں کی موجودگی میں ہم اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔

(۵) /ھ/ اردو الفاظ میں تین صورتوں میں جلوہ گر ہوتی ہے۔

۱۔ [ھکاریت] یا (Aspiration) ھ کی یہ آواز اسپھوٹ یا الیفرکیٹ مصمتوں کے بعد ان میں ضم ہو کر بولی جاتی ہے۔ دونوں آوازیں ایک ہی صوت رکن کا جزو ہوتی ہیں۔

۲۔ [ہائے مخلوط] یہ م۔ ن۔ ل۔ ر۔ ڑ۔ اور عوامی بولی میں ی۔ و۔ ز [ذ] کے بعد اس طرح آتی ہے کہ دونوں آوازیں ایک ہی صوت رکن کا جزو ہوتی ہیں مثلاً کمہار۔ انہیں۔ کولھو۔ سرہانے۔ چڑھا۔ یہاں۔ وہاں۔ مذہب۔

یہاں ھ کی آواز ماقبل مصمتے سے نہ پوری طرح جدا ہے نہ کاملاً شیر و شکر ہے۔

۳۔[ہائے ملفوظی] جو بقیہ تمام موقعوں پر آتی ہے مثلاً ہار۔ دہکنا۔ اطہر۔ صدہا۔ نکہت۔ لمحہ منہا۔ زہاد۔ آخری چھ مثالوں میں چوں کہ ھ ماقبل مصمتے کے ساتھ ایک صوت رکن میں شامل نہیں اس لیے اسے پہلی یا دوسری شق میں نہیں رکھ سکتے۔

چوں کہ یہ تینوں آوازیں تکمتی بٹوارے میں ہیں اس لیے /ہ/ کو ایک صوتیہ اور ان تینوں کو ہم صوت قرار دینے میں کوئی قباحت نہیں۔ اپنے ایک مضمون "اردو کی ہائیہ آوازیں" مشمولہ نقوش بابت جون ۶۳ء میں ڈاکٹر شوکت سبزواری نے پہلے گروہ کی آوازوں کو قدیم ہائیہ اور دوسرے گروہ کی آوازوں کو جدید ہائیہ سے موسوم کیا۔ ذیل میں ان تینوں کا تفصیلی جائزہ لیا جاتا ہے۔

(ھکاریت) اسپھوٹ اور الیفرکیٹ مصمتوں کا بند کھولنے پر جو تنفس خارج کیا جاتا ہے اگر اس کی مقدار بڑھا دی جائے تو اس عمل کو ھکاریت کہتے ہیں۔ چوں کہ ھکاریت کے وقت صیفری انداز میں گلا سکوڑا[1] (Glottal friction) جاتا ہے اسی لیے اسے (ہ) سے منسوب کر سکتے

ھکاریت کو لفظ کا علیحدہ قطعہ (Segment) قرار دینا غالباً صحیح نہیں۔ یہ مصوتی غنائیت (Nasalisation) کی طرح ایک وصف ہے۔ جس طرح سانس اور ساس میں ایک بھی مصوتے یا مصمتے کی کمی بیشی نہیں۔ اسی طرح بھار میں اتنے ہی مصمتے ہیں جتنے بار میں۔ ایک زمانے میں ماہرینِ طبیعیات جوہر (Atom) کو ناقابلِ تقسیم سمجھتے تھے لیکن بعد میں اسے ٹکڑوں میں توڑ دیا گیا۔ اسی طرح کچھ عرصے پہلے تک ماہرینِ لسانیات صوتیے کو سب سے چھوٹی اکائی سمجھتے تھے لیکن اب اسے بھی اوصافِ ترکیبی (Component) میں تقسیم کر لیا گیا ہے۔ مثلاً ب کے تین اوصافِ ترکیبی ہیں۔

(۱) اسپھوٹ ہونا
(۲) دولبی ہونا
(۳) مصیتی ہونا

بھ میں محض ایک چوتھے وصف ھکاریت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ صوتیاتی رسم الخط میں بھار کو Bhar لکھنا صحیح نہیں B"ar لکھنا چاہیے b کے اوپر لکھی جانے والی چھوٹی سی h ھکاریت کی نشانی ہے۔ اسی طرح بار اور بھار دونوں تین قطعات کے لفظ ہیں۔

[ہائے مخلوط] اب لیجیے دوسرے گروہ کی آوازوں کو۔ ڈاکٹر زورؔ[1] نے ان آوازوں کو مفرد قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی انھیں پہلے گروہ کی صف میں رکھنا چاہتے ہیں۔ اپنے مضمون[2] میں فرماتے ہیں:

"کھ۔ گھ۔ وغیرہ آوازیں اگر ایک کوشش اور ایک جھٹکے میں ادا ہوتی ہیں تو لھ۔ مھ۔ نھ۔ وغیرہ کے ادا کرنے کے لیے بھی صرف ایک کوشش اور ایک جھٹکا درکار ہے۔ طرزِ ادا، تلفظ اور سماعی اثر کے لحاظ سے قدیم اور جدید ہائیوں میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔"

سب سے پہلے مھ اور نھ کو کریدا جائے۔ غنائی مصمتوں کے ادا کرنے میں منھ کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور سانس صرف ناک کے راستے خارج ہوتا ہے (ہ) کے ادا کرنے میں حلق سے ناک کو جانے والا راستہ بند ہو کر سانس صرف منھ سے نکلتا ہے اس لیے (م) یا (ن) کے ساتھ

۱۔ Hindustani Phonetics

۲۔ نقوش جون ۶۳ء ص ۵۳

(ہ) کا ایک کوشش میں ادا ہونا ناممکنات میں سے نہیں۔ اپنے مضمون کے آخری صفحے پر شوکت صاحب نے دو لفظ لکھے ہیں تھ اور اتھ۔ اس سے قطع نظر کہ یہ الفاظ کبھی بولنے سننے میں نہیں آئے، ہمارے مقصد کے لیے بڑے کام کے ہیں۔ آئینے میں دیکھ کر ایک بار کہیے۔ تم۔ م کے ادا ہونے پر ہونٹ بند رہیں گے کیوں کہ سانس ناک سے خارج ہوتا ہے۔ پھر کہیے تمھ۔ م کو ادا کرتے ہوئے ہونٹ بند رہیں گے اور اس کے بعد ہ کو ادا کرنے کے لیے کھُل جائیں گے۔ چوں کہ ہ کے لیے منھ سے سانس نکلتا ہے یہ قطعی ثبوت اس بات کا ہے کہ م یان کے بعد ہ ھکاری بندشی مصمتوں کی طرح نہ شیر و شکر ہوتی ہے نہ ایک کوشش میں ادا ہوتی ہے۔ ل۔ ر۔ ڑ۔ کا طریقِ تلفظ تو اتنا پیچیدہ ہے کہ اس کے ساتھ زیادہ تنفس کا خارج کرنا ممکن نہیں۔ فالتو ہوا کا اخراج ل۔ر۔ ڑ۔ کے ادا ہونے کے کچھ بعد میں ہوتا ہے۔ جدید ہائیے لفظ کے آخر میں آتے ہیں تو ان کی ساخت میں چستی بندش کا نقدان صاف نمایاں ہو جاتا ہے۔ کچھ واقعی اور کچھ فرضی لفظوں کا تلفظ کر کے دیکھیے۔

ا۔ رالھ۔ سارھ۔ باڑھ۔ راجھ۔ مادھوھ

ب۔ راکھ۔ ساکھ۔ ہاتھ۔

ا کے الفاظ میں (ھ) کا تلفظ اتنا نحیف ہو جائے گا کہ اس کا وجود مشتبہ ہوگا اور اگر اسے نمایاں کرنے کی کوشش کی جائے گی تو وہ ماقبل مصمتے سے صریحاً الگ ہو کر اس طرح لٹک جائے گا جیسے اس کے بعد کوئی بہت خفیف مصوتہ ہو۔ اس کے مقابلے میں ھکاری بندشیوں کو لفظ کے آخر میں بھی بخوبی ادا کیا جا سکتا ہے۔

لھ۔ رھ۔ ڑھ۔ یھ۔ وھ وغیرہ کی آخری آواز ہائے ملفوظی سے کسی قدر مختلف ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ اپنے ماقبل مصمتہ کے ساتھ اسی رکن کا جزو ہے جب کہ ہائے ملفوظی ایک ہی رکن میں کسی مصمتے کے بعد نہیں آسکتی یوں بھی ہائے ملفوظی گلوئی آواز ہے اس لیے یہ ل۔ ر۔ڑ۔ وغیرہ کے ساتھ بیک وقت ادا ہو ہی نہیں سکتی ان کے بعد ہی میں ادا ہوگی۔ اس طرح جدید ہائیوں کی ہائے مخلوط ھکاریت کے مقابلے میں زیادہ ڈھیلی اور ہائے ملفوظی کے مقابلے میں زیادہ چست ہے۔

صوتیات کا تقاضا ہے کہ ایک صوتیے کے زیادہ سے زیادہ ہم صوت گرفت میں لائے جائیں ان سب کی نزاکت میں امتیاز کیا جائے اس لیے قدیم و جدید ہائیوں کو ایک لاٹھی سے ہانکنا مناسب نہ ہوگا۔ /ہ/ کے تین ہم صوت قرار دینا اعترافِ حقیقت اور بہترین حل معلوم ہوتا ہے۔

[ہائے ملفوظی] مغرب کے بعض ماہرینِ لسانیات نے نیم مصوتوں کے ساتھ /ہ/ کو بھی لغزیہ

قرار دیا ہے۔ یاکوبسن (Jacobson) نے اپنی کتاب (Fundamental of language) میں (ی) اور (و) کے ساتھ (ہ) کو بھی لغزیوں میں شامل کیا ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ[1] بھی انگریزی میں یہ تین لغزیے تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری[2] نے جیل کے مسخ شدہ تلفظ جہل میں ھ کو لغزیہ مانا ہے۔ اُردو میں (ہ) کے استعمال کی ایک غیر معمولی صورت ملاحظہ ہو۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ ہندی انوسوار۔ سو یعنی مصوتے کے بعد ہی آتا ہے لیکن ذیل کے الفاظ میں ہم مخرج ں یعنی کا استعمال ملاحظہ ہو۔

لہنگا۔ بہنگی۔ مہنگا۔ مہنگی۔ مہنگائی۔

ایک لفظ مہندی میں ہم مخرج ن بھی اسی طرح آتا ہے۔ غالباً ان الفاظ میں (ہ) نیم مصوتے کا کام دے رہا ہے۔

ھ اپنی فطرت میں غیر مصیتی ہے لیکن آس پاس کی مصیتی آوازوں کے زیر اثر یہ بھی مصیتی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس کے دونوں طرف مصوتے ہوں تو یہ غیر مصیتی نہیں رہتی۔ چنانچہ انگریزی میں behind اور اُردو میں 'کہا' کی ھ مصیتی ہے۔ گلیسن[3] نے تو ھکاریت کو بھی مصیتی اور غیر مصیتی میں تقسیم کیا ہے۔ اس کے بعد غیر مصیتی بندشی آوازوں کے ساتھ ھکاریت غیر مصیتی اور مصیتی بندشیوں کے ساتھ مصیتی ہو جاتی ہے۔ مثلاً "تھا" کی ھکاریت غیر مصیتی اور "دھا" کی مصیتی ہے۔

یہ تو یقینی ہے کہ ھکاریت ہائے مخلوط اور ہائے ملفوظی تینوں میں مصیتی اور غیر مصیتی اقسام پائی جاتی ہیں لیکن مشینوں سے تجزیہ کیے بغیر یہ قطعی طور پر طے نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اصوات کس کس ماحول میں مصیتی ہو جاتی ہیں اور کس کس میں غیر مصیتی رہتی ہیں۔ ھ کی یہ چھ اقسام آپس میں ہم صوت ہوں گی۔ ان کے وقوع کی قطعی حدیں متعین نہ ہونے کی وجہ سے راقم الحروف نے فی الحال محض تین ہم صوت درج کرنے پر اکتفا کی ہے۔

(۶) /و/ اس کے دو ہم صوت ہیں۔

۱۔ دولبی 'و' یعنی (W) یہ (ل) کے بعد لغزیے کے طور پر آتا ہے مثلاً کوا۔ جوا۔

---

[1] سامانیہ بھاشا وگیان (ہندی) ص ۱۰۳

[2] بھاشا وگیان طبع سوم ص ۲۱۲

[3] Descriptive Linguistics P. 247

اس قسم کا (و) ہندوستانی زبانوں میں نہایت شاذ ہے۔

۲۔ لب دنتی و (v) بقیہ تمام موقعوں پر مثلاً وعدہ۔ دوا۔ مادھو

(۷) /ی/ اس کی دو اقسام معروفِ عام ہیں۔ اوّل جب کہ یہ دو مصوتوں کے درمیان لغزیے Glide کے طور پر آتی ہے۔ دوسرے بقیہ موقعوں پر۔ پہلی صورت میں یہ اپنے ماقبل کے مصوتے سے کسی حد تک اور متعاقب مصوتے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس طرح ماحول کے مطابق اس کی متعدد قسمیں ہو جاتی ہیں جن پر لیبارٹری میں مفصل تحقیق کی ضرورت ہے۔ میرے نزدیک اس کے کم از کم حسب ذیل ہم صوت ہو سکتے ہیں۔

ا۔ مندرجہ ذیل موقعوں پر آتی ہے

۱۔ لفظ کے شروع میں مثلاً یار

۲۔ لفظ کے درمیان میں ھ کے علاوہ کسی دوسرے مصمتے کے بعد مثلاً دنیا۔ اغیار۔

۳۔ لفظ کے آخر میں مثلاً راجیہ /ی/ کی اس قسم کو بجا طور پر ہم مصمتہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ بلند ترین قسم ہے۔

ب۔ مندرجہ بالا سے برائے نام نیچی ہے۔ یہ اس وقت ادا ہوتی ہے جب اس سے ماقبل [i: , e:] یا اس کے بعد (u:) ہو (ا) کے مابعد بھی متعاقب مصوتوں (o, a, ə, ɛ) کے زیر اثر اس کی کیفیت بدلتی رہتی ہے مثلاً لیے۔ عاریت۔ کیا جیو میں اس کا تلفظ بعد کے مصوتے کے قریب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح (u:) کے قبل آنے والی (ی) اپنے ماقبل مصوتہ (i, ə, a, u) سے کچھ نہ کچھ متاثر کرتی ہے مثلاً قیوم۔ غیور۔ قیود۔ والیو۔ میں۔

ج۔ ی کی سب سے نیچی قسم ہے۔ اس سے پہلے (h, e, ə, a, o) میں سے کوئی ایک آواز اور بعد میں (ə, a, o) میں سے کوئی ایک مصوتہ ہے۔ مثلاً احیا۔ قایم۔ سویم گیا۔ آیا۔ کھویا۔ سخن گویو۔

(۸) مصوتوں کی تفصیل اس مجموعے کے مضمون 'اردو مصوتے' میں ملاحظہ ہو۔ اس کے مطابق اردو میں سات مصوتے صوتیے کا مرتبہ رکھتے ہیں۔

(۹) مصوتی صوتیوں میں اس قدر کفایت طول (Length) کو صوتیہ قرار دینے سے حاصل ہوئی ہے۔ اردو میں طول بڑے کام کا صوتیہ ہے۔ خفیف مصوتوں میں اس کے شمول سے طویل مصوتے حاصل ہوتے ہیں اور مصمتوں میں اس کے شمول سے تشدید کا فائدہ ہوتا ہے۔

(۱۰) اردو میں اتصال (Juncture) بھی صوتیہ ہے۔ مثلاً ذیل کے دو جملے ملاحظہ ہوں۔

دوا پیلی ہے۔

دوا پی لی ہے۔

دوسری مثال میں اتصال کا صوتیہ موجود ہے

سُرلہر (Intonation) کے صوتیوں کا میں نے مطالعہ نہیں کیا لیکن یہ غالباً تین سے زیادہ نہ ہوں گے۔ اس طرح اُردو میں ذیل کے صوتیے قرار پاتے ہیں:۔

مصمتے

۱۔ پ۔ ۲۔ ب ۳۔ ت۔ ۴۔ د۔ ۵۔ ٹ۔ ۶۔ ڈ۔ ۷۔ ک۔ ۸۔ گ۔ ۹۔ ق۔ ۱۰۔ چ۔ ۱۱۔ ج۔ ۱۲۔ م۔ ۱۳۔ ن۔ ۱۴۔ ںٓ۔ ۱۵۔ ل۔ ۱۶۔ ر۔ ۱۷۔ ڑ۔ ۱۸۔ ف۔ ۱۹۔ س۔ ۲۰۔ ز۔ ۲۱۔ ش۔ ۲۲۔ ژ۔ ۲۳۔ خ۔ ۲۴۔ غ۔ ۲۵۔ ھ۔ ۲۶۔ و۔ ۲۷۔ ی۔

مصوتے

۲۸۔ i۔ ۲۹۔ e۔ ۳۰۔ ɛ۔ ۳۱۔ ə۔ ۳۲۔ ɑ۔ ۳۳۔ o۔ ۳۴۔ u۔

۳۵۔ غُنّائیت۔ ۳۶۔ طول۔ ۳۷۔ اتصال۔

ان کے علاوہ اگر تین سُرلہر کے صوتیے ہوں تو اُردو کی جملہ آوازوں کا ۴۰ صوتیوں میں احاطہ کیا جاسکتا ہے۔

اُردو صوت رکن

اُردو میں لسانیات کے موضوع پر کچھ بھی لکھتے وقت اصطلاحوں کا مسئلہ سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔ چوں کہ ابھی تک اصطلاحوں کے ترجمے انفرادی کوششوں کے مرہونِ منت ہیں اس لیے ان میں یکسانیت نہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ حکومتِ ہند کی ترقیٔ اُردو بورڈ کی لسانیات کمیٹی اس طرف توجہ کر رہی ہے۔

زیرِ نظر مضمون کا موضوع Syllable ہے۔ میں نے اوّل اوّل اس کے لیے رُکن کا لفظ استعمال کیا تھا۔ بعد میں احساس ہوا کہ اس کا عروضی رکن سے التباس ہو سکتا ہے۔ اس لیے اب اسے صوت رکن لکھ رہا ہوں۔

اُردو صوتیات کی مروجہ اصطلاحوں کے علاوہ اس مضمون میں کچھ اور اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

Syllable	صوت رُکن	Sonority	گونج
On-set	مبدا	Sonorous.	گونج دار
Peak	چوٹی	Interlude	دخا
Coda.	اخیریہ	Juncture	اتّصال
Hiatus	انقطاع		

اہلِ اُردو صوت رکن کے تصور سے بے گانہ ہیں لیکن ذیل کی وجوہ سے اس کی اہمیت آشکارا ہو گی۔

۱۔ عہدِ عتیق میں ابجدی رسم خط سے پہلے کی منزل صوت رکنی تحریر تھی۔ چنانچہ سنسکرت اور ہندی کے بیشتر حروف آج بھی واحد آواز کی بجائے صوت رکن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سنسکرت کی قدیم ترین کتابوں مثلاً رگ وید۔ گیتا وغیرہ میں اس کے مترادف لفظ اکشر کا ذکر آتا ہے۔ سنسکرت

کے مشہور قواعد نویس پتنجلی نے مہابھاشیہ میں اس کے بارے میں مفصل بحث کی ہے۔

۲۔ شارٹ ہینڈ کی بنیاد صوت رکن کے ادراک ہی پر ہے۔ اردو شارٹ ہینڈ کو بہتر بنانے کے لیے صوت رکن سے واقفیت ضروری ہے۔

۳۔ بہت سی زبانوں میں لفظ اور جملے میں بعض مقامات پر بل (Stress) ہوتا ہے۔ اس بل کا مورد صوت رکن ہی ہوتا ہے۔ انگریزی جیسی زبان میں بل کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر صحیح صوت رکن پر بل نہ دیا جائے تو بعض اوقات لفظ کے معنی ہی غت ربود ہو جاتے ہیں۔ اردو میں بھی لفظ کے صوت رکن بل دار یا بغیر بل کے ہوتے ہیں۔ اہلِ زبان کے لیے یہ بل غیر محسوس ہوتا ہے لیکن جب کوئی بیرونی اس زبان کو سیکھتا ہے تو بل کے صحیح وقوع سے ناواقفیت کی وجہ سے اس کا لہجہ اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا ہے بیرونی طلبا کو اردو زبان کا صحیح تلفظ سکھانا ہے تو بل کے قواعد بھی بتانے ہوں گے اور یہ صوت رکن کے تصور کے بغیر نہیں بتائے جا سکتے۔

۴۔ متعدد زبانوں کے شعر کا وزن صوت رکن پر مبنی ہے۔ انگریزی میں تو صوت رکن کے بل دار اور بغیر بل کے ہونے ہی سے بحروں کی تشکیل ہوتی ہے۔ ہندی اوزان کی دو قسمیں ہیں۔ ماترائی اور ورنک۔ آخرالذکر کی اکائی صوت رکن ہے۔ اردو عروض صوت رکن سے متعلق نہیں لیکن شاذونادر اردو میں بھی صوت رکن کا بل وزن پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اس مجموعے کے ایک اور مضمون میں اس کی تفصیل دی ہے۔ اپنا ایک حالیہ تجربہ پیش کرتا ہوں۔ ایک مزاحیہ غزل کے لیے ایک شعر کہا

طالبِ فلم کو اب کہنے لگے طالبِ علم جو نہ کچھ بولے اسے لیکچرر کہتے ہیں

دوسرے مصرع میں لیکچرر کی ے طویل یائے لین ہے۔ مصرع وزن کے بالکل مطابق ہے۔ بولے کی ے کے علاوہ کوئی حرف گرایا نہیں گیا۔ اس کے باوجود لیکچرر کے صوت رکن 'لیک'، پر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مصرع کی گردن ٹوٹ گئی ہو یا کسی جھونپڑی کی ایک دیوار بیٹھ گئی ہو۔ میں نے غور کیا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ پتہ چلا کہ بل کے غلط وقوع نے یہ گل کھلایا ہے۔ مصرع کا وزن ہے فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن۔ لیکچرر 'تن فعلا' کے برابر آتا ہے۔ 'تن فعلا' میں 'تن'، بغیر بل کا صوت رکن ہے اور 'لا'، بل دار۔ لیکچرر میں لیک پر بل ہے اور آخری صوت رکن رر پر ثانوی بل جسے بل کا فقدان ہی سمجھیے۔ بحر اور مصرع کے صوت رکنوں میں بل کی اس عدم مطابقت نے ایک موزوں مصرع میں سکتے کی حالت پیدا کی ہوئی ہے۔ اردو عروض کی تشکیلِ جدید کی بات سوچی جائے تو صوت رکن پر دھیان دینا ہوگا۔

ان وجوہ سے اہلِ اُردو کو بھی صوت رُکن کے مسئلے پر روگردانی ممکن نہیں۔ اور اگر کوئی وجہ نہ ہو تو بھی علمی پیاس اور جان کاری کی کرید کو آسودہ کرنے کے لیے صوت رکن کے موضوع پر غور کرنا ہوگا۔ صوت رکن کیا ہے اس کا احساس تو تمام ماہرینِ لسانیات کو ہوتا ہے لیکن اس کی تعریف کیوں کر کی جائے اور اس کے تعین کا کیا طریقہ ہو اس میں آ کر سب الجھ جاتے ہیں۔ اس سے متعلق کئی نظریے ہیں جن میں سے زیادہ اہم درج کیے جاتے ہیں۔

(۱) قدیم ترین نظریہ یہ تھا کہ ایک لفظ میں جتنے مصوتے ہوں اتنے ہی صوت رُکن ہوتے ہیں۔ لیکن بعض زبانوں میں ایسے الفاظ ہوتے ہیں جن میں کوئی مصوتہ ہی نہیں ہوتا مثلاً بعض افریقی یا ریڈانڈین زبانوں میں۔ امریکی زبان Bella Coola میں بغیر مصوتے کے الفاظ عام ہیں۔ چیک زبان کے ذیل کے جملے میں کوئی مصوتہ نہیں۔

Strc prst skrz brk

مجھے معلوم نہیں کہ اس جملے کے الفاظ کا کیا تلفظ ہے۔ جملے کے معنی ہیں 'گلے میں انگلی دباؤ'، کیا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ لفظ اور یہ جملہ بغیر صوت رُکن کے ہیں۔ چونکہ کوئی لفظ بغیر صوت رکن کے نہیں ہو سکتا اس لیے ماننا ہوگا کہ مصمتہ بھی صوت رکن کا مرکز ہو سکتا ہے۔ ایسے مصمتوں کو صوت رکنی مصمتہ Syllabic Consonant کہتے ہیں۔ انگریزی میں اس قسم کے تین مصمتے م۔ ن۔ ل۔ ہیں جو لفظ کے آخری مصمتی خوشے (Cluster) میں صوت رُکن بن جاتے ہیں مثلاً بٹن بوٹل۔ برٹن میں۔ ان الفاظ میں آخری سے پہلا مصمتہ ساکن ہے جس کی وجہ سے ن اور ل ماقبل ٹ سے زیادہ نمایاں ہو کر صوت رکنی بن گئے ہیں۔

دوسری طرف جڑواں مصوتے (Diphthong) میں دو مصوتوں کے باوجود ایک ہی صوت رکن رُکن ہوتا ہے۔ خالی مصوتے کو غیر صوت رکن (Non-Syllabic) یا مصمتی مصوتہ (Con-sonantal vowel) کہتے ہیں۔ آگے چل کر ان صورتوں پر مزید غور کیا جائے گا۔

(۲) دوسرا مشہور نظریہ یہ ہے کہ صوت رکن وہ جزوِ لفظ ہے جو سانس کی ایک جھونک یا ایک جھٹکے میں ادا ہو۔ سانس کی ایک جھونک میں کتنی آوازیں ادا ہوئیں یہ قائل کے سامع کے احساس پر مبنی ہے۔ مشین سے سانس کا گراف لیا گیا تو معلوم ہوا کہ فطری طریقے سے بولنے پر صوت رکن کی حد پر سانس کے ٹکڑے نہیں ہوتے۔

(۳) تیسرا قابلِ قدر نظریہ اسٹیٹ سن (Stetson) کا ہے جو انھوں نے بہت پہلے

پیش کیا تھا اور اسے پھر سے اپنی کتاب Motor Phonetics (۱۹۵۱ء) میں تفصیل سے درج کیا۔ آواز کا سانس سے تعلق ہے۔ تنفس سے متعلق ہمارے سینے میں دو مشینیں ہیں پہلی ایک جھلی (Diaphragm) ہے جو اوپر نیچے ہل کر پھیپھڑوں کی خلا کو گھٹاتی بڑھاتی ہے۔ یہ ہر سانس کے ساتھ ایک رفتار سے چلتی رہتی ہے۔ دوسرا آلہ ہمارے اعصاب ہیں جو پسلیوں کے درمیان طرفین میں پھیلے ہوئے ہیں۔ بولتے وقت ان کی جنبش سانس کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی بلکہ ایک سانس میں کئی بار عمل میں آتی ہے۔ لفظ میں جتنے مصوتے یا گونج دار مصمتے ہوتے ہیں ان کو ہوا مہیا کرنے کے لیے یہ اعصاب اتنی ہی بار جنباں ہوتے ہیں اور یہی لغزیرہ ہے۔ کئی بڑے بڑے ماہرینِ لسانیات اس نظریے کے حامی ہیں۔ اس میں خرابی یہ ہے کہ یہ صوت رکن کو مشینی اکائی (motor unit) بنا دیتا ہے۔ اس کے مطابق صوت رکن کی تعین مشین ہی سے ہو سکتی ہے۔ انسانی مشاہدہ اور لسانی حس بے کار ہو جاتی ہے۔ ہم ایسا نظریہ چاہتے ہیں کہ اپنے شعور سے صوت رکن تعین کر سکیں۔

۴۔ چوتھا اہم نظریہ آواز کی گونج یا بلند آہنگی کا ہے۔ بعض آوازیں دور سے زیادہ سنائی دیتی ہیں بعض کم۔ گونج دو باتوں پر منحصر ہے۔ صوتی تاروں کا ارتعاش جس کے معنی ہیں کہ مصیتی آوازیں غیر مصیتی سے زیادہ گونج دار ہوتی ہیں۔ دوسرے سانس کے اجرا کے وقت گونج کے حجرے کی مکانیت جس کے معنی ہیں کہ آوازوں کے ادا کرنے میں منھ جتنا زیادہ کھلتا ہے گونج اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔ گونج دار آواز ایک چوٹی ہوتی ہے جس کے آس پاس کم گونج والی آواز کی گھاٹیاں ہوتی ہیں ہر لفظ میں جتنی چوٹیاں ہوں گی اتنے ہی صوت رکن ہوں گے۔ مصوتے مصمتوں سے زیادہ سنائی دیتے ہیں اور مصوتوں میں بھی نیچے کے مصوتے اوپری مصوتوں سے زیادہ زور دار ہوتے ہیں۔ مصمتوں میں مصیتی آوازیں غیر مصیتی آوازوں سے زیادہ بلند ہوتی ہیں۔ پہلوی، غنائی، صیفری اور بندشی آوازوں میں اسی اعتبار سے گونج کی کمی ہوتی ہے۔ ہم بیشتر آوازوں کو یوں[۵] ترتیب دے سکتے ہیں۔ سب سے پہلے زیادہ گونج دار آواز ہے اور پھر اس سے درجہ بدرجہ کم۔

۱۔ آ۔ اَے۔ اَو۔ اِے۔ اُو۔ ای۔ اُو۔ اِ۔ اُ۔ اَ۔

۲۔ ی۔ و

۳۔ ر۔ ل۔ ڑ

۴۔ ں (ङ) ن۔ م

۵۔ ز۔ ژ۔ غ

۶۔ ب ۔ د ۔ ڈ ۔ ج ۔ گ ۔ ق

۷۔ ف ۔ س ۔ ش ۔ خ ۔ ہ

۸۔ پ ۔ ت ۔ ٹ ۔ ک ۔ چ ۔

گونج کی اس درجہ بندی کی صحت کے بارے میں دعویٰ نہیں کیا جا سکتا لیکن موٹے طور سے اسی سے کام چلایا جا سکتا ہے۔ کچھ مستثنیات کے علاوہ بیشتر آوازوں کی گونج ان کے طول کے تناسب سے ہے یعنی جن آوازوں کو بولنے میں زیادہ وقت لگتا ہے ان میں گونج بھی زیادہ ہوتی ہے فرق یہ ہے کہ مصیتی بندشیوں کو ادا کرنے میں غیر مصیتی کے مقابلے میں کم وقت لگتا ہے لیکن گونج زیادہ ہوتی ہے اب اگر ہم نقشے کے مطابق کسی لفظ کے حروف پر نشان لگائیں تو کچھ چوٹیاں اور گھاٹیاں نمایاں ہو جائیں گی مثلاً شَستر (ہتھیار) ۔ آئینہ ۔
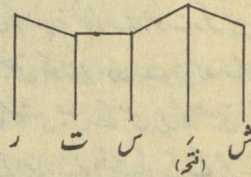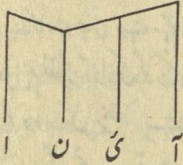
اس طرح معلوم ہو گیا کہ شَستر اور آئینہ میں دو دو صوت رکن ہیں لیکن بعض اوقات مشکل ہو جاتی ہے مثلاً ملاحظ ہو معاً ۔ معاف ۔ آئینہ ۔
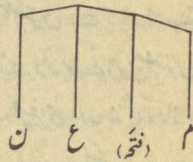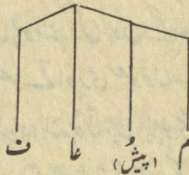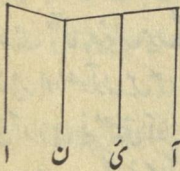
اس طرح معاً اور معاف میں ایک ایک اور آئینہ میں دو صوت رکن دکھائی دیتے ہیں حالانکہ ہمارا شعور بتاتا ہے کہ معاً اور معاف میں دو دو اور آئینہ میں تین صوت رکن ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ان تینوں الفاظ میں پہلے اور دوسرے مصوتے کے بیچ انقطاع (*Hiatus*) ہے جو فصل کا کام کر رہا ہے۔ آئینہ میں جڑواں مصوتہ ہے۔ آئینہ میں آ اور ئ کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی ہے جس کی وجہ سے ئ اپنا وجود منوانے پر تلی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض گونج کا اصول لغریزے کی تعین کے لیے ناکافی ہے۔

اس قسم کی الجھنوں کو دیکھ کر کئی علمار نے فیصلہ کر دیا کہ صوت رکن کا قطعی تعین نہیں ہو سکتا۔ یہ محض شخصی شعور کی تخلیق ہے۔ لیکن اردو اور ہندی کی حد تک ایسی مشکل نہیں۔ ان میں صوت رکن کی تعین کے لیے میں ذیل کے علمی اصول پیش کرتا ہوں:

ایک لفظ میں اتنے ہی صوت رکن ہوں گے جتنے اس میں مصوتے ہیں۔ سوائے حسب ذیل صورتوں کے۔

الف اگر دو مصوتے یک جان ہو کر جڑواں مصوتے کے طور پر آتے ہیں تو ان میں سے ایک ہی مصوتہ صوت رکن کی چوٹی ہوگا، دوسرا محض مصمتی مصوتہ ہوگا۔ اردو کے جڑواں مصوتوں پر ایک تفصیلی مضمون اسی مجموعے میں شامل ہے۔

ب اگر لفظ کے آخر میں مصمتی خوشہ ہو اور اس میں آخری مصمتہ صوت رُکنی ہو۔ یعنی اس خوشے کا دوسرا مصمتہ پہلے مصمتے سے زیادہ گونج دار ہو

اردو اور ہندی کے علمائے لسانیات صرف دو جڑواں مصوتوں ائی اور اؤ کی بات کرتے ہیں حالاں کہ ہم کم از کم ذیل کے ۱۶ جڑواں مصوتے استعمال کرتے ہیں۔

۱۔	e:i	اِے ئی	کشتی کھیئی (بروزنِ فاع)
۲۔	e:o	اِے وُ	تم کشتی کھیؤ (بروزنِ فاع)
۳۔	e:u	اِے وُ	جنیؤ (بروزنِ فعول)
۴۔	ɛ:e	اِے ئے	روپیے
۵۔	o:i	او ئی	روئیے۔ کھوئی (بروزنِ فاع)
۶۔	o:e	اُو ئے	کوئلہ
۷۔	o:u	اُو ؤ	ع حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
۸۔	ai	آئی	آئنہ
۹۔	ae	آئے	ع آئے ہے بے کسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ
۱۰۔	ao	آؤ	ع شیخ جی آؤ مصلّیٰ گروِ جام کرو۔
۱۱۔	u:i	اُو ئی	دل جوئی۔ سوئیاں
۱۲۔	ui	اُئی	گھئیاں (ایک سبزی جس کا دوسرا نام اروی ہے)
۱۳۔	əi	اَئی	تیّار

۱۴۔ ə u او کوّا

۱۵۔ ə e اَئے ؎ کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق

۱۶۔ ə o اَؤ شعلۂ و شبنم (بروزنِ مفتعلن فع)

ان میں ۱ تا ۱۲ میں پہلا مصوتہ صوت رکن کی چوٹی ہے جب کہ دوسرا مصمتی ہے۔ آخری چار میں دوسرا مصوتہ صوت رکن کی چوٹی ہے اور پہلا مصوتہ محض مصمتی ہے۔

کیا اُردو اور ہندی میں صوت رکنی مصمتے ہیں۔ میرے علم میں کسی نے اس کی نشان دہی نہیں کی ڈاکٹر کیلاش چند بھاٹیہ نے ہندی صوتیوں پر اپنے مضمون[۱] (ہندی) میں، نیز ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری[۲] نے شستر (ہتھیار) اور سواستھیہ جیسے الفاظ کو ایک صوت رُکن قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر اودے نراین تواری نے بھی سواستھیہ، ورتسیہ، استر کو واحد صوت رکن کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان علماء کے برعکس میں ان سب الفاظ کے آخری مصمتے کو صوت رکنی مانتا ہوں اور اس طرح ان الفاظ میں دو صوت رکن قرار دیتا ہوں۔ لفظ کے آخری مصمتی خوشوں میں اگر دوسرا رکن پہلے رکن سے کافی زیادہ گونج دار ہے تو وہ تلفظ میں باہر کو لٹک جائے گا۔ اسے ادا کرنے میں اس کے بعد آدھی ماترا یا شاید اس سے بھی کم کا فتحہ شامل ہو جائے گا۔ ذیل کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

۱۔ عقل۔ نقل۔ قتل

۲۔ سقم۔ حکم۔ ختم

۳۔ رکن۔ متن (بہ سکونِ تا)۔ سَوپن (ہندی لفظ بہ سکونِ پا)

۴۔ مکر۔ ہزبر۔ عطر۔ ہجر۔ شستر (ہتھیار)

۵۔ ہجو۔ عفو

۶۔ مدھیہ۔ راجیہ۔ شاکیہ۔ سواستھیہ۔ مہتیہ (مچھلی)

۷۔ صبح۔ فتح۔ صلح۔ شرح

ان سب الفاظ کے آخر میں مصمتی خوشہ ہے۔ میرے تلفّظ اور میری رائے میں ان سب کا آخری مصمتہ صوت رکنی ہے۔ اس طرح اُردو اور ہندی میں ی۔ و۔ ہ۔ (ح) ر۔ ل۔ م۔ ن۔ سات صوت رکنی مصمتے ہیں۔ پیچھے مختلف مخارج کی آوازوں کی گونج کی درجہ بندی کی گئی تھی اسے نظر میں رکھ کر دیکھیے تو مندرجہ بالا مثالوں کے آخری مصمتے اپنے پیش رو مصمتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ گونج دار ہیں۔ بندشی اور ایفرکیٹ مصمتوں میں سب سے کم گونج ہوتی ہے۔ اوپر کی مثالوں میں بیشتر میں

آخری مصمتے سے قبل بندشی یا الیفرکیٹ ہے۔

مغربی صوتیات میں ی۔ و۔ نیم مصوتے ہیں۔ سنسکرت صوتیات میں ی۔ ر۔ ل۔ و کو ایک گروہ میں رکھ کر انتستھ کہتے ہیں۔ ر۔ ل۔ کی گونج کو بھی ی۔ و۔ کے لگ بھگ مان لیجیے۔ غنائیوں م۔ ن۔ کی گونج مسلمہ ہے۔ شرح اور صلح کی ح ضرور چکرا رہی ہے کیوں کہ ہمارے نقشے کے مطابق ا۔ ل۔ میں ح سے زیادہ گونج ہے۔ پھر ح ان کے مقابلے میں کیوں ابھر رہی ہے۔ ممکن ہے ہم نے ح کی گونج کی تعین میں غلطی کی ہو۔ شاید ہ بھی ی اور و کی طرح نیم مصوتہ ہو۔ مہنگا۔ لہنگا۔ مہنگی مہنگائی۔ بہنگی۔ مہندی۔ ان چھ لفظوں میں ھ کا وقوع ؟ سے پہلے ہے۔ انگ انوسوار ہے۔ انوسوار کے معنی ہیں سُوَر یعنی مصوتے کے بعد آنے والا۔ صرف ان چھ لفظوں میں انوسوار کے قبل مصوتہ نہیں۔ کیا یہاں ھ نیم مصوتہ ہے؟

ہار اور صلح کی ح میں مجھے فرق دکھائی دیتا ہے۔ آخری مصمتی خوشے میں آنے والی آخری ح ہار کی ہ سے زیادہ نمایاں اور گونج دار ہے۔ اس لیے یہ صوتیہ /ہ/ کی ایک علیحدہ ذیلی صورت ہے۔ میں نہیں جانتا کہ گونج کے لحاظ سے ھ کی مختلف قسموں کو کہاں مقام دیا جائے لیکن میری لسانی حس یہ گواہی دیتی ہے کہ صبح۔ فتح۔ صلح۔ شرح کی ح لغریزی ہے۔ ماقبل ساکن کی وجہ سے اس کے بعد نہایت مختصر مصوتہ اَ (فتحہ) بولنا پڑتا ہے۔ آلات سے اس کے وجود کا ثبوت مل سکتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ مندرجہ بالا سات صوت رکنی مصمتوں کا لفظ کے آخری مصمتی خوشے میں آنا لازماً ان کو صوت رکنی گردانے کی دلیل نہیں۔ اہم یہ ہے کہ یہ کس مصمتے کے بعد آئے ہیں۔ وصل۔ علم شرم۔ حسن۔ قصر۔ حشر میں آخری مصمتہ صوت رکنی نہیں۔ نقل۔ سقم وغیرہ میں یہ صاف صاف صوت رکنی ہے لیکن بعض صورتوں میں واضح نہیں ہوتا کہ آخری مصمتہ صوت رکنی ہے کہ نہیں۔ مثلاً حمل (بہ سکونِ م) جبس۔ عضو۔ حشو میں۔ آلات کی مدد سے مختلف مصمتی خوشوں کی گونج کی چھان بین کرنے کی ضرورت ہے۔

مکمل صوت رکن کے تین حصے ہوتے ہیں، مبدا، چوٹی، اخیریہ۔ کام اور کریں وسطی مصوتہ چوٹی ہے جس کے اِدھر اُدھر مبدا اور اخیریہ ہیں۔ یہ تینوں حصے سادہ یعنی ایک آواز کے بھی ہو سکتے ہیں اور مرکب یعنی ایک سے زیادہ آواز کے بھی۔ مرکب کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

مرکب مبدا۔ پیار۔ کلب۔ سوراجیہ۔ فرانس۔ بلیڈ۔ پلیٹ۔ شرم زان

مرکب چوٹی۔ فائدہ۔ روئی۔ آئنہ۔

مرکب اخیریہ۔ وصل، دوست، راسب، سلب

اردو ہندی صوت رکن میں چوٹی کا ہونا ضروری ہے۔ بقیہ اجزاء میں سے کوئی بھی موجود یا معدوم ہو سکتا ہے مثلاً

مبدا اور چوٹی۔ جا۔ کی

چوٹی اور اخیریہ۔ آم۔ آن

صرف چوٹی۔ آ۔ ایمان کا پہلا صوت رکن ای

لفظ میں صوت رکنوں کی تقطیع اور حد بندی اکثر اوقات واضح ہوتی ہے لیکن بعض صورتوں میں مشکل بلکہ محال ہوتی ہے۔ ذیل کی صورتوں میں صوت رکنی حدود صاف دکھائی دیتی ہیں۔

۱۔ ایک صوت رکن کے اخیریے کے بعد دوسرے کا مبدا ہو۔ مثلاً کرنا۔ خیر خواہ۔ بعض صورتوں میں چوٹی کے بعد دوسرے صوت رکن کا مبدا ہو سکتا ہے۔ مثلاً جانا۔

۲۔ دو صوت رکنوں کے بیچ اتصال (Juncture) ہو۔ اتصال ایک مختصر توقف ہے اس کی سب سے مشہور قسم داخلی کھلا اتصال (Internal open Juncture) ہے۔ انگریزی میں اس کی مشہور مثال Nitrate کے مقابل Night + rate ہے۔ آخرالذکر میں داخلی کھلا اتصال ہے۔ اردو میں پیلی اور نیلی کے مقابل پی + لی اور نی + لی میں ایسا اتصال ہے اتصال کی ایک قسم کو صوت رکنی اتصال (Syllabic Juncture) کہتے ہیں۔ اردو میں اگر ابتدائی صوت رکن کے بعد کوئی صوت رکن چوٹی سے شروع ہو تو اس کے قبل صوت رکنی اتصال ہوگا۔ مثلاً

قر + آن = قران	مس + عود = مسعود
مَ + عاً = معاً	مُ + عاف = معاف
مَ + آل = مآل	مے + عاد = میعاد
فا + عل = فاعل	

ندی کے مقابل میں نہ + دی کا اتصال مارفیمی بھی ہے صوت رکنی بھی۔ اس اتصال کی مقدار نہایت قلیل ہے۔ انگریزی میں اتنے مختصر اتصال کو (micro juncture) اقلی اتصال کہیں گے۔

ذیل کی صورت میں صوت رکنوں کی حدود بالکل گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ انگریزی میں دو صوت رکنوں کا لفظ Coming ہے۔ صوت رکن کی سرحد پہلے ہو کہ بعد میں۔ م پہلے صوت رکن کا جزو

ہے کہ دوسرے کا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پہلے صوت رکن کا اخیر یہ اور دوسرے کا مبدا معلوم ہوتا ہے۔

ع یہ زاہدِ مکّار اِدھر بھی ہے اُدھر بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ م دونوں صوت رکنوں میں مشترک ہے۔ ایسی آواز کو دخلیہ (Interlude) کہتے ہیں۔ اُردو میں نظر جیسے لفظ میں یہی صورت ہے لیکن کیا مزا میں ز کو بھی دخلیہ قرار دیں۔ مزا میں دوسرے صوت رکن کی چوٹی (آ) کا طول یا وسعت پہلے صوت رکن کی چوٹی (فتحہ) سے زیادہ ہے۔ اس پر بل بھی ہے اس لیے ز صریحاً دوسرے صوت رکن کی طرف مائل ہے۔ ایسے موقعوں پر میں ز کو دخلیہ قرار دینے کے بجائے دوسرے صوت رکن کے ساتھ رکھنے کو ترجیح دوں گا اور مزا کے دونوں صوت رکن م : زا۔ قرار دوں گا۔

کیا یہی طریقہ نظر میں ممکن نہیں ؟ یاد رہے کہ انگریزی کے برخلاف اُردو میں صوت رکن کا بل باقاعدہ ہے اور یہ صوت رکن کے طول پر منحصر ہوتا ہے۔ صوت رکنوں پر بل کے اصولوں کا نچوڑ یہ ہے:

۱۔ اگر لفظ میں سب صوت رکنوں کا طول برابر ہے تو آخری سے پہلے پر بل ہوگا۔

۲۔ اگر ایک صوت رکن بقیہ سے طویل تر ہے تو طویل تر صوت رکن پر بل ہوگا۔

۳۔ اگر ایک سے زیادہ صوت رکن بقیہ سے زیادہ طویل ہیں اور ان طویل صوت رکنوں کا طول آپس میں برابر ہے تو موخر الذکر میں آخری سے پہلے پر بل ہوگا۔

نظر میں دوسرے صوت رکن پر بل ہے۔ بل کی وجہ سے دوسرے صوت رکن کا مصوتہ پہلے صوت رکن کے مصوتے کے مقابلے میں یکسانیت کے باوجود زیادہ طویل ہے۔ چوں کہ نظر میں بل دار صوت رکن طویل تر ہونا چاہیے اس لیے ظ کو دوسرے صوت رکن کا جزو ماننے میں کوئی ہرج نہیں۔ میں نظر کے دو صوت رکن ن ۔ ظر ۔ کرنے میں کوئی قباحت نہیں دیکھتا۔ نظر میں ظر بالکل فطری اور مکمل طریقے پر ملفوظ ہوتا ہے۔ فرض کیجیے ایک لفظ 'نظ' ہے۔ اس میں ن اور ظ میں جو رواں اور مضبوط رشتہ ہے وہ دوسرے لفظ نظر کے ن اور ظ میں ڈھیلا اور کمزور معلوم ہوتا ہے لیکن ظر کے دونوں اجزا میں اس بندش میں کوئی فرق نہیں۔ یعنی دوسرے مصوتے نے ظ اور ر کو یوں کسا ہوا ہے کہ ظ اس کی چوٹی کا مبدا معلوم ہوتا ہے۔ پہلے مصوتے نے ن اور ظ کو یوں نہیں کسا کہ ظ ماقبل مصوتے کا اخیر یہ معلوم ہو۔ لازمی نہیں کہ اُردو میں خواہ مخواہ دخلیے کا وجود پیدا کر کے پیچیدگیاں کھڑی کی جائیں۔

اُردو صوت رکن کے موضوع پر یہ ابتدائی مشاہدات ہیں۔ ضرورت ہے کہ علمائے لسانیات اس

مسئلے پر مزید غور و خوض کریں بلکہ لیبوریٹری ہیں ان کی صحیح تعین و تقطیع کریں۔ میں صرف اتنا کہوں کا ہم صوت رکنوں کی طرف سے چشم پوشی نہیں کر سکتے۔ مولیر کا کردار چالیس سال تک نثر بولا کیا لیکن اس سے آشنا نہ تھا۔ جب اسے اس کا عرفان ہوا تو وہ متحیر رہ گیا۔ ہم تو مولیر کے اس کردار سے بہت آگے کے زمانے میں بڑھ چکے ہیں۔ ہمارا کلام صوت رکنوں کا مجموعہ ہے۔ صرف اس وجہ سے ہمیں ان کے بارے میں سب کچھ جاننا چاہیے۔

حوالے

۱؎ بھاشا وگیان (ہندی) از ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری۔ طبع چہارم ص ۳۵۹

۲؎ اردو عروض اور لفظی بل

۳؎ بھاشا وگیان از تواری ص ۲۷۰

۴؎ Gleason: An Introduction to Descriptive Linguistics.
طبع ۱۹۶۱ء ص ۲۵۵

۵؎ یہ درجہ بندی انگریزی کتاب Language and Language by Graft
کے ایک بیان میں ترمیم کرکے تیار کی گئی ہے۔

۶؎ مضمون مشمولہ راج رشی ابھی نندن گرنتھ

۷؎ بھاشا وگیان ص ۲۶۰

۸؎ بھاشا شاستر کی روپ ریکھا (ہندی) طبع اوّل ص ۱۲۶

۹؎ Hocbett: A Manual of Phonology 1955. P. 52.

اردو میں بَل اور زور

ہندی میں انگریزی لفظ Stress کا ترجمہ بَلاگھات کیا گیا ہے۔ اردو میں ہم اسے بَل کہیں گے۔ بظاہر اُردو میں اس کا ترجمہ زور ہونا چاہیے لیکن زور تو ہم (Emphasis) کے لیے مخصوص کردیں گے۔ (Stress) صوتیات کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ اس کے لیے نسبتاً اجنبی لفظ بل زیادہ مناسب ہے۔ بلند آوازی کے لیے سُر کی بلندی کی اصطلاح استعمال کی جاسکتی ہے جو انگریزی لفظ Pitch سے متعلق ہے۔

بَل دار صوت رکن[1] (Syllable) یا لفظ کے ادا کرنے میں پھیپھڑے زیادہ قوت سے زیادہ ہوا باہر پھینکتے ہیں۔ ایک سے زیادہ رکن والے لفظ میں بعض رکن بَل دار ہوتے ہیں بعض بغیر بَل کے۔ جملے کے اندر بعض الفاظ میں بَل ایک رکن سے دوسرے رکن پر منتقل ہوجاتا ہے۔ بعض اوقات بل کی مقدار کم و بیش ہوجاتی ہے۔ لفظ کے ارکان کے بَل کے مطالعے کو لفظ کا بَل کہتے ہیں۔ جس لفظ کے کسی رکن پر بَل ہوتا ہے اس پورے لفظ کو بل دار کہا جاتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک جملے میں ایک مخصوص لفظ پر بَل ہے، دوسرے جملے میں نہیں۔ جملے میں لفظوں کے بَل کے تعین کو جملے کا بَل کہتے ہیں۔ ان اوراق میں خاص طور سے لفظ بَل کا مطالعہ مقصود ہے۔

بل دار رکن یا لفظ میں سُر کی بلندی (High Pitch) ضروری نہیں۔ سینے کی ہوا جب صوتی تاروں کی تنگ نائے سے باہر نکلتی ہے تو ان تاروں میں کپکپاہٹ ہوتی ہے۔ یہ کپکپاہٹ جتنی زیادہ ہوگی آواز اتنی ہی بلند ہو جائے گی۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا بَل نام ہے تنفس کے شدت سے خارج ہونے کا۔ یہ پھیپھڑوں کا عمل ہے۔ سُر کی بلندی صوتی تاروں سے متعلق ہے اس لیے دونوں میں سبب اور نتیجہ کا تعلق نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جب بل دار رکن کے لیے ہوا زیادہ قوت کے ساتھ زیادہ مقدار میں نکلتی ہے تو اکثر اوقات صوتی تاروں میں بھی زیادہ ارتعاش پیدا کردیتی ہے

---

[1] آیندہ اس مضمون میں صوت رکن کی مختصر شکل 'رکن' استعمال کی جائے گی۔

جس کی وجہ سے بل دار رکن میں سُر کی بلندی بھی آجاتی ہے لیکن یہ ہمیشہ نہیں ہوتا۔ لفظ دُنبال میں پہلا رُکن بغیر بل کے ہے دوسرا بل دار ہے۔ ہمارے لیے بالکل ممکن ہے کہ ہم بغیر بل کے رکن کو بلند تر سُر میں اور بل دار رُکن کو نسبتاً آہستہ بول دیں۔ یہ تلفظ بالکل مصنوعی معلوم ہوگا لیکن ممکن ضرور ہے۔ اس تجربے سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ بل اور بلند سر کا ساتھ لازمی نہیں۔

کچھ آوازیں دوسری آوازوں کی نسبت زیادہ نمایاں Prominent ہوتی ہیں ان میں نسبتاً زیادہ گونج Sonority ہوتی ہے جس کی وجہ سے یہ زیادہ دور سے سُنائی دیتی ہیں۔ رکن آوازوں کا وہ سلسلہ ہے جس میں اس نمایاں پن کی ایک چوٹی (Peak) ہو۔ لفظ میں ایک یا زیادہ رکن بقیہ ارکان سے زیادہ نمایاں ہو سکتے ہیں۔ یہ نمایاں ہونا بل کا مترادف نہیں۔ بل اس کے کئی اسباب میں سے ایک ہیں۔ نمایاں ہونا آواز کے جبلی وصف کے علاوہ طول، بل اور سُر کی بلندی (High pitch) میں سے کسی ایک عنصر یا کئی عناصر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بل مفرد وصف ہے۔ دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً لفظ آسمان کے دوسرے رکن میں (آ) کی آواز نمایاں ہے لیکن اس پر بل نہیں۔

زور (Emphasis) جملے میں محض ایک لفظ پر ہوتا ہے یا بالکل ہی نہیں ہوتا۔ جس لفظ پر زور ہوتا ہے وہ زیادہ نمایاں بھی ہوتا ہے۔ لفظ پر زور۔ طول۔ بل یا سُر میں سے کسی ایک یا کئی کو بڑھا دینے سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ اکثر بل کی زیادہ شدت اور سُر کی زیادہ بلندی کے امتزاج کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بل اور زور میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ زور ایک لفظ یا فقرے پر ہوتا ہے۔ بل جملے میں کئی لفظوں پر ہوتا ہے جو مسلسل بھی ہو سکتے ہیں منتشر بھی۔ مثلاً یہ جملہ ملاحظہ ہو۔

کیا محمود نے اسکول میں آج پھر شرارت کی؟

اس جملے میں 'پھر' پر زور ہونے کا امکان ہے لیکن بل پانچ الفاظ محمود۔ اسکول۔ آج پھر۔ شرارت پر ہوگا۔

بل کی کچھ نہ کچھ مقدار ہر رکن پر ہوتی ہے کیوں کہ ہر رکن کی ادائیگی میں کسی قدر طاقت تو صرف ہوتی ہی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہر رکن کی ادائیگی میں یکساں طاقت بروئے کار نہیں آتی یعنی

لے An Outline of English Phonetics از ڈینیل جونز ۱۹۵۶ء ص ۲۹۷

بل کے مختلف درجے ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک لفظ میں جتنے رکن ہوں گے اتنے ہی بل کے درجات ہوں گے۔ مثلاً ڈینیئل جونز[1] نے انگریزی لفظ opportunity کے پانچ ارکان پر بل کے پانچ مختلف درجے متعین کیے لیکن بعد میں اس موشگافی کو خود ہی ترک کر دیا۔ بل کے بہت سے درجات کا تعین ناقابل عمل بھی ہے، غیر ضروری بھی اور الجھن بھی پیدا کرتا ہے۔ اس لیے عام دستور یہ ہے کہ بل کے تین درجے متعین کر لیے جاتے ہیں۔ سب سے نیچا بل بہت نحیف ہوتا ہے۔ سہولت کے لیے اسے بل کا فقدان مان لیا جاتا ہے۔ تنفس میں اس سے زیادہ سعی کی جائے تو اسی کو بل کا قرار دیں گے۔ بڑے بل کو خاص بل (Primary stress) اور اس سے کم کو ثانوی بل کہتے ہیں۔ تیسرے درجے کے بل والے ارکان کو بغیر بل کا کہتے ہیں۔ خاص بل والے رکن کے اوپر سیدھا زبر (ˊ) اور ثانوی بل والے رکن پر الٹا زبر (ˋ) بنا دیا جاتا ہے۔ بغیر بل والے رکن پر کوئی نشان نہیں بنایا جاتا۔ مثلاً صوتیاتی انداز میں "برخوردار" لکھیں تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ تیسرے رکن پر بل ہے۔ اردو رسم الخط میں چوں کہ لفظ کے تمام رکن ملے جلے زیر و زبر ہوتے ہیں اس لیے بل کو نشان کے ذریعے واضح کرنا بڑا مشکل ہے۔

انگریزی میں بل ایک صوتیہ ہے۔ وہاں لفظ میں بل کے انتقالِ مقام سے مفہوم بدل جاتا ہے مثلاً Increase، Conflict وغیرہ میں پہلے رکن پر بل دیا جائے تو اسم کے معنی ہوتے ہیں، دوسرے رکن پر بل ہو تو فعل مراد لیا جائے گا۔ اردو میں بل مفہوم پر اثر انداز نہیں ہوتا اس لیے اس کی اس قدر اہمیت نہیں لیکن اس کا وجود ہے ضرور۔ کیا ہم اسے بل نہ کہہ کر رکن کا نمایاں پن قرار دے سکتے ہیں؟ میری رائے میں نہیں۔ رکن میں بل محض تنفس کی زیادہ قوت اور مقدار کا نتیجہ ہے۔ نمایاں ہونا بل کے سبب سے بھی ہو سکتا ہے، طول کے اضافے کی وجہ سے بھی اور سُر کی بلندی کے باعث بھی۔ اردو الفاظ میں ہم جن الفاظ کو بل دار قرار دیتے ہیں ان سب میں واحد قدرِ مشترک تنفس کی تندی ہے۔ ایک لفظ ہے "کرتا" پہلے رکن میں سب سے نمایاں آواز خفیف مصوتہ (فتحہ) کی ہے، دوسرے رکن میں طویل مصوتہ (آ) کی۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے آخر الذکر مصوتہ طول اور کشادگی کے باعث اول الذکر مصوتہ کے مقابلے میں زیادہ نمایاں مانا جاتا ہے لیکن بل پہلے مصوتہ اور پہلے رکن پر ہے، دوسرے پر نہیں۔ یہ بل نوعیت میں انگریزی کے بل سے مختلف ہیں۔

---

[1] An Outline of English Phonetics از ڈینیل جونز ۱۹۵۶ ص ۲۲۰

اگر اُردو میں بَل مفہوم سے بے تعلق ہے تو اس کا مطالعہ کیوں کیا جائے؟ اس کے وقوع کے اُصول دریافت کرنے میں کیوں وقت ضایع کیا جائے۔ الفاظ کے صحیح تلفظ میں بل کی بڑی اہمیت ہے جنھوں نے کسی غیر زبان والے مثلاً روسی یا انگریز کو اُردو بولتے سُنا ہوگا انھیں اس کا تجربہ ہوگا کہ اکثر الفاظ کا تلفظ صحیح ہونے کے باوجود بات کچھ اجنبی سی، اکھڑی اکھڑی سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ ناہمواری لفظ کے ارکان میں بل کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ ولایت اور امریکہ جانے والے ہندوستانیوں کو کبھی کبھی یہ تلخ تجربہ ہوتا ہے کہ بڑی فصیح انگریزی بولنے کے باوجود ان کے بعض الفاظ یا فقرے اہلِ زبان کے لیے ناقابلِ فہم رہتے ہیں۔ یہ سب غلط ارکان پر بل دینے کا نتیجہ ہے۔

انگریزی میں الفاظ کے بل کے وقوع میں اس قدر بے اصولی ہے کہ بقول ڈینیل جونز[1] اس کے کوئی قواعد مرتب ہی نہیں کیے جا سکتے۔ تمام الفاظ کے بل کو فرداً فرداً سیکھنا پڑتا ہے۔ غنیمت ہے کہ اُردو میں ایسی افراتفری نہیں۔ اُردو الفاظ میں بل کے وقوع کے اصول سب سے پہلے ڈاکٹر زور[2] نے اور ان کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں[3] نے پیش کیے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کتابیں پیرس کی زمین پر وجود میں آئیں۔ اُردو اور ہندی میں بل کے معاملے میں کسی فرق کا سوال ہی نہیں۔ ہندی میں ساگر یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے ڈاکٹر رمیش چندر مہروترا[4] نے اس موضوع پر غور کیا ہے۔ ان حضرات نے بل کو خاص اور ثانوی میں تقسیم نہیں کیا۔ صرف ایک قسم کے بل سے سروکار رکھا ہے۔ ڈاکٹر زور نے دو رکنی اور تین رکنی الفاظ کے بل (خاص بل) کی تعین کے ۳۲ اصول درج کیے ہیں۔ انھوں نے بعض دو رُکنی الفاظ میں دونوں ارکان پر یکساں بل قرار دیا جو اصول اور واقعہ دونوں کے خلاف ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین نے اسے بجا طور پر رد کر دیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک دو اضافوں کے ساتھ ڈاکٹر زور کے اصولوں پر اکتفا کی ہے۔ ان دونوں حضرات نے بل کی جو تعین کی ہے مجھے اس کے بیشتر حصے سے اتفاق ہے لیکن میری رائے میں دو اور تین رکنی الفاظ

ا؎ AN OUTLINE OF ENGLISH PHONETICS ص ۲۴۸

۲؎ HINDUSTANI PHONETICS از ڈاکٹر زور ۱۹۳۰ء ص ۱۲-۱۰۸

۳؎ A PHONETIC AND PHONOLOGICAL STUDY OF WORD IN URDU ۱۹۵۴ء ص ۲۱ تا ۳۶

۴؎ ہندی میں بلاگھات اور سُر لہر مضمون مشمولہ راج رشی ابھی نندن گرنتھ۔ ص ۴۵۲-۴۵۳

کا بل صرف تین اصولوں میں سمیٹا جا سکتا ہے۔ دونوں ماہرین نے تین سے زیادہ ارکان والے الفاظ کے بارے میں صرف چند سطور پر اکتفا کی ہے۔ میری رائے میں یہ الفاظ بھی تفصیلی جائزے کے مستحق ہیں۔

مندرجہ بالا دونوں حضرات کے نتائج سے مجھے بہت کم اختلاف ہے لیکن ڈاکٹر مہروترا کے تجزیے سے کہیں بھی اتفاق نہیں۔ موصوف نے مختلف الفاظ کے جن ارکان پر بَل قرار دیا ہے میری رائے میں بیشتر صورتوں میں ان پر بل نہیں کسی اور جگہ ہے۔ ان کے اصول بھی ناکافی اور نادرست ہیں۔

پونا یونیورسٹی کے ریڈر لسانیات ڈاکٹر اشوک کیلکر نے مراٹھی زبان کے تمام الفاظ کے بَل کو سات اصولوں میں محصور کیا ہے۔ یہ اصول اُردو پر صادق نہیں آتے لیکن اُردو (اور ہندی) میں کم از کم مفرد الفاظ میں بل حیرت انگیز طور پر باقاعدہ ہے۔ ذیل کی سطور میں اسے چند جامع اصولوں میں گرفت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اُردو الفاظ میں بل اور رکن میں ماترا کی تعداد پر منحصر ہے۔ اس اعتبار سے رکن کی تین قسمیں ہیں۔ ماتراؤں کی یہ تقسیم صرف بل کو مدِ نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ ہندی چھند سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

(۱) ایک ماترا کا رکن۔ اس کی دو شکلیں ہیں۔

ا۔ محض ایک خفیف مصوتہ (حرفِ علت) مثلاً اِدھر کا پہلا رکن۔

ب۔ ایک مصمتہ اور اس کے بعد ایک خفیف مصوتہ مثلاً جِدھر کا پہلا رکن۔

ڈاکٹر زور نے اسے 'خفیف رکن' سے موصوم کیا ہے۔ اُردو میں یہ لفظ کے آخر میں نہیں آتا۔ اس کی شناخت یہ ہے کہ اس کے بعد ہمیشہ ایک اور صرف ایک مصمتہ ہوتا ہے۔

(۲) دو ماتراؤں کا رکن۔ اس کی مندرجہ ذیل شکلیں ہو سکتی ہیں۔

I ا۔ خفیف مصوتہ اور ایک مصمتہ مثلاً اِس۔ اب

ب۔ ایک مصمتہ۔ ایک خفیف مصوتہ پھر ایک مصمتہ مثلاً جس۔ جب۔

ڈاکٹر زور نے اس قسم کے رکن کو (Long by position مقام کی بدولت ویل) کہا ہے۔ اس میں دو شکلوں کا اور اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

ج۔ خفیف جڑواں مصوتہ یعنی وہ (diphthong) جس کے دونوں مصوتے خفیف ہوں۔

مثلاً عیّار۔ اوّل کا پہلا رکن۔

د۔ ایک مصمتہ اور اس کے بعد خفیف جڑواں مصوتہ مثلاً تیار۔ کوّا۔ کا پہلا رکن۔

II ا۔ محض ایک طویل مصمتہ مثلاً آنا۔ ایسا کا پہلا رکن۔

ب۔ ایک مصمتے کے بعد ایک طویل مصوتہ مثلاً جانا، کیسا کا پہلا رکن۔

ڈاکٹر زور نے اس قسم کے رکن کو (Long by Nature مزاجاً طویل) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ بُل کے معاملے میں دو ماتراؤں کے رکن کی یہ دونوں قسمیں سو فیصدی صورتوں میں یکساں ہیں اس لیے یہ تقسیم سراسر حشو ہے اور غیر ضروری پیچیدگی پیدا کرتی ہے۔ آئندہ صفحات میں ان تمام صورتوں کو دو ماتراؤں کا رکن کہا جائے گا۔ یہ عروض کے سبب خفیف 'فع' کے برابر ہیں۔

(۳) تین ماتراؤں کا رکن۔ اس کی حسب ذیل سات صورتیں ہیں۔

ا۔ ایک طویل مصوتہ اور ایک مصمتہ مثلاً آم۔

ب۔ ایک مصمتہ، ایک طویل مصوتہ پھر ایک مصمتہ۔ مثلاً نام۔

ڈاکٹر زور نے انھیں Long by nature as well as by position (مزاج اور مقام دونوں کی بدولت طویل) قرار دیا ہے۔ ان میں ذیل کی پانچ قسموں کا اور اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

ج۔ ایک مصمتہ۔ ایک طویل مصوتہ۔ پھر دو مصمتے مثلاً راست۔ زیست۔ سانڈ۔

د۔ ایک خفیف مصوتہ پھر دو یا تین مصمتے مثلاً امن۔ اِندر (راجہ اِندر)

ہ۔ ایک مصمتہ پھر ایک خفیف مصوتہ اور دو مصمتے مثلاً دست۔ مہر۔

و۔ ایک طویل جڑواں مصوتہ یعنی وہ diphthong جس کا پہلا مصوتہ طویل اور دوسرا خفیف ہوتا ہے مثلاً آؤ۔

ز۔ ایک مصمتہ اور اس کے بعد ایک طویل جڑواں مصوتہ مثلاً ناؤ۔ رائے۔

مندرجہ بالا سات صورتیں عروض کے رکن 'فاع' کے برابر ہیں۔ ماتراؤں کی اس تقسیم میں مصوتہ کا اختصار یا طول اور بعد میں آنے والے مصمتے اہم ہیں۔ مصوتے سے قبل ایک یا دو مصوتہ کا عدم و وجود برابر ہے مثلاً آ۔ جا۔ کیا۔ تینوں دو ماتراؤں کے اور ایک۔ سیم۔ پریم۔ تینوں تین ماتراؤں کے رکن ہیں۔

انگریزی میں لفظ کے ڈھانچے کے لیے c (Consonant) v (Vowel) کی

علامتوں سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ اجمال بھی بار دہ ہے۔ آئندہ صفحات میں ذیل کے مخففات استعمال کیے جائیں گے۔

ایک ماترا کے رکن کے لیے ۱
دو ماتراؤں کے رکن کے لیے ۲

جس طرح شعر کے وزن کو ارکانِ افاعیل اور راگ کو سرگم کے پردے میں بیان کیا جاتا ہے اسی طرح لفظ کے ڈھانچے کو اعداد کے پردے میں پیش کیا جائے گا۔ یہ اعداد دائیں سے بائیں پڑھے جائیں گے مثلاً ۲۲۳ سے ایسا لفظ مراد ہوگا جس میں تین رکن ہیں۔ پہلا رکن تین ماتراؤں کا، دوسرا اور تیسرا دو دو ماتراؤں کے ہیں مثلاً ریزگاری. شرمساری۔

بَل کے سلسلے میں اوّل دو کلیے درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ ایک ماترا کے رکن پر نہ خاص بَل آسکتا ہے نہ ثانوی بَل۔ یعنی یہ ہمیشہ بغیر بل کے ہوگا۔

۲۔ دو مسلسل ارکان پر بیک وقت خاص بَل نہیں آسکتا۔ لفظ میں بل توازن Rhythm کی غرض سے ہوتا ہے۔ پاس پاس کے ارکان میں خاص بل توازن کے منافی ہے۔ مفرد اور مرکب الفاظ میں ایسا ممکن نہیں۔ جملے کے اندر دو آزاد الفاظ میں ممکن ہے۔

اب مختلف طول کے الفاظ پر فرداً فرداً غور کیا جائے گا۔

ایک رُکنی الفاظ

ایک رکنی الفاظ اگر تنہا استعمال کیے جائیں تو ان پر بل ہوگا لیکن جملے کے اندر صرف اہم الفاظ پر بل ہوتا ہے غیر اہم پر نہیں۔ اہم سے مُراد وہ الفاظ ہیں جو جملے کے مفہوم کے خاص طور سے حامل ہوں۔ اسم۔ صفت، اشارہی اور استفہامی۔ ضمیر متعلقاتِ فعل اور فعل کا خاص جزو ایسے الفاظ ہیں۔ شخصی ضمیروں پر بعض اوقات بل ہوتا ہے بعض اوقات نہیں۔ حروفِ جار پر عموماً بل نہیں ہوتا۔ جملے میں بَل کے سلسلے میں اس موضوع پر پھر غور کیا جائے گا۔

دو رکنی اور تین رکنی الفاظ

ان الفاظ کے بل کے متعلق ڈاکٹر زور اور ڈاکٹر مسعود حسین نے مفصّل اُصول درج کیے ہیں لیکن پھر بھی الفاظ کے متعدد ڈھانچے نظرانداز ہو گئے ہیں مثلاً فرماں۔ ناز بردار۔ مردانگی۔ جواب دہ۔ تیمار دار۔ سلیمان۔ عربی (بہ فتحتین)۔ سوختنی۔ حسن دوستی۔ تیز خرام۔ آسماں جاہ۔

میں اپنے تلفظ کے مطابق اُردو کے تمام دو رکنی اور سہ رُکنی الفاظ کے خاص بل کو تین کلیوں

میں پابند کرنے کی کوشش کرتا ہوں - ان تینوں کلیوں کا چار رکنی الفاظ پر بھی اطلاق ہوگا۔

۱۔ اگر ایک رکن بقیہ سے زیادہ طویل ہے تو اس پر خاص بل ہوگا۔

۲۔ اگر ایک سے زیادہ ارکان بقیہ سے زیادہ طویل ہیں تو ان طویل ارکان میں آخری سے پہلے رکن پر بل ہوگا۔

۳۔ اگر سب ارکان برابر طویل ہیں تو آخری سے پہلے رکن پر بل ہوگا۔

ثانوی بُل۔ ڈاکٹر کیلکر[ا] نے مراٹھی الفاظ میں ثانوی بُل کے بارے میں ایک عام اصول وضع کیا ہے کہ خاص بل والے رکن سے پہلے ایک رکن چھوڑ کر اگر کوئی رکن ہوگا تو اس پر ثانوی بل ہوگا۔ اردو میں تین رکنی مفرد الفاظ پر اس اصول کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ لاگو کیا جائے گا۔ ہم یوں کہہ سکتے ہیں۔

۴۔ خاص بل والے رکن سے پہلے ایک رکن چھوڑ کر اگر کوئی دو ماتراؤں کا رکن ہے تو اس پر ثانوی بل ہوگا۔ ظاہر ہے کہ تین رکنی الفاظ میں اس اصول کے تحت پہلے رکن ہی پر ثانوی بُل ہو سکتا ہے۔

قبل اس کے کہ ہم ثانوی بل پر مزید غور کریں مندرجہ بالا چاروں اصولوں کو الفاظ کے مختلف سانچوں پر پرکھ کر دیکھ لیا جائے۔

۲ً۲ - آیا۔ کرتا۔ صاحب۔ کوّا۔

۳ً۲۔ روزگار۔ دست کار۔ پائے گاہ۔

۲۲ً - آشنا۔ باولا۔

۱ً۲ - نظر۔ اثر۔ گدا۔ عدد۔

۱ً۳ - جناب۔ سرشت۔

۲۲ً۲۔ ریزگاری۔ زبردستی۔ مہربانی۔

۲ً۱۲ - بندگی۔ انجمن۔

۲ً۱۲۔ سوختنی

[ا] ڈاکٹر کیلکر پونا یونی ورسٹی میں جدید تجزیاتی لسانیات میں ریڈر ہیں اور لسانیات کے سب سے مشہور ادارے دکن کالج پونا سے متعلق ہیں۔ موصوف میرے استاد ہیں۔ اس مضمون کے تمام بیانات کی تفصیل میں نے ان کی خدمت میں بھیجی۔ انھوں نے زیرِ بحث چاروں اصولوں پر صاد کی۔ اپنے عالمانہ انداز میں انھوں نے خاص بُل کے تینوں اصولوں کو ایک اصول میں سمو دیا لیکن وہ اُردو کے قارئین کے لیے کسی قدر مشکل ثابت ہوتا اس لیے میں نے تینوں اصولوں کو الگ الگ ہی درج کیا ہے۔

۲۲́۲- روزانہ -فرمائش- مستقبل

۲۲́۱ - سواری -مکرم- جسامت- مبرّا

۲۱́۱ - اگال دان -نقاب پوش- قمار باز

۲۳́۲- مردانگی -آراستہ

۲۲́۱- جواب دہ

۳۴́۴- تیماردار- پرہیزگار

۴́۲۲- استقبال- ہندوستان

۳۱۲- انقلاب

۳۲۱- سلیمان -قدم بوس- فلک سیر-

۱۱۴́ - اثرات

۱۱۴́- عربی- علمار (بہ حرکتِ ثانی)

مرکب الفاظ میں بل کا معاملہ کسی قدر پیچیدہ ہے۔ یہ لفظ دو قسم کے ہوتے۔ ایک تو وہ جن کا ایک جزو مکمل لفظ کی حیثیت سے استعمال ہو سکتا ہے لیکن دوسرے کی کوئی آزاد حیثیت نہیں یعنی محض سابقہ یا لاحقہ ہے -اس قسم کے مرکب الفاظ کے دونوں اجزار کو محض ایک اکائی جان کر بل کی تعین کر دینی چاہیے مثلاً

۲۱۴́ - ناموری

ہاں اگر یہ اجزا آپس میں شیر و شکر نہیں -ان میں توازن Rhythm کی کمی ہے یا سابقہ یالاحقہ خاصا طویل ہے تو انھیں نیچے درج کی جانے والی دوسری شق ہی میں رکھا جائے گا

دوسری شق ان مرکب الفاظ کی ہے جن کے دونوں اجزا آزاد لفظ free form کی طرح استعمال ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں -ان الفاظ کو اول تو ہم ایک اکائی مان کر اپنے کلیوں کے مطابق خاص بل کی تعین کر دیں گے -اس کے بعد باقی رہنے والے جزو کے خاص بل کے بارے میں غور کیا جائے گا کہ اسے برقرار رکھا جاتا ہے یا ثانوی بل میں بدل دیا جاتا ہے یا بالکل حذف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے فیصلے میں الجھن اس وجہ سے ہوتی ہے کہ بعض حضرات مرکب الفاظ کے اجزا میں ایک طرح بل دیتے ہیں- دوسرے کسی دوسری طرح - پھر ثانوی بل کا درک بھی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے اس لیے مرکب الفاظ کے ثانوی بل کے بارے میں جو اصول پیش کیے جائیں گے ان کے بارے میں کوئی قطعیت

نہیں کیوں کہ ممکن ہے بعض قارئین کا تلفظ کسی دوسری طرح ہو۔

تین رکنی الفاظ میں مرکبات کی تعداد زیادہ نہیں۔ پھر ان میں سے زیادہ تر واحد لفظ کے طور پر بُل قبول کرتے ہیں۔ صرف ذیل کے ڈھانچوں میں کچھ اختلاف ملتا ہے۔

و۔ اگر مرکب لفظ کا پہلا جزو تین رکن کا ہے اور خاص بُل لیتا ہے تو دوسرے جزو کا خاص بُل ثانوی بُل میں بدل جائے گا اور یہ صورت ہوگی۔

۲۲۲ - ناز بردار	۲۳۲ - خلد بارگاہ
۲۱۲ - شیش محل، نیل کنول	۲۲۳ - حسن دوستی
۲۳۲ - آسمان جاہ	۲۱۲ - تیز خرام

ب۔ اگر مرکب لفظ کے تینوں رکن ۲ ماتراؤں کے ہیں تو جو جزو طویل ہے اس کا خاص بُل برقرار رہے گا۔ جو جزو محض ایک رکن کا ہے اس پر ثانوی بل ہوگا۔

یعنی ۲۲ + ۲ مل کر بنے گا ۲۲۲ مثلاً بھولاپن، منشی جی، ہندوکش۔

اور ۲ + ۲۲ مل کر بنے گا ۲۲۲ مثلاً خوش قسمت۔ ناسمجھی۔ ناکافی۔

چار رکنی الفاظ

تین رکنی الفاظ کے مقابلے میں یہاں مرکب الفاظ کی تعداد زیادہ ہوتی ہے مفرد الفاظ میں بل کے اصول وہی ہیں جو تین رکنی الفاظ میں تھے یعنی

۱۔ اگر ایک رکن سب سے طویل ہے تو اس پر خاص بل ہوگا۔

۲۔ اگر کچھ ارکان بقیہ سے زیادہ طویل ہیں تو ان طویل ارکان میں آخری سے پہلے رکن پر بل ہوگا۔

۳۔ اگر سب ارکان برابر طویل ہیں تو ان طویل ارکان میں آخری سے پہلے رکن پر بل ہوگا۔

مستثنیٰ ۔ مفرد اور مرکب دونوں قسم کے الفاظ میں اگر دوسرا اور تیسرا رکن ایک ایک ماترا کا ہو تو ان کی تلافی کے لیے پہلا اور آخری دونوں رکن خاص بُل لیے ہوں گے مثلاً ۲۱۱۲ مخبری خوش خبری

۴۔ خاص بُل والے رکن سے پہلے ایک چھوڑ کر اگر کوئی رکن ہے اور دو ماترا کا ہے تو اس پر ثانوی بُل ہوگا۔

ان اصولوں کا اطلاق ملاحظہ ہو۔

۲۱۲۲ - کاری گری

۲۱۲۱ - محافظت

۲۲۱۲ ۔ زندگانی

۲۲۱۱ ۔ متجاوز

۲۱۲۱ ۔ مغلّظات ۔ مماثلات

۲۱۲۲ ۔ تحت الشعور ۔ مستثنیات ۔ عرفانیات ۔

چار رکنی مرکّب الفاظ کے قواعد مختلف ہیں ۔ حسبِ معمول یہ بھی دو قسم کے ہیں ۔ اوّل وہ جن کے دونوں اجزا اپنی جگہ پر مکمّل لفظ ہیں دوم وہ جن کا ایک جزو مکمّل لفظ ہے دوسرا محض سابقہ یا لاحقہ کی حیثیت رکھتا ہے ۔ لیکن اگر یہ جزو طویل ہے یا اپنے اصل جزو کے ساتھ شیر و شکر نہیں یعنی دونوں کے درمیان توازن و ترنّم (Rhythm) کا ربط نہیں تو اس قسم کے الفاظ بھی اوّل شق میں شامل سمجھے جائیں گے ۔

۱۔ اگر اصلاً دونوں اجزا کا خاص بل متصل ارکان پر واقع ہے تو پہلے جزو کا خاص بل برقرار رہے گا اور دوسرے جزو کا بل ثانوی بل میں تبدیل ہو جائے گا کیوں کہ دو خاص بل مسلسل نہیں آسکتے مثلاً

۲۲۲۱ ۔ قمار خانہ ۔ نیاز مندی ۔ ۳۳۳۲ ۔ فردوسِ بارگاہ

۲۲۳۱ ۔ عوام دوستی ۲۱۲۲ ۔ برق پاشیاں

۲۲۲۲ ۔ انسان دوستی ۲۲۲۱ ۔ سمجھ داری ۔

۲۔ اگر دونوں اجزا کے خاص بل متّصل ارکان پر نہیں تو دونوں ارکان پر خاص بل برقرار رہے گا مثلاً

۲۱۲۱ ۔ وفا شعار ۳۲۲۲ ۔ آوارہ گرد

۲۲۲۳ ۔ ناز برداری ۔ درد مندانہ ۳۱۳۱ ۔ بسنت بہار

۲۲۱۳ ۔ حسن پرستی ۲۱۲۱ ۔ جواب دہی

۳۲۲۱ ۔ عصا بردار ۲۲۲۲ ۔ جی بہلاوا ۔ فن کارانہ

۲۱۲۲ ۔ آرام طلب ۲۱۱۲ ۔ خوش خبری ۔ بے خبری ۔ بے اثری ۔

مستثنیٰ ا ۔ آوارہ پن میں چوں کہ پن بہت غیر اہم اور مختصر لاحقہ ہے اس لیے اس پر خاص بل کی بجائے ثانوی بل ہوگا اور ۲۲۲۲ کی شکل ہوگی ۔

مستثنیٰ ب ۔ اگر پہلا جزو ۲۲ ہے تو یہ ۲۲ میں بدل جائے گا ۔ دوسرے جزو کا بل حسب معمول برقرار رہے گا مثلاً

۲۲۲۲۔ نکتہ چینی ۔ غنڈہ گردی　　　۳۲۲۲ ۔ فرماں بردار

〃 گڑبڑ جھالا　　　۲۱۲۲ ۔ آتش کدہ

۲۲۱۳ الفت شعار

لفظ ہندستانی مفرد ہونے کے باوجود اسی اصول کے مطابق بُل لیتا ہے۔ یعنی نکتہ چینی وغیرہ کے انداز پر اس کے دوسرے رکن پر ثانوی بُل ہے ۲۲۲۲ حالاں کہ مفرد لفظ میں ثانوی بُل پہلے رکن پر متوقع تھا۔ یہ توازن کے تقاضوں کا کرشمہ ہے۔

پانچ۔ چھ اور سات رکنی الفاظ

ان الفاظ میں بُل کی وہ باقاعدگی نہیں جو دو یا تین رکنی الفاظ میں ہے۔ یہ الفاظ اکثر و بیشتر مرکب ہوتے ہیں اور مرکب بھی ایسے اجزائے جو خود بجائے مکمل لفظ ہیں۔ ان کے تلفظ میں اختلاف کی گنجائش ہے یعنی جہاں بعض حضرات خاص بل دیں گے وہاں دوسرے حضرات ثانوی بُل پر اکتفا کر سکتے ہیں۔ بہرحال ان کے مطالعے کے بعد جو اصول مترتب ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ مفرد الفاظ میں آخری تین ارکان پر سہ رکنی الفاظ کے قواعد کا اطلاق ہوگا اور ان سے پہلے بچنے والے دو۔ تین یا چار ارکان پر بالترتیب دو رکنی تین رکنی اور چار رکنی الفاظ کے قواعد کے مطابق بُل ہوگا مثلاً

۲۲۱۱۴ ۔ مصطربانہ

۲۲۱۲۱ ۔ مساویانہ

۲۱۲۱۲ ۔ اشتراکیت (بہ یائے واحد)

۲۱۲۱۱ ۔ مترادفات ۔ متغزلین

۲۲۱۲۱۱ ۔ متغزلانہ

۲۔ مرکب الفاظ کے اجزا پر بُل اس طرح دیا جائے گا جیسے وہ دو آزاد لفظ ہوں۔ مثلاً

۲۲۲۱۲ ۔ فارغ البالی

۲۲۲۱۲ ۔ سرفروشانہ

۲۲۲۲۱ ۔ ارادت مندی

۲۱۳۲۳ ۔ ناز برداریاں

۲۲۱۳۱ ۔ جمال پرستی

۲۲۱۲۳ - اوڑھنا بچھونا
۲۲۲۲ - آوارہ گردی
۳۲۱۴۲ - احسان فراموش
۲۲۲۲۳ - تہذیب الاخلاق - تنسیق الصفات
۱۲۲۲۳۱ - مراعات النظیر
۱۲۱۲۲۲۳۲ - براعت الاستہلال

مندرجہ بالا مرکبات میں سے آوارہ گردی - تہذیب الاخلاق اور تنسیق الصفات کے علاوہ بقیہ سب اصول ۱ کی بھی مطابقت کرتے ہیں۔

۲- مرکب لفظ میں اگر پہلا جزو ۲۲ ہے تو اس کا خاص بَل دوسرے رکن پر منتقل ہو جائے گا۔

۲۲۲۲۳ - فرماں برداری
۱۲۱۱۲ - اثنا عشری - گردن زدنی

ہم نے دیکھا تھا کہ چار رکنی الفاظ میں اگر پہلا جزو ۲ ہے تو وہ ۲۲ میں بدلتا تھا لیکن یہاں دوسرے رکن پر خاص بل ہی منتقل ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پانچ رکنی الفاظ میں دونوں اجزا بالکل دولخت ہو جاتے ہیں۔ ان کا آپس کا رابطہ بہت نحیف ہو جاتا ہے اور انھیں ایک لفظ کے طور پر ادا کرنا دشوار ہے۔

اگر ۲۲ سے شروع ہونے والے تمام الفاظ کو اصول ۳ کے تحت رکھ دیا جائے تو بقیہ تمام مفرد اور مرکب الفاظ اصول ۱ یا اصول ۲ کے تحت رکھے جا سکتے ہیں۔ یعنی ۲۲ سے شروع ہونے والے الفاظ کو نظر انداز کر دیا جائے تو اصول ۲ کے قایم کرنے کی ضرورت نہیں اور صرف ذیل کے دو اصول کافی ہوں گے۔

۱- پانچ - چھ اور سات رکنی الفاظ کے آخری تین ارکان پر تین رکنی الفاظ کے اصول کا اطلاق ہوگا اور بقیہ ارکان پر بالترتیب دو - تین یا چار رکنی الفاظ کے اصول کا۔

۲- مندرجہ بالا اصول کے برخلاف جو الفاظ ۲۲ سے شروع ہوں گے ان میں دوسرے رکن پر خاص بل ہوگا۔ بقیہ ارکان پر اصول ۱ کے مطابق بل ہوگا۔

جملے میں لفظ کا اندرونی بل

ہم نے دیکھا کہ مرکب ہونے کی شکل میں بعض الفاظ کے بل میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اس تبدیلی کے قواعد بھی دریافت کیے گئے۔ یہ تبدیلی مرکب الفاظ تک محدود نہیں بلکہ جملے میں استعمال ہونے پر بعض ایسے الفاظ میں بھی رونما ہوتی ہے جو بظاہر مفرد ہیں۔ اس کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو۔

جملے میں کہیں کہیں دو تین الفاظ آپس میں ایک فقرے کے طور پر مل جل کر آتے ہیں۔ ان فقروں کے مختلف اجزا میں نہ صرف مفہوم کے لحاظ سے بڑا نزدیکی علاقہ ہوتا ہے بلکہ جملے کے ادا کرنے میں ان کے درمیان وقفہ کم سے کم ہوتا ہے لیکن فقرے کی دونوں حدوں پر وقفہ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ صفت موصوف۔ مضاف مضاف الیہ۔ جار مجرور۔ اشارہ مشارٌ الیہ۔ ندا اور منادی اس قسم کے فقرے ہیں۔ ان فقروں کے مختلف اجزا پر آزاد لفظ کی حیثیت سے بل نہیں دیا جاتا بلکہ مرکب الفاظ کے طور پر چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ 'روضۃ الشہدا کی طرز پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں انھیں 'دہ مجلس' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے'۔
یہاں "جتنی بھی"۔ "جاتا ہے" لفظِ واحد کے طور پر آئے ہیں اس لیے ان دونوں فقروں میں خاص بل پہلے رکن کی بجائے درمیانی رکن پر ہے۔ فقرے میں ۲َ۲ کے بعد کوئی لفظ ہو تو اوّل الذکر کا ۲۲ میں بدل جانا بہت عام تبدیلی ہے۔

۲۔ 'لیکن اس کو امیر خسرو سے کوئی تعلق نہیں'۔
"کوئی تعلق" ۲َ۲۲ ۲ یا ۲َ۲ ۲۲ کے وزن پر ایک مرکب لفظ ہے جس میں تعلق کا خاص بل ثانوی بل میں بدل گیا ہے۔

۳۔ 'شیریں نے پوچھا ان دو کے سوا کوئی اور بھی ان سے مانوس ہے'۔
'ان دو کے سوا' ایک فقرہ ہے۔ ان میں بغیر بل والے حرفِ جار 'کے' کا آخری مصوتہ طویل سے خفیف ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے اس فقرے کی ترکیب اور بل کا نقشہ ۲َ۱۱ ۲َ۲ ہو جاتا ہے۔

۴۔ 'تا کہ میرے دل کا بوجھ ہی ہلکا نہ ہو'
"ہلکا" کا قدرتی بل پہلے رکن پر ہونا چاہیے لیکن "ہلکا نہ ہو" ایک فقرہ ہے ۲َ۲۱۲ کے وزن پر جس میں 'کا' پر خاص بل ہے۔ بقیہ ارکان بغیر بل کے ہیں۔

۵۔ 'چوہے بھی ان کے گھروں اور کارخانوں میں جاتے ہیں'،

"چوہے بھی" ایک فقرہ ہے جس کا خاص بَل چو ہے کے پہلے رکن پر نہ ہو کر دوسرے رکن پر آجاتا ہے "ان کے گھروں" بھی ایک فقرہ ہے اگر اسے آرام سے ادا کیا جائے تو 'ان کے' ایک فقرہ ہو جاتا ہے جس میں پہلے جزو پر بل ہے 'گھروں' میں پہلے رکن پر بل ہے لیکن اگر اس فقرے کو تیزی سے بولا جائے تو 'کے' مختصر ہو کر ایک ماترا کا رکن رہ جاتا ہے اور پورے فقرے کی ترکیب ۱۲/۱۱۲ ہو جاتی ہے یعنی گھروں کا خاص بل پہلے رکن سے دوسرے رکن پر آجاتا ہے۔

زور[1] (Emphasis)

بعض اوقات کسی مفہوم کو زیادہ کرنے کے لیے جملے میں ایک لفظ پر زور دیا جاتا ہے۔ جملے میں الفاظ کا بل معینہ اصولوں کے مطابق دریافت کیا جاسکتا ہے لیکن زور کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ زور کس لفظ پر دیا جائے گا یہ متکلم کی مرضی پر منحصر ہے۔ موٹے طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ زور دو قسم کا ہوتا ہے۔

۱۔ ممیز کرنے والا زور۔ اگر کسی مفہوم کو اپنے ابنائے نوع سے ممیز و مختلف ظاہر کرنا ہوتا ہے تو اس پر زور دیا جاتا ہے۔ ذیل کی مثالوں میں جس لفظ پر زور ہے اس کے اوپر دو کھڑی لکیریں بنا دی گئی ہیں۔ ملاحظہ ہو:

کیا تم" دلی جاؤ گے ؟
کیا تم دلی" جاؤ گے ؟
کیا تم دلی جا" ؤ گے ؟

پہلے جملے کے معنی ہیں کہ دلی تم جاؤ گے یا کوئی اور جائے گا۔ دوسرے جملے میں پوچھا گیا ہے کہ تم دلی جاؤ گے یا کسی دوسرے مقام پر۔ تیسرا سوال ہے کہ تم دلی جاؤ گے یا نہیں جاؤ گے؟ اس طرح بل کے برعکس زور خالص صوتی عمل نہیں اس کا تعلق معنی سے بھی ہے۔

۲۔ شدت ظاہر کرنے والا زور۔ یہ اکثر صفات۔ اوصاف ظاہر کرنے والے۔ اسمار متعلقاتِ فعل اور بعض افعال شلاً اچھا۔ نفرت۔ آہستہ۔ نچوڑنا وغیرہ پر ہوتا ہے۔

---

[1] زور کی بحث میں ڈینیل جونز کی An Outline of English Phonetics کے متعلقہ بیانات سے خاص طور سے استفادہ کیا گیا ہے۔

لفظ میں زور پیدا کرنے کے تین طریقے ہیں

۱۔ سُر کو بہت بلند کر دینا۔
۲۔ بَل کو بہت شدید کر دینا۔
۳۔ مصوتہ یا کبھی کبھی مصمتے کو بہت طویل کر دینا۔

ان میں سے کوئی ایک، دو یا تینوں عمل بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔ سُر کی بلندی کے ساتھ اکثر بل کی شدت بھی رونما ہوتی ہے۔ ممیّز کرنے والا زور اکثر سُر کی بلندی کے ساتھ ظاہر کیا جاتا ہے۔ دونوں قسم کے زور کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ا ممیّز کرنے والا زور:

۱۔ میں تم" سے کہہ رہا ہوں۔
۲۔ انسان" کا فرض ہے کہ اپنے بنانے والے کو نہ بھولے۔
۳۔ ہمت" کسے جو صاحب کے منہ پر یہ بات کہے۔
۴۔ کون" ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
۵۔ اردو ہے جس کا نام ہمیں" جانتے ہیں داغ
۶۔ شیر نے پوچھا ان دو کے سوا کوئی اور" بھی ان سے مانوس ہے
۷۔ ہاں کہوں" گا۔ سو" بار کہوں گا۔
۸۔ اس کا تو دما"غ خراب ہو گیا ہے
۹۔ بھا"گو یہاں سے۔

ب۔ شدت ظاہر کرنے والا زور:

۱۰۔ بھائی وہ تو کمینہ آدمی ہے۔
۱۱۔ کیا کہنے" ہیں۔
۱۲۔ تانگہ ذرا آہستہ" چلاؤ۔
۱۳۔ عیّاشی نے اسے بالکل نچوڑ دیا ہے۔
۱۴۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔
۱۵۔ کتنا" اچھا آدمی ہے
۱۶۔ بہت ہی اچھا آدمی ہے۔

۱۷۔ بہت" اچھے۔
۱۸۔ پنہاں تھا دام سخت" قریب آشیانے کے
۱۹۔ ان بچّوں نے تو مجھے کھا" لیا۔

پہلے جملے میں زور دینے کے لیے خاص طور سے سُر کی بلندی سے کام لیا گیا ہے۔ ساتھ ہی بل بھی بڑھ گیا ہے۔ چوتھے اور سترھویں جملے میں مصوتے کو طول دے کر زور پیدا کیا گیا ہے۔ نویں مثال میں بل کی شدت زور کو جنم دیتی ہے۔ زور کے لیے مصمتے کے طول کی مثالیں شاذ ہیں لیکن گیارھویں مثال میں کہنے کا (ک)، طویل ہو گیا ہے۔ آواز یوں نکلتی ہے جیسے کیاک کہتے ہیں۔ مصمتے کے طول کی کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں۔

کیا گا"نا گایا ہے۔
تم بالکل گد"ھے ہو۔
کھٹ" سے آواز آئی۔

زور اور بل کے تعلق کے بارے میں چند مشاہدات درج ذیل ہیں۔

۱۔ جس لفظ پر زور دیا جاتا ہے اس کا خاص بل دوسرے لفظوں کے خاص بل سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ بَل کے اس درجے کو ہم شدید بل کہہ سکتے ہیں۔ اس کا تعلق جملے سے ہے لفظ کے اندرونی بل سے نہیں۔

۲۔ جب کسی ایسے لفظ پر زور دیا جاتا ہے جس میں خاص بل سے پہلے ثانوی بل بھی ہو تو ثانوی بل کو بھی خاص بل میں بدل دیا جاتا ہے لیکن خاص بل والا رکن اس سے بھی شدید تر ہو جاتا ہے مثلاً

ا۔ انقلاب" زندہ باد
ب۔ تم سے دس دفعہ کہہ دیا یہ لفظ مستثنیا"ت میں سے ہے۔ بار بار اس کو لے بیٹھتے ہو۔
ج۔ ہند"ستان کی طرف کسی نے آنکھ اٹھائی تو...

مندرجہ بالا مثالوں میں زور دار لفظ کے تیسرے رکن کے علاوہ پہلے رکن پر بھی خاص بل ہے۔

۳۔ لیکن ثانوی بَل خاص بل کے بعد ہو تو وہ ہرگز خاص بل میں تبدیل نہیں ہو گا کیوں کہ خاص بل پر ڈالے جانے والی قوت کا اٹھان ماقبل ارکان کو تو زیادہ بل عطا کر سکتا ہے لیکن خاص بَل والے رکن پر پورا زور صرف کر دینے کے بعد تنفس جواب دے جاتا ہے جس کے باعث ثانوی بل اور نحیف

ہو جاتا ہے بعض اوقات بالکل ختم ہی ہو جاتا ہے مثلاً۔

ا۔ کس کے یہاں چل رہے ہو۔ وہ تو ہر وقت شراب خانے میں پڑا رہتا ہے۔

ب۔ آپ میرے یہاں اُسے خوشی سے ٹھہرا سکتے ہیں لیکن اس کی ناز برداری میرے بس کی نہیں۔

شراب خانہ میں خا پر اور ناز برداری میں دا پر ثانوی بل ہے جو معمول سے زیادہ نحیف ہو گیا ہے۔

۴۔ جملے میں کسی لفظ پر زور دیا جاتا ہے تو اس کے اِدھر اُدھر کے لفظ کا بل ختم ہو جانے کا امکان ہے۔ ذیل کی مثالوں میں بل دار لفظوں کے اوپر ایک کھڑی لکیر اور زور لینے والے لفظ پر دو لکیریں بنا دی گئی ہیں۔

ا۔ شیر نے پوچھا ان دو کے سوا کوئی اور بھی ان سے مانوس ہے۔

ب۔ تم بالکل پاگل ہو۔

ان جملوں میں 'اور' اور 'پاگل' پر زور دیے جانے سے 'کوئی' اور 'بالکل' کا بل ختم ہو گیا ہے۔

لفظ کے اندرونی بل کا تعین کرتے وقت دیکھنا ہوتا ہے کہ کس رکن پر بل ہے۔

جملے میں بل

جملے میں بل پر غور کرتے وقت بل دار لفظوں کی دریافت ہمارا مقصود ہے۔ جن جن لفظوں کے کسی رکن پر بل ہوتا ہے جملے میں ان الفاظ کو بل دار کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے جملے میں خاص مفہوم کے حامل الفاظ پر بل ہوتا ہے۔ غیر اہم الفاظ مثلاً حروفِ جار، شخصی ضمائر، امدادی افعال پر بل نہیں ہوتا۔ شخصی ضمائر پر بعض اوقات بل دیا جا سکتا ہے۔ کسی لفظ پر زور دیے جانے کی صورت میں اِدھر اُدھر کے لفظوں کا بل جس طرح ختم یا نحیف ہو جاتا ہے اس کی بھی صراحت کی جا چکی ہے۔ ذیل کے جملوں میں بل دار الفاظ کے اوپر ایک کھڑا زبر بنا دیا گیا ہے۔ اُردو میں آڑا زبر چوں کہ ایک خفیف مصوتہ کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے جملے میں بل کے اظہار کے لیے کھڑا زبر موزوں ہے۔

۱۔ جب تاج الملوک سے ان ناعاقبت اندیشوں نے گل بکاولی چھین لیا اور وہ بے چارہ دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ پھر کج فہموں کے پیچھے پیچھے چند روز کے بعد اپنے باپ کی سرحد میں آیا۔

۲۔ اردو الفاظ میں بل کے وقوع کے اصول سب سے پہلے ڈاکٹر زور نے اور ان کے بعد ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے پیش کیے۔

آوازوں پر بَل کا اثر

ڈاکٹر بھولا ناتھ تواری[۱] نے آوازوں پر بَل کے اثرات شمار کرائے ہیں بَل جتنا شدید ہوگا یہ اثرات اتنے ہی نمایاں ہوں گے۔ بَل کی شدت زور کی حالت میں سب سے واضح طور پر رونما ہوتی ہے۔ ڈاکٹر تواری کے مشاہدات کی مدد سے اُردو الفاظ کے متعلق اس قسم کے اصول درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ بَل دار رکن کے مصوتے معمول سے کسی قدر طویل ہو جاتے ہیں۔

ا۔ کوئی ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

ب۔ وہ بڑا نیک آدمی ہے۔

ج۔ دست کار اور کارزار میں دوسرے کار کا مصوتہ طویل ہے۔ جی جی میں پہلے جی کا (ای) طویل تر ہے۔

د۔ کُس بل کا پہلا مصوتہ بے کُس کے دوسرے مصوتے سے طویل ہے۔

۱۔ بل دار رکن کا مصمتہ بھی معمول سے کسی قدر طویل ہو جاتا ہے لیکن یہ اضافہ نامعلوم حد تک خفیف ہوتا ہے۔ ہاں اگر بل زور کی حد تک شدید ہو اور بل دار مصمتہ لفظ کی پہلی یا آخری آواز ہو تو مصمتہ تشدید کی حد تک طویل ہو جاتا ہے جیساکہ زور کے سلسلے میں لکھا گیا۔ مثلاً:

کیا گانا گایا ہے

وہ دھم سے کودا۔

پہلی مثال میں (گ) اور دوسری میں (م) نیم مشدد ہو جاتا ہے۔

۳۔ بَل شدید ہو تو سُر بھی اکثر بلند ہو جاتا ہے مثلاً "بھاگو یہاں سے" میں 'بھا' کو بلند آوازی سے ادا کیا جائے گا۔

۴۔ بل دار رکن یا آواز میں ہوا کسی قدر زیادہ مقدار میں نکلتی ہے۔ منفوس اسپھوٹ آوازوں مثلاً (بھ، کھ) میں بھی یہی ہوتا ہے۔ اس لیے اگر غیر منفوس اسپھوٹ آواز پر زیادہ بَل دیا جائے لیکن سُر کو اسی مناسبت سے بلند نہ کیا جائے تو غیر منفوس آواز کچھ کچھ منفوس ہو جاتی ہے مثلاً 'کیا بتاؤں' کے پہلے مصمتے کو شدید بَل اور معمولی سُر کے ساتھ ادا کیا جائے تو 'کھیا' جیسی کیفیت ہو جائے گی۔

۵۔ بل دار آوازیں بغیر بل کی آوازوں کے مقابلے میں کسی قدر کرخت fortis ہو جاتی ہیں۔

---

[۱] بھاشا وگیان (ہندی میں) طبع پنجم ۶۲ء ص ۲۴۵

ڈاکٹر بھولاناتھ تواری نے لکھا ہے کہ بغیر بل کی آوازوں میں استحکام کی کمی ہوتی ہے۔ مثلاً طویل مصوتے خفیف ہو جاتے ہیں۔ بازار۔ ناراض۔ بھائی (طویل اِی) کو بزار، نراض، بھائی (خفیف اِی) بولنے کا رجحان اسی وجہ سے ہے۔ ڈاکٹر رمیش چندر مہروترا نے بھی تقریباً یہی بات کہی ہے کہ بغیر بل کے طویل مصوتے خفیف ہونا چاہتے ہیں لیکن مشاہدے سے یہ ہر موقع پر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ مندرجہ بالا مثالوں کے برعکس ایسی مثالیں بھی متعدد ہیں جن میں بل دار رکن کا طویل مصوتہ خفیف ہو جاتا ہے جس کے باعث بل کے مقام میں بھی فرق پڑ جاتا ہے مثلاً:

آسمان سے اسمان۔ بھائی سے بھئی۔ ہندوستان سے ہندستان؛ پچیس سے پچس۔ کیفیت (یائے مشدد کے ساتھ مفعولن کے وزن پر) سے کیفیت (یائے واحد کے ساتھ فاعلن کے وزن پر)

گذشتہ اوراق میں بل کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے غور کیا گیا۔ اہلِ زبان کے لیے تو بل کے اصول جاننے کی کوئی اہمیت نہیں لیکن غیر زبان جاننے والوں کو جب ہماری زبان سیکھنی ہو یا اس کا لسانی مطالعہ کرنا ہو تو بل کے فطری و تنوع سے آگاہی ضروری ہے تاکہ صحیح لہجہ حاصل ہو سکے بالخصوص ان صورتوں میں جب کہ اردو سیکھنے والا اہلِ زبان کے درمیان نہ رہے بلکہ محض کتاب کی مدد سے سیکھے۔

اُردو عروض اور لفظ کا بَل

(اس مضمون میں انگریزی لفظ Syllable کے لیے صوت رکن کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔)

اُردو اور ہندی عروض صوت رکن کے طول پر مبنی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ صوت رکن کا طول مصوتے کے طول کا ساتھ دے۔ خفیف مصوتے کے باوجود ایک صوت رکن طویل مصوتے والے صوت رکن کے برابر ہو سکتا ہے۔ مثلاً شامل کے پہلے صوت رکن میں طویل مصوتہ ہے اور دوسرے میں خفیف اس کے باوجود دونوں کا طول موٹے طور سے برابر ہے۔ اسی طرح ضم کے پہلے صوت رکن میں بھی طویل مصوتہ ہے اور تَم میں بھی لیکن دوسرا صوت رکن پہلے سے طویل تر ہے اُردو میں شامل کے دونوں صوت رکن فع کے برابر مانے جاتے ہیں۔ ہندی پنگل میں ماتراؤں کے طول کو بہت اہمیت دی جاتی ہے لیکن وہاں بھی کسی طرح گھما پھرا کر 'شامل' کے دونوں اجزا کو برابر کر لیا گیا۔ اصول یہ بنایا گیا کہ اگر چھوٹی (لگھو) ماترا کے بعد کوئی ساکن حرف آئے تو چھوٹی ماترا کو بڑی (گرو) ماترا مان لیا جائے گا۔ اس طرح ہندی عروض میں بل، دِل وغیرہ آ، جا کی طرح بڑے ماترا والے صوت رکن ہیں۔

ہماری زبان میں ایک سے زیادہ صوت رُکن والے لفظ میں ایک صوت رکن بل دار ہوتا ہے اور بقیہ بغیر بل کے یا ثانوی بَل والے۔ ثانوی بَل کو اس مضمون میں نظر انداز کر دیا جائے گا۔ لفظ کا صوت رکنی بل اتنا خفیف اور غیر محسوس ہوتا ہے کہ اہلِ زبان کو اس کا شعوری احساس نہیں ہوتا۔ جو حضرات صوتیات میں تربیت یافتہ ہیں انھیں کا کان لفظ کے صوت رُکنی بل کی گرفت کر سکتا ہے جب کوئی غیر زبان والا ہماری زبان میں بات کرتا ہے تو بعض اوقات تلفظ صحیح ہونے کے باوجود لہجہ اکھڑا اکھڑا اجنبی سا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ وہ لفظ میں صحیح مقام پر بَل

نہیں دیتا۔ اُردو اور ہندی میں بَل معنی پر اثر انداز نہیں ہوتا یعنی لفظ کے بَل دار اور بغیر بَل کے صوت رکنوں میں بل کو اِدھر اُدھر بھی کر دیا جائے تو مفہوم وہی کا وہی رہے گا اس وجہ سے اہلِ زبان نے لفظی بل کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اس کے برعکس انگریزی زبان میں صوت رکنی بَل کی بڑی اہمیت ہے بہت سے لفظوں میں بَل کے انتقال سے معنی بدل جاتے ہیں مثلاً۔

Present , Increase , Conflict.

میں پہلے صوت رکن پر بَل دیا جائے تو یہ الفاظ اسم کے معنی دیں گے دوسرے پر بل دیں تو یہ فعل ہو جائیں گے۔ اس لیے انگریزی تلفظ میں بَل کی صحت پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ انگریزی کی قواعدوں میں کہیں نہ کہیں بَل کا ذکر آجاتا ہے لیکن اُردو کی قواعد یا علمِ بیان کی کسی کتاب میں بھولے سے بھی بَل کا نام نہیں لیا جاتا۔

انگریزی میں صوت رُکنی بل کے وقوع کے کوئی اصول نہیں۔ یہ سراسر سماعی ہے۔ ہر لفظ کا صحیح بل اہلِ زبان سے سیکھنا پڑتا ہے۔ انگریزی کا عروض صوت رُکنی طول پر مبنی نہیں بلکہ صوت رکنی بل پر مبنی ہے۔ یونانی اور لاطینی زبان میں شعر کا وزن صوت رکن کے طول ہی سے متعلق تھا لیکن انگریزی میں آکر یہ بدل گیا۔ عہدِ عتیق میں انگریزی میں بھی ایسی مثالیں مل جاتی ہیں کہ شاعر نے صوت رکنی طول پر شعر کی بنیاد رکھی لیکن یہ مثالیں شاذ اور استثنائی ہیں۔ اِدھر کئی صدیوں سے انگریزی شاعری میں صرف وزن ہی وزنِ شعر کی تعیّن کرتا ہے۔

بعض بزرگوں کا عقیدہ ہو سکتا ہے کہ اُردو شعر کا وزن صوت رکن کے طول پر نہیں حرکت و سکون کی ترتیب پر مبنی ہے لیکن ایسا سوچنا صحیح نہیں۔ حرکت و سکون بالعموم صوت رکن کا طول ظاہر کرے ہیں لیکن اگر کہیں طول کی وہی مقدار حرکت و سکون کی مختلف ترتیب کے باوجود برقرار رہ سکتی ہے تو عروض کو حرکت و سکون میں ردّ و بدل پر اعتراض نہیں۔ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ غالب کی 'دوست' ردیف کی ایک غزل کے دو مصرعے ہیں

چشمِ ما روشن کہ اس بے درد کا دل شاد ہے

———•———

عشق میں بے دادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے

پہلے مصرعے میں 'چشم' کا 'م' متحرک ہے لیکن دوسرے مصرعے میں اسی کے مقابل 'عشق' کا 'ق' ساکن ہے۔ وزن میں کوئی فرق نہیں پڑا کیوں کہ 'چشمِ ما' اور 'عشق میں' دونوں مرکبات کا طول

پانچ پانچ ماتراؤں کا ہے اور طویل اور خفیف صوت رکنوں کی ترتیب یکساں ہے۔

۲- برقِ خرمنِ مہ پردے میں
فعْلن فعْل فعولن فعْلن

برقِ خرمن ہے پردے میں
فعْلن فعْلن فعْلن فعْلن

'خرمنِ مہ' اور 'خرمن ہے' میں حرکت وسکون کا بھی فرق ہے اور عروضی ارکان کا بھی ان دونوں اختلافات کے باوجود انھیں مساوی مانا گیا ہے کیوں کہ ان کا طول برابر ہے۔ دونوں ٹکڑے چھ چھ ماتراؤں کے ہیں۔

ظاہراً اُردو شعر کا وزن طول کا تابع ہے بُل کا نہیں۔ انگریزی کے برعکس اُردو میں لفظ کا اندرونی بل باقاعدہ ہے اور یہ صوت رکن کے طول پر مبنی ہے۔ اُردو عروض میں وزن کے ادراک کے لیے جو ارکان مقرر کیے گئے ہیں وہ صوت رکن کا طول تو دکھاتے ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ بل کا صحیح مقام بھی ظاہر کر دیتے ہیں اسی لیے ان پر ڈھالے ہوئے اشعار میں بالعموم صوت رکنی بل خود بخود ارکانِ وزن کی متابعت کرتا ہے اسی لیے صوت رُکنی بل کو اردو زبان میں علیحدہ سے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اس کے باوجود یہ چونکا دینے والی حقیقت ہے کہ بعض اوقات لفظ کا بل اُردو شعر کے وزن پر پوری قوت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ بعض اجنبی اوزان میں اور شاذ و نادر معروف اوزان میں بھی اگر ایسے الفاظ باندھ دیے جائیں جن کا صوت رکنی بُل ارکان وزن کے بُل سے مختلف مقامات پر ہو تو مصرع بظاہر موزوں ہوتے ہوئے بھی کان کو سراسر غیر موزوں معلوم ہو گا۔ اس کی مثال پیش کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ اُردو الفاظ میں صوت رُکنی بل کے وقوع کی سرسری طور پر نشان دہی کر دی جائے۔ اس کے مفصل قواعد اسی مجموعہ کے ایک اور مضمون "اُردو میں بُل اور زور" میں دیے ہیں یہاں خاص اصول چند الفاظ میں سمیٹ کر پیش کیے جاتے ہیں۔

اُردو الفاظ میں بُل صوت رکن کے طول کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ طول کے لحاظ سے ہم صوت رکن کی تین قسمیں کر سکتے ہیں۔

۱- ایک ماترا کا صوت رکن۔ ہر وہ متحرک حرف جس کے بعد کوئی متحرک حرف آیا ہو ایک ماترا

کا صوت رکن ہے مثلاً اِدھر۔ چِدھر۔ طلبی میں ا۔ ج۔ ط۔ ل۔

۲۔ دو ماترا کا صوت رکن۔ ہر صوت رکن جو فع کے وزن پر ہو مثلاً آ۔ کھا۔ اس۔ جس۔

۳۔ تین ماترا کا صوت رکن۔ ہر وہ صوت رکن جو فاع کے وزن پر ہو مثلاً آس پاس۔ دور

اب ہم لفظی بل کے قواعد بآسانی درج کر سکتے ہیں۔

۱۔ ایک ماترا کے صوت رکن پر بل نہیں ہوتا۔

۲۔ اگر کوئی لفظ محض ایک صوت رکن پر مشتمل ہے تو کلام میں اس کا مفہوم طے کرے گا کہ اس پر بل دیا جائے کہ نہیں۔ غیر اسم الفاظ مثلاً سے، 'تو' کا وغیرہ پر عموماً بل نہیں ہوتا۔ معنی کے لحاظ سے اہم الفاظ مثلاً اسم۔ صفت، ضمیر وغیرہ پر بل ہوتا ہے مثلاً دل، خوش۔ میں (ضمیر واحد متکلم)

۳۔ اگر ایک صوت رکن بقیہ صوت رکن یا رکنوں سے طویل تر ہے تو اس پر بل ہوگا۔

۴۔ اگر تمام صوت رکنوں کا طول یکساں ہے تو آخری سے پہلے صوت رکن پر بل ہوگا۔

۵۔ اگر دو یا دو سے زیادہ صوت رکن بقیہ صوت رکن یا صوت رکنوں سے طویل تر ہیں لیکن آپس میں برابر طویل ہیں تو ان طویل صوت رکنوں میں آخری کو چھوڑ کر اس سے پہلے کے صوت رکن پر بل ہوگا مثلاً سواری میں 'وا' پر بندگی میں 'بن' پر۔

ان اصولوں کے تحت ہمارے چند عروضی ارکان کا بل دار صوت رکن ملاحظہ ہو۔

فعولن میں عو۔ فاعلن میں فا۔ مفاعیلن میں عی۔ فاعلاتن میں لا۔ مستفعلن میں تف۔ مفعول میں عول۔ فعل میں عل۔

اگر وزن کے ارکان کے مقابل آنے والے الفاظ کی دروبست کچھ اس قسم کی ہو کہ ان کا صوت رکنی بل متعلقہ عروضی صوت رکنی بل سے کسی مختلف مقام پر آتا ہو تو بعض لچک دار اوزان تو اس کو نباہ جاتے ہیں لیکن بعض صورتوں میں مصرع کسی قدر لنگ کرنے لگتا ہے مثلاً

میری کہانی زندگانی میں مکمل ہو گئی
مستفعلن مستفعلن مستفعلن مستفعلن

اس میں 'میری' میں 'ے' پر بل ہے جب کہ عروضی رکن دوسرے صوت رکن پر بل لیے ہوئے ہے۔ اس عدم مطابقت کی وجہ سے 'میری' ادا کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے زبان میں طوق لٹکا دیا گیا ہو۔ مصرع اور وزن میں "ماچی می سرائیم و طنبورۂ ما چی می سرائد" کا معاملہ ہو جاتا ہے۔

اس مثال میں بل کی کار فرمائی بہت خفیف ہے۔ شاید بعض حضرات اسے محسوس بھی نہ کر سکیں۔ بعض کم معروف اوزان میں بل بڑی جارحیت سے اپنے وجود کو منواتا ہے۔ اگر اس کی طرف سے ذرا بھی بے توجہی کی گئی تو عروضی صحت کے باوجود مصرع غیر موزوں معلوم ہونے لگتا ہے۔ میں جن اوزان کی طرف اشارہ کر رہا ہوں ان کے بارے میں کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔

بحرِ متقارب اور متدارک میں بعض اوزان فعْلن یا فعِلن کی تکرار سے بنتے ہیں۔ کتبِ عروض میں ان کے بہت کم متبادلات لانے کی اجازت ہے لیکن عملاً اُردو شاعروں نے متعدد امکانات سے فائدہ اٹھایا ہے مثلاً فراقؔ کا ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔ چوں کہ اُردو میں فعْلن بہ سکونِ ع اور فعِلن بہ تحریکِ ع میں التباس کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے میں تقطیع کرتے وقت ایک بار ارکان کو مروجہ ڈھنگ پر اور دوبارہ فعْلن اور فعْل بہ سکونِ ع کو فیلن اور فیل لکھ دوں گا تاکہ التباس کی گنجایش نہ رہے۔

پوچھ پوچھ کے نام پتا کچھ سمجھ سمجھ رہ جاتے ہو
فعْل فاعلن فعْل فعولن فعْل فعولن فعلن فع
یعنی (فیل فاعلن فَعَل فعولن فَعَل فعولن فیلن فع)

ہم بھی فراقؔ نگر جاتے ہیں بولو تم بھی آتے ہو
فعْل فعول فعولن فعلن فعْلن فعْلن فعْلن فع
یعنی (فیل فعول فعولن فعلن فیلن فیلن فیلن فع)

اس شعر کا پہلا مصرع کتنا مترنم ہے لیکن کتبِ عروض کے لحاظ سے یہ مصرع غیر موزوں ٹھہرے گا۔ میں نے اس قسم کے مروجہ اوزان اور دوسرے ممکن مترنم اوزان پر غور کر کے انھیں ایک مضمون[1] میں یک جا کر دیا ہے تو ذیل میں جن اوزان کا ذکر کروں گا وہ عروض کی کتابوں میں نہیں ملتے لیکن ان پر شعر کہے گئے ہیں یا کہے جا سکتے ہیں۔

بحرِ متقارب اور متدارک کے ذیل کے اوزان
فعْلن فعْلن فعْلن فعْلن اور

---

[1] "اردو کی ہندی بحریں توسیع اور اضافے" مشمولہ تذکرِ ذاکر

فِعلن فِعلن فِعلن فِعلن

سے میل کھانے والے متعدد امکانات ہو سکتے ہیں۔ چند ملاحظ ہوں۔ مثالوں کے اکثر مصرعے میرے خود ساختہ ہیں۔

۱۔ فَعل فاعلن فَعلن فعلن

ا۔ بنی لکشمی دکھ کی رانی

ب۔ ہماری کہانی باقی ہے

۲۔ فَعل فاعلن فِعلن فعلن

ا۔ پھلے خوب گل بدنی تیری

ب۔ تمھارا شباب دمکتا ہے

۳۔ فَعل فاعلن فِعلن فَعلن

ا۔ بے ضرر نہیں روشِ دنیا

ب۔ اضطراب آج مجھے کیوں ہے

۴۔ فَعلن فَعلن فَعل فاعلن

ا۔ جگ جگ سے اس دکھی دیس میں (فراق)

ب۔ دیوانہ آگیا ہے کہاں

۵۔ فَعَل فعولن فَعل فاعلن

ا۔ بھور گئی اب شام آگئی

ب۔ بھور بھئی ہے صبح کی دلہن (عظمت اللہ خاں)

ایک مثال کسی قدر مختصر وزن کی لیجیے۔

۶۔ فع فَعَل فا

ا۔ وہ مرے دیس میں آیا

یا

وہ زماں اب نہیں باقی

ب۔ وہ زمانہ نہیں باقی

ان سب مثالوں میں ا کے مصرعے کانوں کو کتنے رواں اور موزوں معلوم ہوتے ہیں لیکن

ب کے مصرعے سراسر غیر موزوں معلوم ہوتے ہیں حالاں کہ عروضی حیثیت سے دونوں برابر ہیں
اس کی کیا وجہ ہے؟ صرف بل کا غلط وقوع۔ ذیل میں ان مصرعوں کی جراحی کرکے یعنی ہر لفظ
کا ہر صوت رکن الگ الگ لکھ کر ان کے بل کی نشان دہی کی جاتی ہے۔ بل دار رکن کے اوپر
کھڑا زبر لگایا گیا ہے۔

۱۔ ف علٰ فاٰ عِ لن فعٰ لن فعٰ لن
(و) ب نیٰ لکٰ ش می دٰکھ کی راٰ نی
(ب) ہ ماٰ رہی ک ہاٰ نی باٰ تی ہےٰ

۲۔ ف علٰ فاٰ ع لن ف عِ لنٰ فعٰ لن
(و) پھ لےٰ خوٰ ب گل ب د نیٰ تےٰ رہی
(ب) ت مھاٰ راٰ ش باٰ ب د مکٰ تا ہےٰ

۳۔ فاٰ ع لن ف علٰ ف عِ لنٰ فعٰ لن
(و) بےٰ ض رر نَ ہیٔلٰ ر وِ شےٰ دنٰ یا
(ب) اِض ط راٰ ب آٰ ج م جھےٰ کیوٰں ہے

۴۔ فعٰ لن فعٰ لن ف علٰ فاٰ ع لن
(و) جگٰ جگ سے اس د کھٰی دےٰ س میں
(ب) دی واٰ نہ آ گ یاٰ ہےٰ ک ہاں

۵۔ فعٰل ف عوٰ لن فعٰلٰ فاٰ ع لن
(و) بھوٰر گ ئیٰ اب شاٰم آٰ گ ئیٰ
(ب) بھوٰر بھ ئیٰ ہے صبح کی دُ لھنٰ

۶۔ (و) فعٰ ف علٰ فاٰ ع لن قعٰ لن
(ب) وٰہ م رےٰ دےٰ س میں آٰ یا
وٰہ ز ماٰں ابٰ ن ہیں باٰ تی
(ب) وٰہ ز ماٰ نہ ن ہیں یاٰ تی

مثال ۶ میں (و) کے دوسرے مصرعے میں 'اب نہیں' میں 'اب' کو بل دار او
'نہیں' کو بغیر بل کا ظاہر کیا گیا ہے۔ حالاں کہ اصولاً 'نہیں' کے آخری صوت رکن پر بل ہوتا

چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ جملے میں آگر اب نہیں، ایک مرکب کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس کی وجہ سے اب پر بل ہو گیا ہے۔ یہ ذہن نشین رہے کہ کلام منظوم میں مصرع کا آہنگ برقرار رکھنے کے لیے بعض اوقات صوت رکنی بل اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔

مندرجہ بالا تمام مثالوں میں پہلی سطر میں عروض رکن میں بل کا وقوع ظاہر کیا گیا ہے اور پھر اس کی دو قسم کی مثالوں میں بل کی نشان دہی کی گئی ہے۔ (الف) کے مصرعوں کا بل عروضی وزن کے بل کے مساوی اور متوازی ہے جب (ب) میں خلفشار ہے جس کی وجہ سے مصرعے غیر موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ بل کی شدید کار فرمائی آخری مثال کے دو مماثل مصرعوں میں کھل کر سامنے آتی ہے۔

ع وہ زماں اب نہیں باقی

اور

ع وہ زمانہ نہیں باقی

میں الفاظ کتنے مماثل ہیں۔ فرق برائے نام ہے لیکن اسی فرق نے بل کو درہم برہم کر دیا اور دوسرے مصرع کو غیر مترنم بنا دیا۔

خوش قسمتی سے ہماری بحروں کے مختلف اوزان کے ارکان اس ترتیب سے رکھے گئے ہیں کہ وہ بل کے صحیح وقوع کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر ان کی بجائے ایسے ہم وزن ارکان رکھ دیے جائیں جن میں بل کا غلط مقام پر ہو تو وہ غیر موزوں معلوم ہونے لگیں گے مثلاً اوپر کے دو اوزان کے ہم وزن یہ ارکان بھی ہو سکتے ہیں۔

۱۔ (و) فَعَل فاعلن فعِلن فعْلن

(ب) فعو لن فعولن فعْلن فع

۲۔ (و) فعْلن فعلن فَعَل فاعلن

(ب) مفعولن فاعلن فاعلن

ب کے اوزان سراسر غیر موزوں معلوم ہوتے ہیں حالاں کہ وہی شراب دوسرے شیشوں میں بھر کر پیش کر دی گئی ہے۔ عروض کے ایک وزن کے بارے میں شبہ ہوتا ہے کہ اس کے ارکان فطری بل کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔

متدارک مثمن مخلع فاعلن فَعَل فاعلن فعَل

اس وزن کے فطری آہنگ کا تقاضا ہے کہ فاعلن کے صوت رکن 'لن' پر بل دے کر پڑھا جائے تبھی مصرع موزوں معلوم ہوگا لیکن ہمارے قائم کیے ہوئے قواعد کے مطابق فاعلن کے پہلے صوت رکن 'فا' پر بل ہے۔ اگر اس وزن کو ان ارکان میں ظاہر کرتے

فع مفاعلن فع مفاعلن

تو بل نہایت مناسب مقام پر ہوتا لیکن بحر متدارک میں مفاعلن نہیں لا سکتے۔ اس وزن میں چند مصرعے دیکھیے۔ پہلے دو شعر عروض کی کتابوں میں سے لیے گئے ہیں

سنبلِ سیہ بر سمن مزن — لشکرِ حبش بر ختن مزن
رات دن دلا تو الم نہ کر — یہ ستم نہ کر یہ ستم نہ کر

— جوہر مراد آبادی مؤلف جوہر العروض

آشنا ہمارا چلا گیا۔

ان مثالوں میں ع رات دن دلا تو الم نہ کر۔ میں 'رات دن' کہتے ہوئے ایک سکتے کا احساس ہوتا ہے۔ کیوں؟ 'رات دن' میں 'را' پر بل ہے اور فاعلن میں بھی اسی کے مطابق صوت رکن 'فا' پر۔ پھر غیر آہنگی کیوں۔ سچ یہ ہے کہ مصرع کا فطری بل فاعلن کے صوت رکن 'لن' پر۔ میرے مؤلفہ مصرع ع آشنا ہمارا چلا گیا میں یہ نکتہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ مصرع 'آشنا' پر بالکل دم توڑتا معلوم ہوتا ہے حالاں کہ 'آشنا' نہ صرف عروضی وزن کے لحاظ سے فاعلن کے برابر ہے بلکہ بل کے معاملے میں بھی فاعلن کا چربہ ہے۔ اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ اس مصرع کا وزن فع مفاعلن فع مفاعلن کہلاتا تو زیادہ مترنم ہوتا 'آشنا ہما' ، 'فع مفاعلن' کے ہم وزن ہوتے کے باوجود بل کے معاملے میں بالکل مختلف ہے۔

فعْ م فاْ ع لن فعْ م فا ع لن
آْ ش نا ہ ماْ را چ لاْ گ یا

ان تمام مثالوں کے تجزیے سے قطعی اور حتمی طور پر ثابت ہوجاتا ہے کہ اردو میں شعر کا وزن محض صوت رکن کے طول کا تابع نہیں بلکہ بعض اوقات صوت رکنی بل کے اشارۂ چشم پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔ کبھی کبھی الفاظ کا بل اُردو شعر میں اسی شدت کے ساتھ اپنے وجود کا اعلان کرتا ہے جیسے انگریزی شعر میں۔

اُردو الفاظ کا رومن املا

اس مضمون کے لکھنے کا منشا یہ نہیں کہ راقم السطور کی رائے میں اُردو کو اپنا رسم الخط چھوڑ کر رومن رسم الخط اختیار کر لینا چاہیے لیکن چوں کہ بعض موقعوں پر اُردو الفاظ کو رومن رسم الخط میں لکھنے کی ضرورت درپیش آتی ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو کے رومن املا کو مستند کر لیا جائے تاکہ لکھنے اور پڑھنے میں غلطی کا احتمال نہ رہے۔

رومن رسم الخط کو انگریزی رسم الخط کے مترادف سمجھ لینا بڑی غلط فہمی ہے۔ رومن خط ایک ایسا لچک دار سانچہ ہے جو تھوڑی سی ترمیم کے بعد ہر زبان کی ضروریات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کا کتابچہ "اُردو رسم خط اور طباعت" نہایت مفید اور بصیرت افروز ہے۔ بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط .I. P. A رومن رسم الخط ہی پر مبنی ہے۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جس صحت کے ساتھ یہ رسم الخط کسی بھی زبان کی آوازوں کو ادا کرتا ہے، اس صحت کے ساتھ خود اس زبان کا رسم الخط بھی ادا نہیں کر سکتا۔ اُردو کو مخصوص موقعوں پر رومن رسم الخط میں لکھنے کے لیے کیوں نئی نئی علامات وضع کی جائیں جب کہ بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط کی نعمتِ عظمیٰ موجود ہے۔

رسم الخط کے مسئلے پر غور کرتے وقت یہ اوّلین اصول نہ بھولنا چاہیے کہ زبان کی اصلی اور بنیادی شکل تقریر ہے۔ تحریر تقریر کی پیش خدمت اور طابع ہے۔ رسم الخط کا کام تکلم کو زیادہ از زیادہ صحت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ لیکن یہ ترجمانی بیشتر ناقص رہتی ہے۔ جو رسم الخط تقریری تلفظ سے بغاوت کرے غاصب ہے۔ بہترین رسم الخط وہ ہے جو صحیح بھی ہو اور سہل بھی۔

اردو کی مختلف آوازوں کی صراحت پچھلے کئی مضامین میں کی جا چکی ہے۔ انھیں کو پیشِ نظر رکھ کر اُردو کی آوازوں کے لیے رومن علامات تجویز کی جائیں گی۔

ا۔ اردو میں تیرہ مصوتے ایسے ہیں جنھیں لسانیات سے ناواقف شخص بھی بآسانی شناخت

کر سکتا ہے۔ اگر ہم ان کے لیے علامات مقرر کر لیں تو ایک بڑی منزل طے کریں گے کیوں کہ انگریزی ہو کہ اُردو دونوں تحریروں میں مصوتے ہی بڑی الجھن ڈالتے ہیں۔

انگریزی خط میں سادہ زبر کے لیے کوئی متعین علامت نہیں جس کی وجہ سے اردو الفاظ کی بڑی مٹی پلید ہوتی ہے مثلاً chand کو چند پڑھیں کہ چاند۔ بہتر ہے کہ a کو آ کے لیے مخصوص کر دیا جائے اور فتحہ کے لیے صوتیات کی مشہور علامت ə اپنالی جائے۔ بقیہ خفیف مصوتوں کے لیے بھی بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط کے نشان لے لیے جائیں اور ان طویل مصوتوں کو ان کے آگے کولن کے طور پر دو نقطے بڑھا کر ادا کیا جائے مثلاً Khi:R زبر کو ə سے اور الف ممدودہ کو a: سے اس لیے پیش نہیں کیا گیا کہ ہماری نظریں a کو آ سے تعبیر کرنے کی خوگر ہو گئی ہیں۔

(۲) صوتیاتی تحریر میں غنائی مصمتوں کے اوپر ایک مد کا نشان ~ بنا دیا جاتا ہے اور بس۔ پرتگالی رسم الخط میں بھی یہی علامت اختیار کی گئی ہے۔ اردو کے رومن خط میں بھی نون غنّہ کے لیے یہی نشان استعمال کرنا چاہیے۔ مثلاً اونٹ ũ:ṭ

(۳) گذشتہ اصوات میں غنائی اصوات کے تجزیے میں اُردو کے خفیف غنائیوں کا بھی ذکر کیا گیا یہ ب۔ بھ۔ د۔ دھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ گ۔ گھ۔ ج۔ جھ۔ سے پہلے آتے ہیں جب کہ خالص غنائیت بقیہ تمام حروف کے قبل آ سکتی ہے۔ اسی لیے ان دونوں اقسام کے لیے ہم ایک ہی علامت ~ اختیار کر سکتے ہیں کیوں کہ غنائیت کی صورت میں ب۔ د۔ ڈ۔ گ۔ ج وغیرہ کے لیے ہم خود بخود خفیف غنائیہ شامل کر کے بولنے کے عادی ہیں۔ غنائیت کی یہ دونوں قسمیں ایک ہی سوتیے کی ہم صوت ہیں ایک صوتیے کے لیے اب جد کی ایک علامت کوئی بُرا اصول بھی نہیں۔ مثال طنبورہ tə̃bu:ra

(۴) اُردو کے غنائی مصمتوں میں م۔ ن کے علاوہ ںٓ (ŋ ɽə) بھی ہے۔ یہ ک۔ گ۔ گھ سے پہلے وصل ہو کر آتا ہے۔ اس کے لیے صوتیاتی نشان ŋ موزوں ترین ہے مثلاً فرق ملاحظہ ہو

ڈنکا dəŋka منکا məŋka

(۵) تین معکوسی مصمتوں ٹ۔ ڈ۔ ڑ کو ٹائپ اور طباعت میں صوتیاتی رسم الخط کی علامات ʈ ɖ ɽ اور دستی تحریر میں نیچے نقطہ لگا کر ṭ ḍ ṛ سے ادا کیا جائے گا۔ ٹائپ میں نیچے نقطہ لگانا بار دہ ہوگا مثال

طباعت: کاٹ	kaʈ	ڈال	ɖal	تاڑ	taɽ
تحریر: کاٹ	kaṭ	ڈال	ḍal	تاڑ	taṛ

(۶) چند اور علامات کی تخصیص یوں ہوگی

چ (c) ج (J) گ (g) خ (x) غ (ɣ) ژ (ʒ) و (v) ش (s)

ز (z)

(۷) منفوس آوازوں اور ہائے مخلوط کو حسبِ دستور h کے شمول سے لکھنے میں کفایت اور دونوں کا حق ادا ہوتا ہے مثلاً کوڑا kora سرہانا sirhana

(۸) عربی کے مخصوص حروف میں متحد الصوت حروف کو محض ایک علامت سے ادا کیا جائے مثلاً ز۔ ذ۔ ض۔ ظ سب کو z سے لکھا جائے۔

(۹) جس طرح بعض مصوتوں کا طول ظاہر کرنے کے لیے ان کے آگے دو نقطے لگائے جائیں گے اسی طرح تشدید ظاہر کرنے کے لیے مصمتے کے آگے دو نقطے لگانا ضروری ہے کیوں کہ تشدید دوہرا مصمتہ نہیں بلکہ ایک طویل مصمتہ ہے۔ دستی تحریر میں اگر حروف کے آگے نقطے لگانے میں دقت محسوس ہو تو حسبِ رواج تشدید کے لیے دو حروف ہی لکھے جا سکتے ہیں۔

(۱۰) ایک لفظ کے منفصل اجزا کا جوڑ دکھانے کے لیے hyphen (-) کا استعمال کیا جائے گا مثلاً قرآن qur-an

(۱۱) اردو کو رومن میں لکھتے وقت کسی بھی موقع پر بڑے (capital) حروف کا استعمال نہ کیا جائے گا۔ سب حروف برابر ہوں گے۔

اب ہم صوتیاتی تحریر کے ساتھ اردو کی مختلف آوازوں کی فہرست اور ان کا رومن یا بین الاقوامی صوتیاتی املا تحریر کرتے ہیں۔

مصمتے (حروفِ صحیح)

۱۔	پ	p	۸۔	دھ	dh
۲۔	پھ	ph	۹۔	ٹ	ṭ
۳۔	ب	b	۱۰۔	ٹھ	ṭh
۴۔	بھ	bh	۱۱۔	ڈ	ḍ
۵۔	ت	t	۱۲۔	ڈھ	ḍh
۶۔	تھ	th	۱۳۔	ک	k
۷۔	د	d	۱۴۔	کھ	kh

۱۵-	گ	g	۲۷-	ڑ	ɽ
۱۶-	گھ	gʰ	۲۸-	ف	f
۱۷-	ق	q	۲۹-	س	s
۱۸-	چ	c	۳۰-	ز	z
۱۹-	چھ	ch	۳۱-	ش	ʃ
۲۰-	ج	J	۳۲-	ژ	ʒ
۲۱-	جھ	Jh	۳۳-	خ	x
۲۲-	م	m	۳۴-	غ	ɣ
۲۳-	ن	n	۳۵-	ہ	h
۲۴-	ں	ŋ	۳۶-	و	v
۲۵-	ل	l	۳۷-	ی	y
۲۶-	ر	r			

۲۷- تشدید- حروف کے آگے (:) یا حرف کو دو بار لکھنا۔

مصوتے

۳۸-	واؤ معروف	u:	۴۵-	یائے معروف	i:
۳۹-	پیش معروف	u	۴۶-	زیر معروف	i
۴۰-	واؤ مجہول	o:	۴۷-	یائے مجہول	e:
۴۱-	پیش مجہول	o	۴۸-	زیر مجہول	e
۴۲-	واؤ لین	ɔ	۴۹-	یائے لین	ɛ:
۴۳-	الف ممدودہ	a	۵۰-	زبر مجہول	ɛ
۴۴-	زبر معروف	ə			

اتصال Juncture کی علامت (—)

مندرجہ بالا رسم الخط میں ایک علامت بھی ایجادِ بندہ نہیں۔ تمام علامتیں بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط سے مستعار ہیں۔ جو بولا جائے گا وہی لکھا جائے گا اور جیسا لکھا جائے گا ویسا ہی پڑھا جائے گا۔ اردو کے کسی بھی لفظ کا تلفظ (عربی تلفظ نہیں، فصیح اردو تلفظ) جس صحت کے ساتھ اس

رسم الخط میں قلم بند کیا جا سکتا ہے اتنی صحت کے ساتھ ادا کرنا نہ اُردو رسم الخط کے بس کا ہے نہ دیوناگری کا۔ ایسے عالم گیر، سہل، مانے ہوئے رسم الخط کے ہوتے ہوئے رومن حروف میں ہمیں کوئی اختراع کرنے کی ضرورت نہیں۔

آخر میں اس رسم الخط میں چند الفاظ کا املا ملاحظہ ہو۔

کیا (استفہام)	kya	کیا (فعل ماضی)	kiya
نہر	nɛhr	واقعہ	vaqea
معلی	moəl:a	معاً	m-ən
فائل	fail	فاعل	fa-il
مہندی	mẽhdi:	رب العالمین	rəb:ul-alimi:r.
سوتنتر	svətəntr	سوراجیہ	svrajya
شوال	Səuval		
صنعت براعت الاستہلال			sən-əte bəra-ətul-istehlal
جمعیت العلمار			Jəm-i: yətul-uləma
فیاض	fəiyaz	سکول	sku:l
ننگا	nəŋga	ٹھنکا	thənka

اُردو رسم الخط کی اصلاح

آزادی کے بعد اردو رسم الخط کی اصلاح کا سوال بڑا اہم ہوگیا ہے۔ اس موضوع پر متعدد حضرات نے غور کیا ہے جن کی متنوع تجاویز سے صفحات کے انبار رنگے پڑے ہیں۔ رسالوں میں وقتاً فوقتاً اس موضوع پر خیال آرائیاں دیکھنے میں آتی رہتی ہیں لیکن رسم الخط کی تمام تجاویز محض خیالی اور بارِ ہوائی ہیں کیوں کہ ان پر نہ عمل کیا گیا ہے نہ کیے جانے کی توقع ہے۔ رسم الخط کے معاملے میں زمانہ اس قدر قدامت پسند اور لکیر کا فقیر واقع ہوا ہے کہ اس موضوع پر نہ کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے نہ پڑھنے کو لیکن لسانیات سے کسی قدر روشناسی، اپنے رسم الخط کی بہتری کی خواہش اور پھر قلم فرسائی کی عادت نچلا بھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ ایک موہوم سی امید ہے کہ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں رسم الخط میں کچھ نہ کچھ اصلاحیں ہو کے رہیں گی۔ ان کے لیے مسالہ اس قسم کی انفرادی تجاویز ہی سے فراہم ہوگا۔

اُردو رسم الخط میں دو بڑی خامیاں ہیں:

(۱) تحریر میں تلفظ کی صحیح ترجمانی نہیں ہوتی۔ خصوصاً بعض ہندی الفاظ کا صحیح املا نہیں ہو پاتا۔

(۲) اُردو رسم الخط ٹائپ اور چھاپے کے نئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایک زبان کا رسم الخط اپنی زبان کے الفاظ ہی کے لیے موزوں ہوتا ہے جب تک اس میں مناسب تبدیلیاں نہ کی جائیں وہ دوسری زبانوں کے تمام الفاظ کو پوری صحت کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا۔ رومن رسم الخط میں ہندی الفاظ اور ناگری رسم الخط میں انگریزی الفاظ کا حق ادا نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اہم یہ ہے کہ ایک رسم الخط کم از کم اپنی زبان کے الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرنے پر اس طرح قادر ہو کہ سوا صحیح قرأت کے کوئی دوسرا تلفظ ممکن نہ ہو۔ اس تقاضے کو بھی سو فی صدی پورا نہیں کیا جا سکتا۔ تلفظ کو پوری صحت کے ساتھ ادا کرنے کا مدعی صرف بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط ہے لیکن وہ اس قدر پیچیدہ اور مفصل ہے کہ روزانہ کی ضروریات

کے ڈھب کا نہیں۔ گویا بہت سائنٹیفک ہونا کوئی نعمت نہیں لہٰذا ہمارا نصب العین صرف یہی ہونا چاہیے کہ ہمارا رسم الخط بڑی حد تک ہمارے الفاظ اور دوسری زبانوں کے ان الفاظ کو جن سے ہمیں سابقہ پڑتا رہتا ہے صحت کے ساتھ پیش کر سکے۔

دنیا کے قدیم ترین رسوم تحریر میں ایک مصر کا نقش مقدس ہے۔ اس میں صرف مصمتے تھے، مصوتے نہیں۔ اس کے بعد آنے والے سامی رسم الخط میں بھی اصلاً محض مصمتے تھے۔ سامی رسم الخط کی ایک شاخ سے بہت بعد میں عربی رسم خط کا ارتقا ہوا۔ یہاں بھی مصوتوں کو بڑی حد تک نظرانداز کیا گیا۔ اس میں پ۔ چ۔ گ۔ ژ۔ کے اضافے سے فارسی خط بنا اور اس میں ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ اور ہائیہ کے حروف کے شمول سے اُردو رسم خط کی تشکیل ہوئی۔ ہم سات طویل مصوتوں کو محض تین حروف ا۔ و۔ ے سے ظاہر کرتے ہیں۔ خفیف مصوتوں کے لیے علاحدہ حروف نہیں انھیں محض زبر۔ زیر۔ پیش کے نشانات سے ادا کیا جاتا ہے۔ مصوتوں کے لیے علیحدہ اور کافی نشانات نہ ہونے کی وجہ سے اُردو کا مکمل صوتی رسم الخط وضع کرنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ جب تک ہر آواز کے لیے ایک علیحدہ علامت نہ ہوگی اس وقت تک رسم الخط صوتی حیثیت سے اتنا مکمل نہیں ہو سکتا کہ غیر زبان والا محض اردو رسم الخط میں چھپی ہوئی کتابوں کے ذریعے ہمارے الفاظ کا صحیح تلفظ کر سکے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ علامات اس وضاحت سے اور اتنی کشادہ لکھی جائیں کہ آپس میں التباس اور غلط ملط نہ ہو سکے۔ حروف کے سروں کو ملا کر لکھنے سے جہاں متعدد فائدے ہیں وہاں یہ بڑا نقصان بھی ہے کہ اہل زبان کو بھی بعض اوقات صحیح لفظ پڑھنے میں زحمت ہوتی ہے مثلاً

۱۔ کٹرا مانک پور میں پہلے جزو کو ک ڑا پڑھا جائے کہ ک ٹ ر ا۔

۲۔ بنات النعش کے معنی معلوم نہ ہوں تو اسے ن ب ات النعش بھی پڑھا جا سکتا ہے، نبیرہ بمعنی نواسہ کو بہت سے لوگ ب ن ی رہ پڑھ لیتے ہیں کیوں کہ بنی بمعنی اولاد ہے۔ نعت (رسولؐ کی مدح) کو نغت (ڈکشنری) بھی پڑھا جا سکتا ہے، اور نغت کو نعت بھی۔ لفظوں کو غیر زبان والا ن ق ط و ں بھی پڑھ سکتا ہے۔ رجحان کو ر ح ج ان پڑھنے والے نایاب نہیں۔ جب تک رسم الخط میں حروف کے اجزا ملا کر لکھے جائیں گے ان غلطیوں کا امکان رہے گا۔ اُردو رسم الخط میں اگر بعض موقعوں پر حروف کو منقطع چھاپا جائے تو مصوتوں کا کیا کیا جائے۔ اس مضمون کے آخر میں اس مشکل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

انقلابی تجاویز بے سود ہیں۔ اس لیے ہمیں اُردو رسم الخط میں اصلاحوں کو صرف اہل زبان کی

ضروریات تک محدود کرنا پڑے گا یعنی ہم یہ فرض کرکے چلیں گے کہ اُردو رسم الخط میں عبارت کا پڑھنے والا اُردو الفاظ کے مفہوم اور استعمال سے بڑی حد تک واقف ہے۔ اگر رسم الخط ایسا ہو جائے کہ مبتدی اہلِ زبان اور ثانوی زبان کی حیثیت سے سمجھنے اور بولنے والے اغیار (مثلاً مراٹھے، گجراتی، بنگالی) اسے صحیح پڑھ سکیں تو بڑی بات ہوگی۔ انھیں حدود میں محصور رہ کر ذیل میں کچھ تجاویز پیش کی جاتی ہیں۔ پیشتر بھی میں اس موضوع پر اظہارِ خیال کر چکا ہوں۔ آیندہ سطور میں بعض نئی تجاویز شامل ہیں اور بعض پرانی تجاویز کو ترمیم و ترقی کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے تاکہ ایک جامع تصویر سامنے آسکے۔ ان میں سے بعض تجاویز اصلاً دوسرے حضرات کی ہیں۔ یہ اصرار نہیں کہ انھیں فوراً قبول کر لیا جائے صرف یہ منشا ہے کہ اگر کوئی با اثر ادارہ اُردو رسم الخط میں اصلاح کرے تو ان تجاویز پر بھی گوشہ چشمے کرے۔ مجوزہ علامات صرف مبتدیوں کے لیے یا ان مواقع پر جہاں کسی مخصوص لفظ کا صحیح تلفظ ظاہر کرنا مقصود ہو استعمال کی جائیں گی، بقیہ مقامات پر انھیں حسبِ دستور حذف کرتے رہیں گے۔

اردو میں تیرہ مصوتے ایسے ہیں جنھیں صوتیات سے نابلد شخص بھی بآسانی پہچان سکتا ہے، ان کے لیے مجوزہ علامات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ دِل، کِس، والے زیر کو ہم زیر معروف کہیں گے کیوں کہ یہ یائے معروف کی خفیف آواز ہے۔ اسے حسبِ دستور سادہ زیر سے ادا کیا جائے گا۔ اس کے مقابلے میں سہرا، محنت، احترام، میں جو زیر ہے اسے زیر مجہول کہیں گے کیوں کہ یہ یائے معروف کی خفیف آواز ہے۔ اسے الٹے زیر سے ادا کیا جا سکتا ہے مثلاً سہرا۔ کاج چوں کہ زیر مجہول بہت کم الفاظ میں آتا ہے اس لیے اسے نامانوس علامت سے ظاہر کر سکتے ہیں۔

۲۔ درمیانی یائے معروف اور یائے مجہول کے لیے بعض حضرات نے کھڑے زیر اور سادہ زیر کی سفارش کی ہے مثلاً وزیر، میرا۔ اپنی تجویز نمبر ۱ سے مطابقت رکھنے کے لیے میری سفارش ہے کہ یائے معروف کو سادہ زیر سے اور یائے مجہول کو الٹے زیر سے ظاہر کیا جائے مثلاً وزیر، میرا۔ اگر الٹے زیر کی جگہ کھڑے زیر کو ترجیح دی جائے تو یہ کھڑا زیر یائے مجہول پر ہوگا یائے معروف پر نہیں۔ میرے نزدیک الٹے زیر کو اس لیے ترجیح ہے کہ اس میں معمولی زیر سے مماثلت برقرار رہتی ہے۔

۳۔ واؤ معروف کو الٹے پیش سے اور واؤ مجہول کو سیدھے پیش سے ادا کیا جائے جیسا کہ رواج ہے مثلاً مستور، شور۔

۴۔ گُل۔ بُلبُل کے پیش کو ہم پیشِ معروف کہیں گے کیوں کہ یہ واوٗ معروف کی خفیف آواز ہے۔ تحفہ۔ عہدہ۔ کہرام کے پیش کو پیشِ مجہول کہا جائے گا کیوں کہ یہ واوِ مجہول کی مختصر صورت ہے۔ باقاعدگی کا تقاضا ہے کہ پیشِ معروف کو الٹے پیش سے اور پیشِ مجہول کو سیدھے پیش سے ظاہر کیا جائے مثلاً بُلبُل تُحفہ۔ ابھی تک پیشِ معروف کو اس لیے سیدھے پیش سے لکھا جاتا ہے کہ ہمارے قواعد نویسوں کو پیش مجہول کا علم ہی نہ تھا۔

۵۔ گردن کے زبر کو زبر معروف کہہ سکتے ہیں اس لیے حسبِ معمول سیدھے زبر سے لکھیں گے۔ کہہ، شہر، محل کے مصوتوں کو زبر مجہول کہیں گے اس کے لیے الٹا زبر مخصوص کیا جا سکتا ہے مثلاً کہٰہ محٰل، حیات اللہ انصاری[۱] صاحب نے سادہ زبر، زیر اور پیش کے نشانات کو تھوڑا سا دائیں طرف کھینچ کر نشانات وضع کیے مثلاً کہنا، بہرا، تحفہ۔ میری رائے میں الٹا زبر، الٹا زیر اور پیش زیادہ سہل ہیں۔

۶۔ واوٗ لین اور یائے لین کو حسبِ دستور ماقبل مفتوح لکھا جائے مثلاً دَور، سَیر۔ جزم کو بدستور برقرار رکھا جائے۔

۷۔ الف۔ نون غُنّہ کو ہندی میں چندر بندو اور صوتیاتی اصطلاح میں غُنّائی مصوتہ کہا جاتا ہے لفظ کے آخر میں نون غُنّہ آئے تو اس میں نقطہ نہیں لگایا جاتا لیکن لفظ کے درمیان بڑی مشکل ہے ملاحظہ ہو سینک۔ گنوار وغیرہ۔ صوتیاتی رسم خط میں اس غُنّائیت کو (~) کے نشان سے ظاہر کیا جاتا ہے لیکن اردو میں چوں کہ ہم اس نشان کو الف ممدودہ کے لیے استعمال کرتے ہیں اس لیے ہمارے مصرف کا نہیں۔ ترقی اردو بورڈ پاکستان کی جانب سے ڈاکٹر شہید اللہ[۲] نے ایک املا نامہ شایع کیا جس میں درمیانی نون غُنّہ کے نقطہ پر ایک قوس کے اضافے کی سفارش کی مثلاً گنوار۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس میں اور ہندی کے چندر بندو میں خفیف سا فرق رہ جاتا ہے۔

ب۔ سنگھاڑا، ڈھنڈورا، مانگا، کوندا وغیرہ میں بھی نون غُنّہ ہے۔ گو اس "ن" میں بہت خفیف سا اعلانِ نون شامل ہو جاتا ہے۔ اہلِ زبان کو اس کے تلفظ میں کوئی التباس نہیں ہو سکتا کیونکہ ب۔ بھ۔ د۔ دھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ گ۔ گھ۔ ج۔ جھ۔ سے قبل نون غُنّہ ہمیشہ کسی قدر اعلانِ نون کے ساتھ

---

[۱] کشمیری زبان کے لیے ایک رسم الخط از حیات اللہ انصاری۔ اردو ادب دسمبر ۶۰ء ص ۵۴ و ۵۵

[۲] اردو اور دوسری زبانوں کا اردو میں املا اور صحیح تلفظ از ڈاکٹر شہید اللہ۔ قومی زبان بابت ۱۶ر اگست و یکم ستمبر ۱۹۵۹ء

ادا ہوتا ہے اس لیے اس نون غُنّہ کو بھی ہم الف والی شق کی مانند ایک قوس کے اضافے کے ساتھ لکھ سکتے ہیں مثلاً سنگھاڑا ، مانڈ ،

نونِ اعلان کے ساتھ اس کا امتیازی املا ملاحظہ ہو۔

خوانڈہ - خانڈان۔

منڈی داڑھی - منڈی کا عرق -

ن پر جزم کا نشان ظاہر کرتا ہے کہ یہ نون ساکن ہے اور اس میں اعلان ہے کہ نون غُنّہ پر کہیں بھی جزم کا نشان نہیں بنایا جائے گا۔

۸- اعلانِ نون اور نون غُنّہ سے مختلف اُردو میں ݩ کی آواز بھی ہے جو لفظ کے درمیان ک۔کھ۔گ۔گھ۔ سے مل کر آتی ہے۔ اسے کسی مخصوص نشان کے ذریعے ممیز کرنے کی ضرورت ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے اس کے لیے نون کے نقطے پر الٹے جزم کا نشان بنایا ہے ںٙ۔ ہم بھی اسے اختیار کر سکتے ہیں۔ ںٙ۔ نونِ اعلان اور نون غُنّہ کا فرق ذیل کے جوڑوں سے واضح ہو جائے گا۔

الف	سنگی	بھنگی
	منکا	ڈنکا
ب	منگانا	ننگا
	مانگا	مانگنا
	انگریز (بروزن مفعول)	رنگریز (بروزن فاعلات)

ان مثالوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ںٙ نون غُنّہ اور نونِ اعلان دونوں سے مختلف آواز ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے اب کچھ انگریزی اور ہندی آوازوں کا اُردو املا ملاحظہ ہو۔

۹- انگریزی لفظ لارڈ ، کانگریس کے مصوتے کے لیے ہندی میں ایک علیٰحدہ نشان ऑ وضع کیا گیا ہے۔ اصلاً یہ مصوتہ آ اور اَو (واؤ لین) کے درمیان ہے۔ ان میں بھی آ سے نزدیک تر ہے اردو بولنے والے اس مصوتے کو عموماً (آ) ہی بولتے ہیں اور اس لیے الف ہی سے لکھتے ہیں۔ اصلاحی رسم خط میں ہم اسی آواز کے لیے الف کی علامت کو بنیاد بنائیں گے اس کے بعد اس الف کو مائل بہ واؤ کرنے کے لیے اس سے پہلے حرف پر پیش لگا دیں گے اور جس طرح واؤ لین میں ماقبل فتحہ لگا کر واؤ کی آواز کو (آ) کی طرف موڑ دیا تھا اسی طرح الف کے قبل پیش لگا کر (آ) کی آواز کو (اَو) کی طرف موڑ دیں گے۔ اس طرح یہ علامت انگریزی مصوتہ کے لیے بڑی برجستہ ہو جائے گی مثلاً

لارڈ، گانگریس۔

۱۰۔ انگریزی لفظ Cheque ، pen وغیرہ کو عام اُردو تلفظ کے مطابق یائے لین سے پَین۔ چَیک لکھ سکتے ہیں لیکن اگر انگریزی کے مطابق خفیف مصوتہ ادا کرنا مقصود ہو تو حسب تلفظ ان میں زبرِ مجہول یا زیرِ مجہول کی علامت استعمال کی جاسکتی ہے۔

۱۱۔ چند عربی الاصل الفاظ میں آخری "و" سے پہلے کوئی ساکن مصمتہ ہوتا ہے مثلاً لغو، ہجو، عضو، یہاں واؤ ساکن بھی ہے مصمتہ بھی۔ ان الفاظ میں ہم اسے مصمتے کے طور پر پڑھنے کے لیے مجبور ہیں۔ اردو میں بقیہ تمام موقعوں پر ساکن واؤ کسی مصوتہ کی آواز ادا کرتا ہے مصمتہ کی نہیں لیکن انگریزی اور ہندی میں ساکن واؤ بطور مصمتہ بہت عام ہے مثلاً love مادھو، اوتار، ٹٹو۔ اب انھیں اگر اُردو میں اَوتار، مادھو لکھیں تو واؤ لین سمجھ کر औतार وغیرہ پڑھا جائے گا۔ ساکن واؤ کو مصمتہ ظاہر کرنے کے لیے مزید علامت کی ضرورت ہے۔ میری تجویز ہے کہ اس پر الٹا جزم (یعنی وْ) لگایا جائے اس میں یہ اشارہ بھی ملحوظ ہے کہ یہ واؤ مصمتہ ہوتے ہوئے بھی ساکن ہے۔ اب ہم اوْتار کو अवतार اور اوتار کو औतार پڑھیں گے۔

۱۲۔ اُردو میں ण کی جگہ ن بولنا ہی فصیح ہے۔ لیکن اگر کبھی کسی ضرورت کے تحت اس آواز کو ظاہر کرنا ہی مقصود ہو تو اس کے لیے ݨ بہترین علامت ہے کیوں کہ اس طرح اس کا رشتہ دوسری معکوسی آوازوں ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثال: کرشݨ۔

شمالی ہند میں ष کی آواز ہو بہو श کی طرح ہوتی ہے۔ مراٹھی اور دراوڑی زبانوں میں ان میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ چوں کہ ہمارے تلفظ میں ष کی کوئی اختلافی آواز ہی نہیں اس لیے ہم اسے بھی ش س سے ادا کریں گے۔

سنسکرت میں ऋ کو مصوتہ مانا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کے پہلے اور بعد میں کوئی مصوتہ نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں اس آواز کو مصوتے کے طور پر کیوں کر ادا کیا جاتا تھا۔ اب شمالی ہند میں اس کا تلفظ رائے مکسور اور مراٹھی میں رائے مضموم۔ چناں چہ شمالی ہند والے کرِشن، سنسکرِت بولتے ہیں اور مراٹھے کرُشن سنسکرُت۔ کہتے ہیں۔ چوں کہ ہماری زبانوں پر اس کا تلفظ محض رائے مکسور ہے اس لیے اُردو میں اس کے لیے کسی نئی علامت کی ضرورت نہیں۔

۱۳۔ عام اُردو قاعدے کے برخلاف ہندی اور انگریزی کے متعدد الفاظ کا پہلا حرف ساکن ہوتا ہے۔ مصوتے کے سکون کے لسانیاتی معنی یہ ہیں کہ اس کے آگے کوئی مصوتہ نہیں۔ ان صورتوں میں

لفظ کے شروع میں دو مصمتوں کا خوشہ واقع ہوتا ہے۔ مصمتی خوشہ کوئی انہونی اور عجوبہ بات نہیں۔ اردو میں مستعمل متعدد الفاظ کے آخر میں دو یا تین مصمتے ملتے ہیں مثلاً شرم۔ دولت۔ اِندر۔ راجیندر کرشن۔ شروع میں دو مصمتوں کا اجتماع پیار اور پیاس میں ہے لیکن انگریزی اور ہندی الفاظ کے شروع میں مصمتی خوشہ بہت عام بات ہے مثلاً ڈرامہ، کلب، سکول۔ پریم۔ ستھان۔ پریت۔ ان میں پہلے یا دوسرے مصوتے کو نصف سمجھنا ایسی غلط فہمی ہے جو صوتیات کی ابجد سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ ان الفاظ کا صحیح تلفظ ادا کرنے کے لیے پہلے مصمتے پر جزم کا نشان بنانا کافی ہے مثلاً: پْریم، کْلب شْکول۔

۱۴۔ لیے، دیے، بھیجیے ہمزہ سے نہیں ے سے لکھے جائیں۔

۱۵۔ عربی کے مخصوص حروف کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں[ا] کے دو اقوال ملاحظہ ہوں۔

"ذ۔ ض۔ ظ۔ ط۔ ث۔ ص وغیرہ۔ یہ تمام حروف ہیں صوت نہیں۔ اُردو رسم الخط کے لیے ایک طرح سے وبالِ جان بنے ہوئے ہیں۔ عربی فارسی کی لسانی روایت کی دھاک ابھی تک اس طرح قایم ہے کہ اصلاح کی تمام کوششوں کے باوجود ان سے چھٹکارا نہیں مل سکا ہے۔

"مصمتوں کے سلسلے میں ان زاید حروف کا ذکر بھی ضروری ہے جو عربی سے لیے گئے ہیں اور جو ہمارے حروفِ تہجی اور نظامِ درس کے لیے پیرِ تسمہ پا بنے ہوئے ہیں۔ میری مراد ذ۔ ض۔ ظ۔ ط۔ ث۔ ص۔ ح۔ وغیرہ سے ہے۔ صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مردہ لاشیں ہیں جسے اُردو رسم خط اٹھائے ہوئے ہے۔ صرف اس لیے کہ ہمارا لسانی رشتہ عربی سے ثابت رہے

چوں کہ یہ حروف کسی آواز کی نمائندگی نہیں کرتے اور اردو رسم خط سیکھنے والوں کے راستے میں سنگِ گراں ہیں، ان سے پیچھا چھڑا لینا سب سے بڑی اصلاح ہوگی۔ یہ ذہن نشین رہے کہ زبان کی اصلی اور بنیادی صورت ملفوظی ہے۔ تحریر کو تقریر کا تابع اور ترجمان رہنا چاہیے۔ ان مردہ لاشوں کے سپردِ خاک کیے جانے پر جو اعتراضات ہیں وہ مع جواب درج کیے جاتے ہیں۔

الف انھیں ترک کرنے سے مختلف المعنی لیکن متحد الصوت الفاظ میں التباس ہوگا۔ مثلاً علم اور الم

ا۔ اردو صوتیات کا خاکہ، مشمولہ اردو ئے معلّیٰ، دلی۔ لسانیات نمبر ص ۱۱۵، ۱۱۶

میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔ جواباً عرض ہے کہ آخر تقریر میں یہ التباس کیوں نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ سیاق و سباق سے ہم صحیح مفہوم سمجھ لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُردو میں اب بھی ایسے کئی الفاظ ہیں جن کے کئی معنی ہیں مثلاً بار بمعنی پھل، بوجھ، رسائی۔ دست بمعنی ہاتھ اور فضلہ۔ آب بمعنی پانی، چمک اور دھار۔ میل بمعنی گندگی اور التفات، تاب بمعنی چمک اور برداشت۔ عربی حروف کے ترک کر دینے پر ایسے کچھ اور الفاظ کا اضافہ ہو جائے گا لیکن جس طرح بولنے میں موقع و محل ہماری رہبری کرتا ہے اسی طرح تحریر میں بھی وہ ہمیں گمراہی سے بچائے گا۔

ب - دوسرا اعتراض عقیدے کی بنا پر ہے۔ مثلاً خدا کا ایک نام علیم ہے۔ اسے الیم (دردمند) کہنا گستاخی ہے۔ جواباً عرض ہے کہ خدانیت دیکھتا ہے رسم الخط نہیں۔ الہام کے ساتھ زبان کا تصور وابستہ ہے رسم الخط کا نہیں۔ الفاظ مقدس ہو سکتے ہیں۔ رسم تحریر محض خارجی ملبوس ہے۔ ہمارا رسم الخط عربی نہیں اُردو ہے۔ جس طرح انگریزی میں علی کو Ali اور ہندی میں अली لکھنا گستاخی نہیں اس طرح اُردو میں الی لکھنا کیوں گستاخی ہے، ہم عربی آوازیں کہاں ادا کرتے ہیں۔ ہندوستانی تلفظ میں علیم کو الیم ہی بولتے ہیں اس کے باوجود کسی گستاخی یا کفر کے مرتکب قرار نہیں دیے جاتے۔ اس کی عکاسی تحریر میں ہوگی۔

ج - "یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ لفظ اصلاً عربی کا ہے، فارسی کا کہ ہندی کا۔" عام پڑھنے لکھنے والوں کے لیے یہ پہلو قطعاً غیر اہم ہے۔ جنھیں زبان کے اس پہلو میں دلچسپی ہے ان کے لیے نور اللغات فرہنگِ آصفیہ وغیرہ کے موجودہ ایڈیشن رہبری کریں گے۔

د - "الفاظ سے تاریخ نکالنے کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔" جواب یہ ہے کہ اس فن کی ضرورت اسی وقت تک تھی جب طباعت کا فروغ نہیں ہوا تھا اور لوگ تاریخیں سینہ بسینہ یاد رکھتے تھے، اب کتابوں میں لکھی چھاپی جا سکتی ہیں۔ قدیم تاریخوں کے قلمی یا مطبوعہ نسخے موجود ہیں، جو ادب کے محقق ہوں گے وہ عربی کے مختلف حروف سے واقفیت حاصل کر کے تاریخوں کے معمّے حل کر سکیں گے۔ عوام کو ان سے زیر بار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

"ع" اردو کے تمام مصوتوں کی آواز دیتا ہے اسے ترک کر کے حسبِ ضرورت ا۔و۔ی۔ سے لکھنا چاہیے مثلاً اہدہ۔ نفا۔ تمتو۔ قانے۔

لفظ کے درمیان میں متحرک "ع" کی جگہ ہمزہ یا متعلقہ مصوتہ لکھا جائے گا مثلاً شعرا کو شئرا، شعار کو شآر، شعور کو شئور، ساکن مصوتوں کے بعد ہم موقوف "ع" کا تلفظ ادا کرنے پر قادر

نہیں۔ بہتر ہے کہ آیندہ اس سے پہلا حرف متحرک کر کے لکھا جائے مثلاً شمع کو شما۔ نظم میں جن الفاظ کے آخر میں "ع" یا "ح" موقوف ہے انھیں اس طرح لکھیں گے۔

ع : شم آ (شمع) ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک۔

ع : شب ہ (صبح) ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری

"ع" کے علاوہ ذیل کے حروف ترک ہوں گے۔

ذ۔ ض۔ ظ کی جگہ ز کا استعمال ہوگا۔

ث۔ ص کی جگہ س کا استعمال ہوگا۔

ط کی جگہ ت کا استعمال ہوگا۔

ح کی جگہ ہ کا استعمال ہوگا۔

ان حروف کے ترک کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اردو پڑھنے والے عربی، فارسی اور ہندی الفاظ میں امتیاز نہ کر سکیں گے اس لیے فارسی عطف و اضافت ہندی الفاظ کے ساتھ بھی جائز کرنی ہوں گی۔ کچھ عرصے بعد ہندی والے بھی عربی فارسی الفاظ کو شناخت نہ کر سکیں گے اور اس طرح ان الفاظ کو اپنی زبان میں نادانستہ طور پر کسی جھجک کے بغیر استعمال کر سکیں گے۔

آج کیفیت یہ ہے کہ جو حضرات لسانیات سے ذرا بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ ان حروف کو کلیتاً حذف کر دینے کے حق میں ہیں۔ پاکستان میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ ڈاکٹر محمد نصیرالدین[1] اور امریکی ماہر لسانیات ڈاکٹر عبدالرحمٰن بارکر[2] نے ان کے ترک کی سفارش کی ہے لیکن اگلے وقتوں کے جو بزرگ حرف اور صوت کے تعلق سے بے بہرہ ہیں جو خارِ رسوم و قیود کے سرگشتہ ہیں وہ اصلاح و ترقی کے ہر منصوبے کی طرح ان حروف کے ترک پر بھی چیں بہ جبیں ہو جاتے ہیں۔ ان سے عرض ہے کہ اپنے واقعی تلفظ کی طرف سے آنکھیں موند کر اگر کتابت کی بوالعجبیوں پر اڑے رہنے کا اس قدر شوق ہے تو اصلاحِ رسم الخط کا نام لے کر گناہ کا ارتکاب نہ کیجیے۔

۱۶۔ ہائے مختفی کی جگہ الف لکھا جائے مثلاً شعلہ کو شولا۔ اب عطف و اضافت میں بھی فرق آ جائے گا مثلاً شعلۂ طور کو شولائے تور لکھ کر مستفعلان کے وزن پر باندھنا پڑے گا۔

۱؎ اردو رسم الخط، مشمولہ قومی زبان، یکم اپریل ۶۰ء ص ۱۰

۲؎ پاکستان کے لیے رسم الخط، قومی زبان۔ یکم مارچ تا یکم جون ۶۱ء ص ۲۸

۱۷۔ طویل مصوتوں کے بعد آنے والے ئے اور ئی کبھی طویل ہوتے ہیں اور کبھی خفیف یعنی آئے آئی کبھی فاع کے وزن پر بولے جاتے ہیں کبھی فعلن کے وزن پر ذیل کے مصرعوں میں ان کا فرق ملاحظہ ہو۔

ا ع : آئے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
ع : ہونٹوں پہ ترے دیکھوں ہنسی آئی ہوئی سی
ب ع : تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آئے
ع : نہ آئی پر نہ آئی پر نہ آئی

تجویز یہ ہے کہ پہلی شکل میں ے یا ی پر ہمزہ نہ لگایا جائے۔ دوسری صورت میں ضرور لگایا جائے۔ چوں کہ ان کے طول یا اختصار سے الفاظ کے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے نثر کی حد تک ان میں امتیاز کرنا غیر ضروری ہے۔ نظم میں وزن کی خاطر املا کی اختلافی روش مفید ہو گی۔

۱۸۔ ہر لفظ کو تلفظ کے مطابق لکھا جائے مثلاً بِل کُل۔ فورن۔ زکات۔ آلا (اعلیٰ)۔ خُش۔ حیاتُلّا (حیات اللہ) دُمبا (دُنبہ)۔ تامبا (تانبا)

۱۹۔ الفاظ کے بامعنی اجزا علیحدہ لکھے جائیں مثلاً گل ستاں۔ مے خوار۔ تاب ناک۔

۲۰۔ لفظ کے جو اجزا تلفظ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بندھے نہ ہوں انھیں کم از کم ٹائپ اور چھاپے میں منقطع لکھا جائے۔ ایک یا زیادہ متحرک حروف کے بعد ایک یا زیادہ ساکن حروف مل کر اس قسم کا ایک جزو بنتا ہے مثلاً مختصر کے دو جزو مخ تصر ہیں۔ واضح ہو کہ یہ اجزا صوت رکن Syllable سے مختلف ہیں۔ 'مختصر' میں ہمارے اصول سے دو اجزا لیکن صوتیاتی نقطۂ نظر سے تین رکن ہیں۔ اجزا کو منقطع لکھنے سے صحیح تلفظ کے لکھنے اور پڑھنے میں بڑی سہولت ہو گی۔ اس تجویز کے عملی نمونے ملاحظہ ہوں۔

اِس تے مال (استعمال)، مُس تا جل (مستعجل) اہ میت (اہمیت) رس مُل خت (رسم الخط) من گل (منگل)، ان جمن (انجمن)

اصلاح سے جی چرانے والے حضرات کو مندرجہ بالا تجاویز پیچیدگیوں کا پشتارہ دکھائی پڑیں گی لیکن یہ یاد رہے کہ صحتِ املا کی کچھ نہ کچھ قیمت تو دینی ہی ہو گی۔ پھر دوسرے اعراب کی طرح نئی علامات کا استعمال بھی مبتدیوں تک محدود رہے گا۔ اچھے پڑھے لکھوں کے لیے انھیں محذوف سمجھا جائے گا۔

——◌——

ٹائپ اور طباعت میں اُردو رسم الخط کا سب سے بڑا مسئلہ حرفوں کی شکلیں اور کرسی کم کرنے کا ہے۔ انجمن ترقی اُردو ہند نے اردو رسم الخط کی اصلاح کے لیے حیات اللہ انصاری صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ جون ۶۳ء میں راقم الحروف نے موصوف کے پاس چند تجاویز روانہ کیں ـــ ۲۲ر جون ۶۳ء کے 'ہماری زبان' میں حیات اللہ صاحب کا مضمون 'اُردو رسم الخط اور املا کی اصلاح کے بارے میں چند تجویزیں' شایع ہوا۔ یہ مضمون میری تجاویز کے پہنچنے سے پہلے ہی تیار ہو چکا ہوگا۔ چوں کہ میری کئی تجاویز کا حیات اللہ صاحب کی تجاویز سے توارد ہو گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ میری تجاویز بالکل مالیخولیائی نہیں۔ اس لیے میں انھیں مشتہر کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

۱۔ ک اور گ کے مرکز کو ترچھا لکھنے کے بجائے پڑا لکھا جائے مثلاً کرنا۔ آگ

۲۔ الف سے پہلے وصل ہونے والے ک۔گ کو یوں لکھا جائے 'کا' کی بجائے کما۔ گانا کی بجائے گمانا۔

۳۔ کسی حرف کے بعد وصل ہونے والے د۔ڈ۔ذ۔ کو ر کی طرح نہ لکھ کر د۔ ڈ۔ ذ۔ ہی لکھیں مثلاً عدد (عدد) لذیذ (لذیذ)

۴۔ مندرجہ بالا تجویز ماننے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ر۔ڑ۔ز۔ سے پہلے کسی حرف کا وصل ہو تو اوپری سرے کی بجائے درمیان میں کیا جائے جس سے موجودہ د۔ ڈ۔ ذ۔ کی صورت ہو جائے گی مثلاً

مروجہ شکل	مجوزہ شکل
برا	بدا
لڑکا	لڈکا
مزا	مذا

۵۔ س۔ش۔ص۔ض۔ط۔ظ۔ع۔غ۔ف۔ق۔و۔ کے پہلے جوڑے جانے والے ب۔پ۔ت۔ٹ۔ث۔ن۔ی نیز ی کے پہلے جوڑے جانے والے ن کو اوپر نہ اٹھایا جائے بلکہ محض ایک شوشے سے لکھا جائے مثلاً

بھوسہ ۔ نوشہ ۔ بغل ۔ خوبی ۔ ثانی ۔

۶۔ کسی حرف کے بعد وصل ہونے والی ع اور غ کا منہ بھی بائیں جانب کی بجائے دائیں جانب ہی کھولا جائے مثلاً۔

بعد کی بجائے بعد۔ معنی کی بجائے معنی اور شمع کی بجائے شمع۔

۷۔ ج۔ چ۔ ح۔ خ سے پہلے وصل ہونے والے حرف کو آڑے خط کے ساتھ نہ لکھ کر محض شوشے کی شکل میں لکھا جائے اور اسے ج۔ چ۔ وغیرہ کے اوپری سرے میں ملانے کی بجائے ج۔ چ کے دائیں جانب کی وسطی نوک پر ملایا جائے۔ مثلاً

محنت کی جگہ محنت۔ بجا کی جگہ بجا۔ بخت کی بجائے بخت۔

چوں کہ ہم وصلی ع۔ غ کے منہ کو دائیں جانب سے کھولنے کی تجویز کر چکے ہیں اس لیے بخت کو ب۔ غ۔ ت پڑھنے کا احتمال نہیں۔

۸۔ م۔ ہ۔ ے سے پہلے ب۔ پ۔ ت۔ ٹ۔ ث۔ ن۔ کو ترچھے خط کی بجائے شوشے سے لکھا جائے مثلاً

بہا۔ نہا۔ تمام (تمام)

شروع میں یہ تجاویز محض ٹائپ اور طباعت میں رائج کی جا سکتی ہیں۔ جب نظریں ان سے مانوس ہو جائیں تو انھیں دستی تحریر میں قبول کرنے پر غور کیا جا سکتا ہے۔

مشترک رسمِ خط

ہندوستان کی تمام زبانوں کے لیے ایک رسم الخط کی بات بہت پرانی ہے۔ غالباً سب سے پہلے بال گنگا دھر تلک نے یہ آواز اٹھائی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں کاشی ناگری پرچارنی سبھا کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا[1] "ہندوستان کی تمام زبانیں ایک لپی میں لکھی جائیں تو کتنا اچھا ہو۔ اور وہ لپی دیوناگری ہی ہو سکتی ہے۔ جس طرح لارڈ کرزن نے پورے ملک کو ایک اسٹینڈرڈ ٹائم دیا ہے، اسی طرح سرکاری حکم سے ایک لپی بھی رائج کر دی ہوتی تو کتنا آسان ہوتا۔"

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ تلک کو احساس تھا کہ اور تو اور بنگالی اور گجراتی بھی دیوناگری کے حق میں اپنی لپی سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں ہوں گے۔[2] ۱۳ مئی ۱۹۰۵ء کو ڈاکٹر شیام سندر داس نے اسی موضوع پر بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ "بنگالی کہتے ہیں کہ ہماری (یعنی مراٹھی اور ہندی کی) دیوناگری مسخ شدہ ہے، اصل دیوناگری ان کی ہے؛ اور یہ کچھ غلط بھی نہیں کیوں کہ پُرانے شبد لیکھوں کے حروف بنگلہ لپی سے بالکل ملتے ہیں۔"

۱۹۰۵ء ہی میں کلکتہ ہائی کورٹ کے جسٹس شاردا چرن متر نے ملک کی سب زبانوں کے لیے دیوناگری لپی کی وکالت کی۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ لنکا، برما، چین، جاپان، سماترا وغیرہ میں بھی وہ دیوناگری رائج کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے ایک ماہنامہ "دیوناگر" نکالا جس میں ہندوستان کی اہم زبانوں کے کچھ اقتباسات دیوناگری میں چھاپے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے "ایک لپی وستار پریشد" قائم کیا جس کا ہر سال اجلاس ہوتا تھا۔ ۱۹۳۸ء تک مہاتما گاندھی بھی دیوناگری لپی کے حامی تھے۔ انھوں نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاسِ مدراس میں کہا کہ تامل ناڈ میں ۹۰ فی صد لوگ بے پڑھے لکھے ہیں۔ انھیں دیوناگری جیسی سہل لپی میں تامل پڑھائی جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اس عقیدے کے تحت گاندھی جی نے گجراتی میں اپنی "آتم کتھا" لکھی تو گجراتی کے بجائے دیوناگری لپی استعمال کی۔ آخر میں مہاتما جی ناگری اور اردو دونوں خطوں کے حامی ہو گئے۔

۱۹۴۸ - ۱۹۴۹ء میں ہند سرکار نے یونیورسٹی کمیشن مقرر کیا۔ اس کے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن نے تمام زبانوں کے لیے مشترکہ رسم الخط کی بات اٹھائی اور کہا[۱۰] کہ "دیوناگری نہ صرف ہندی اور مراٹھی کی لپی ہے، بلکہ سنسکرت کی بھی۔ اس طرح ہندوستان کی تمام زبانوں کو ایک لپی میں لکھنا ہے، تو کثرتِ استعمال کی بنا پر دیوناگری ہی اس کی مستحق ہے۔" آفیشل لینگویج کمیشن کی رپورٹ ۱۹۵۶ء میں بھی یہ سوال اٹھایا گیا ہے اور دیوناگری کی پُرزور وکالت اور رومن کی تردید کی گئی ہے۔ پارلیمنٹ کی ہندی انجمن (سنسدیہ ہندی پریشد) ایک رسالہ "راج بھاشا" نکالتی ہے۔ اس میں ملک کے اس وقت کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے لکھا تھا[۱۱] کہ "ہندوستان کی تمام زبانوں کو دیوناگری میں لکھا جائے تو بڑی سہولت ہو، لیکن چوں کہ دراوڑی زبانوں کے لیے کسی قدر دقت ہو سکتی ہے اس لیے سردست ہندوستان کی آریائی زبانوں کے لیے ناگری لپی اختیار کر لینی چاہیے۔" اسی رسالے کے ایک اور شمارے میں آچاریہ ونوبا بھاوے نے بھی یہی خیال ظاہر کیا تھا۔[۱۲] انھوں نے تو یہاں تک کہا کہ جاپانی اور چینی زبانوں کو بھی اپنی بارہ لپی کو چھوڑ کر دیوناگری لے لینی چاہیے۔

مشترک رسم الخط کے معاملے میں دیوناگری کا واحد حریف رومن رسم خط ہے۔ مستشرقین نے اسے سنسکرت گرنتھوں کے لیے بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ پین سلوینیا یونیورسٹی کے سنسکرت کے پروفیسر ایڈگرٹن نے سنگھاسن بتیسی کے جملہ مخطوطات جمع کر کے اس کا مستند سنسکرت متن رومن رسم الخط میں چھاپا۔ پنچ تنتر کا مستند متن بھی رومن رسم الخط میں چھپ چکا ہے۔ انگریزی عہد میں فوج کو رومن میں ہندستانی پڑھائی جاتی تھی۔ مُنڈا بولنے والے قبائلی سو سال سے اپنی زبانیں رومن خط میں پڑھ رہے ہیں۔ رومن خط کی وکالت کرنا غداری یا وطن دشمنی نہیں۔ نیتا جی سبھاش چندر بوس بھی اس کے حامی تھے؛ ۱۹۲۸ء کے ہری پورہ کانگریس کے صدارتی خطبے میں فرمایا۔

I am inclined to think that the ultimate solution would be the adoption of a script that would bring us into a line with rest of the world. Perhaps some of our countrymen would gap in horror when they hear

of the adoption of the Roman script, but I would beg them to consider the scientific and historical point of view. If we do that we shall realise that there is nothing sacrosanct in a script so far as our masses are concerned. Since more than 90% are illiterate, it would not matter to them which script is introduced when they are educated.

یونیورسٹی تعلیم کی تاراچند کمیٹی نے بھی رومن رسم الخط کی وکالت کی تھی۔ مئی ۴۸ ۱۹ء میں ہندوستانی یونیورسٹی کے وائس چانسلروں کی کانفرنس ہوئی تھی جس میں کثرتِ رائے سے یہ طے پایا کہ ملک کی تمام زبانوں کے لیے رومن خط اختیار کیا جائے۔

رسم الخط کا مسئلہ ماہرینِ صوتیات کا میدان ہے۔ اہلِ سیاست اس میں خواہ مخواہ در آئے ہیں۔ ہندی کے علاوہ ملک کی دوسری زبانوں کے ماہرینِ لسانیات عام طور سے رومن خط کے حق میں ہیں۔ ہمارے ملک میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی علمائے لسانیات کے قافلہ سالار ہیں۔ بنگالی سے والہانہ عشق کے باوجود مشترک رسم خط کے طور پر رومن کی وکالت کرتے ہیں۔ اُردو میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور پروفیسر ہارون خاں شروانی رومن خط کے پُرجوش حامیوں میں سے ہیں۔ پاکستان میں بھی کبھی کبھی رومن خط کا نام سُننے میں آجاتا ہے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنے بعض مضامین اور تقریروں میں مخصوص اغراض کے لیے ہندی کو رومن میں لکھنے کا مشورہ دیا۔ مُسلم یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر جناب بدرالدین طیب جی نے غیر زبان کے طلبہ کو رومن خط میں ہندی پڑھوادی تھی جس کے باعث ان دونوں حضرات پر ہندی اخباروں نے بڑی لے دے کی تھی۔

ایک بات خیال میں رہے کہ محض ایک دو زبانوں سے ان کا رسم الخط بدلنے کا مطالبہ کرنا اور بات ہے اور ملک کی سب زبانوں کے لیے ایک مشترک رسم الخط اختیار کرلینے کی خواہش کا اظہار دوسری بات ہے۔ اس مضمون میں صرف دوسرے مسئلے سے بحث کی گئی ہے۔ ایک پہلو اور بھی ہے۔ کسی زبان کے بولنے والے خود اپنا مروج رسم الخط بدلنے کی تحریک کریں تو کوئی اعتراض نہیں لیکن کسی دوسری زبان والے ان سے یہ مطالبہ کریں کہ "تم اپنا رسم الخط بدل کر ہمارا

رسم الخط اختیار کرلو؛ ہم تو اپنے خط ہی پر قائم رہیں گے۔" تو اسی سے ان کی نیت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔ آفیشیل لینگویج کمیشن کی رپورٹ میں جسٹس تیجا سنگھ نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ مشترک رسم الخط کی تحریک ہندی سے ملتی جلتی زبانوں یعنی اُردو اور پنجابی کی مستقل اور آزاد حیثیت ختم کردینے کا حیلہ ہے۔[۱۶] واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے دستور میں ملک بھر کے لیے ہندی کو سرکاری زبان تسلیم کیا گیا ہے لیکن مقامی زبانوں کے لیے کسی مشترک رسم الخط کا کوئی مذکور نہیں۔ اس کے برعکس دستور کے سب سے اہم حصّے یعنی بنیادی حقوق میں ہر ایک زبان کے رسم الخط کے تحفظ کا وعدہ کیا گیا ہے۔ دستور کی متعلقہ دفعہ کے الفاظ یہ ہیں:-

> Sec. 29 (i) Any section of the citizens residing in the territory of India or any part there of having a distinct language, script or culture of its own shall have the right to conserve the same.

بمبئی میونسپل کارپوریشن نے ناگری دوستی کے جذبے کے تحت یہ طے کیا کہ سندھی کو عربی خط کے بجائے دیوناگری میں پڑھا جائے۔ چنانچہ کارپوریشن کے اسکولوں میں سندھی بچوں کو ان کی زبان ناگری خط میں سکھائی جانے لگی۔ کسی من چلے کے۔ جے۔ گولوانی نے بنیادی حقوق کی اسی مندرجۂ بالا دفعہ کے تحت کارپوریشن پر مقدمہ دائر کردیا۔ بمبئی ہائی کورٹ کے جسٹس دیسائی کے فیصلے پر کارپوریشن کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور اب سندھی اپنے رسم الخط ہی میں پڑھائی جارہی ہے۔ غرض یہ کہ جب تک آئین موجود ہے، اُردو کو کوئی شخص اپنا رسم الخط بدلنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔ قومی یک جہتی کانفرنس کے سامنے جب ایک رسم الخط کا سوال آیا تھا۔ تو سب زبانوں کے نمائندوں نے اس کی مخالفت کی اور یہ تجویز ترک کردی گئی۔ اس کے باوجود مقامی زبانوں کے بولنے والوں کے دلوں میں شبہات باقی رہے۔ آخر پنڈت نہرو نے ۴ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسۂ مدوراے میں اپنی تقریر میں یقین دلایا کہ کسی رسم الخط کو ہٹا کر اس کی جگہ دیوناگری کو جبراً نہیں ٹھونسا جائے گا۔ لیکن مشترک رسم الخط کے نام پر ہر طرف سے دیوناگری کا جو یلغار ہوتا رہتا ہے اس کو مدِنظر رکھتے ہوئے پوری طرح جانچ پڑتال کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر کبھی کچھ محدود اغراض کے لیے مختلف زبانوں کو واقعی ایک لپی اختیار کرنی پڑے تو اس کام کے لیے کون سی لپی بہترین رہے گی اور اُردو کو

کس کی تائید کرنی چاہیے۔

رسم الخط کے تین استعمال ہیں (۱) ہاتھ سے لکھنے کے لیے (۲) ٹائپ اور چھاپے کے لیے (۳) پڑھنے کے لیے۔

لکھنے کے لیے وہ خط بہترین ہے جس کے (ا) ہر حرف کو قلم کی ایک ہی کشش میں لکھا جا سکے، اور (ب) تمام حروف ملا کر لکھے جا سکیں تاکہ پورے لفظ کو لکھنے میں قلم کو بالکل اٹھانے کی ضرورت نہ ہو یا کم سے کم اٹھایا جائے۔

ٹائپ اور چھاپے کے لیے وہ خط موزوں ترین ہے جس کے سب حروف کی ہر موقع پر ایک ہی شکل ہو اور جس کا ہر حرف منقطع لکھا جائے۔ نیز حروف کی تعداد جتنی کم ہو اتنی ہی سہولت رہتی ہے۔

پڑھنے میں وہ رسم الخط بہترین ہے (ا) جس میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ صحیح پڑھا جا سکے اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر آواز کے لیے ایک اور صرف ایک حرف ہو اور ہر حرف کی ایک اور صرف ایک آواز۔ اس سلسلے میں مصوتوں (حروفِ علت) کی صحیح اور مکمل نمائندگی خاص طور سے اہم ہے۔ (ب) جسے تیزی اور آسانی سے پڑھا جا سکے۔ یہ مقصد اس لپی سے سب سے اچھی طرح حاصل ہوگا جس میں ہر حرف علیٰحدہ علیٰحدہ لکھا جائے۔ کچھ چیزیں علیٰحدہ علیٰحدہ رکھی ہوں تو باریک ہونے پر بھی فاصلے سے نسبتاً واضح نظر آ سکتی ہیں۔ ملی جلی ہوں تو ان کی علیٰحدہ حیثیت متعین کرنے میں نظر کو دقت ہوتی ہے۔

ایک عام پڑھا لکھا آدمی اپنی روزمرہ کی زندگی میں 'لکھنے' پر جتنا وقت صرف کرتا ہے پڑھنے پر اس سے کئی گنا زیادہ لگاتا ہے۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ زبانوں میں ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریریں پڑھنے کی ضرورت بہت کم پیش آتی ہے۔ زیادہ تر مطبوعہ یا ٹائپ شدہ مواد پڑھا جاتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دورِ حاضر میں کارآمد رسم الخط کے لیے لکھنے کی سہولت زیادہ اہم نہیں، بلکہ اصل ضرورت چھاپے اور مطالعے کی سہولت کی ہے۔

اردو رسم خط

لکھنے کے معاملے میں اردو رسم خط برا نہیں۔ یہ ایک قسم کی مختصر نویسی ہے جس کی وجہ سے اسے بہت تیزی سے لکھا جا سکتا ہے۔ دیکھنے میں بھی اردو تحریر بڑی خوشنما ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اردو خطاطی مصوری کی حدوں تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ خط اس دور کے لیے بہت موزوں تھا جب چھاپے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اب اس کی سب سے بڑی کمی یہی ہے

کہ یہ چھاپے کی مختلف قسموں مثلاً ٹائپ، لینوٹائپ، روٹیری، ٹیلی پرنٹر وغیرہ کے لیے بہت سست گام ہے، کیوں کہ اس میں سب حروف ملا کر لکھے جاتے ہیں اور مختلف موقعوں کے لحاظ سے ایک ایک حرف کے متعدد روپ ہوتے ہیں۔

پڑھنے کے لیے بھی یہ خط خاصا ناقص ہے۔ یہاں ایک ایک آواز کے لیے کئی کئی حرف ہیں اور بیشتر مصوتوں کے لیے کوئی حرف نہیں۔ حرفوں کے نہایت مختصر اجزا کو ملا کر ایک جا لکھنے کی وجہ سے گڈمڈ ہو جانے کا کافی امکان ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو رسم خط میں جو لکھا جائے وہ اسی صورت میں صحیح پڑھا جا سکتا ہے جب کہ ہم پہلے سے اس لفظ کے تلفظ اور مفہوم کو جانتے ہوں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ رسم خط اہلِ زبان ہی کے مصرف کا ہے۔ دوسری زبان والا اگر محض کتاب کی مدد سے اردو سیکھے تو وہ تلفظ کے معاملے میں کیا کیا گل نہ کھلائے گا۔ اگر اردو تحریر میں کسی دوسری زبان کا اجنبی لفظ، شہر یا انسان کا نام آجاتا ہے تو اہلِ زبان چکر میں پڑ جاتے ہیں کہ اس کا صحیح تلفظ کیا ہے مثلاً کارنیلیس، ایکلس، وللندیزی، ٹمبکٹو، ستندیہ، پینسلین جیسے الفاظ اردو خط میں صحیح پڑھنا ناممکن ہے تاوقتیکہ پہلے سے ان الفاظ کا تلفظ اور معنی معلوم نہ ہوں۔ حروف کا جو اختصار اور وصل لکھنے کے لیے خوبی ہے وہی سنگِ راہ بن جاتا ہے۔ بقائے اصلح و انسب کے اس دور میں یہ خط کبھی نہیں جیت سکتا۔

میکانکی ضرورتوں کے لیے ناکافی ہونے کی وجہ سے دوسری زبانوں کے لیے اس کا اختیار کیا جانا تو درکنار، خود اردو کے لیے بھی اس خط کی بقا کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ملک میں اُردو کے محدود استعمال کی وجہ سے جہاں تک اس زبان کی ضروریات کا تعلق ہے (اور اب ان میں نمایاں اضافہ ہونے کی کوئی امید بھی نہیں) یہ رسم الخط کام دے رہا ہے۔ اس لیے صرف اُردو کا رسم خط بدلنے کی تشویش نہیں ہونی چاہیے۔ ہاں اگر کسی وقت ملک کی سب زبانیں ایک مشترک رسم خط پر تیار ہو جائیں تو ہمیں یقین ہے کہ اکیلی اُردو اس اتحاد کی راہ میں حائل نہیں ہوگی اور مشترکہ متفقہ رسم خط کو قبول کرے گی۔ اس سے پہلے محض اردو کو اپنے رسم خط کی قربانی دینے کی ضرورت نہیں۔ ہاں اس میں کچھ اصلاحیں کر لی جائیں تو کافی ہوگا۔

پچھلے دنوں اُردو رسم خط کی تائید بالکل خلافِ توقع حلقے سے ہوئی۔ ہندی کے ماہرِ لسانیات ڈاکٹر بھولا ناتھ تیواری نے ایک مضمون[ؔ] میں ملک کی سب زبانوں کے لیے دیوناگری کی وکالت کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ میں نے ایک فرانسیسی، ایک کمبودی اور ایک امریکی کو لے کر ہندوستان کے

مختلف رسوم خط سکھانے کے الگ الگ تجربے کیے۔ ان کا نتیجہ یہ نکلا۔

۱۔ تامل، تیلگو، کنڑ، ملیالم اور اُڑیا کی نسبت دیوناگری رسم خط زیادہ آسان ہے اور کم وقت میں سیکھا جاسکتا ہے۔

۲۔ دیوناگری، بنگلہ اور گرمکھی میں لگ بھگ برابر وقت اور محنت کرنا پڑتی ہے۔

۳۔ گجراتی اور اُردو سب سے سہل ہیں۔

دیوناگری

دیوناگری لپی میں حروف اور الفاظ کے لکھنے میں قلم کو بار بار اٹھانا پڑتا ہے۔ پہلے دو حرف अ اور आ کو دیکھیے۔ چینی حروف کی طرح ہاتھ اور پاؤں پھیلائے پڑے ہیں۔ بھ اور جھ کی بالائی لکیر ٹوٹی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے انھیں لکھنا وقت طلب ہے۔ رومن کے مقابلے میں ہندی لکھنے میں بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ ہندی میں ٹائپ کرنے کی رفتار انگریزی کے مقابلے میں کافی کم ہوتی ہے۔ حروف کے متعدد جوڑوں کی وجہ سے پریس کمپوزنگ میں بھی ناگری کافی وقت لیتی ہے۔ حروف کو ملا کر لکھنے کی وجہ سے خط کو زیادہ باریک نہیں چھاپا جاسکتا اگر حروف باریک ہوں تو آپس میں گڈمڈ ہو جانے کا ڈر رہتا ہے۔ چھپائی پھیل جاتی ہے اور پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس رومن چھپائی میں چوں کہ ہر حرف علیحدہ لکھا جاتا ہے اس لیے یہ ممکن ہے کہ رومن حروف نہایت باریک ہونے کی صورت میں بھی پڑھے جاسکیں۔ آپ نے ریڈرز ڈائجسٹ کا ایک ڈیڑھ انچ سائز والا نسخہ دیکھا ہوگا۔ ہاتھ کی گھڑی پر چھپے ہوئے انگریزی حروف دیکھیے۔ اتنی باریک طباعت ہندی یا اُردو میں ممکن نہیں۔ ہندی اور انگریزی چھپائی پر فی صفحہ برابر لاگت آتی ہے، لیکن باریک ٹائپ کی وجہ سے رومن میں بہت زیادہ مواد آسکتا ہے۔ مدن گوپال نے اپنی کتاب میں ہندی اور انگریزی کے یکساں سائز کے کالم کے الفاظ کا شمار درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

ہندی روزنامہ ہندوستان	۲۲ سطر فی کالم	× ۶ لفظ فی سطر	۱۳۲ الفاظ فی کالم
انگریزی ہندوستان ٹائمس	۳۸ " " "	× ۶ " " "	۲۲۸ " " "
انگریزی اسٹیٹسمین	۳۹ " " "	× ۶ " " "	۲۳۴ " " "
اُردو ملاپ	۲۱ " " "	× ۱۱ " " "	۲۳۱ " " "
ہندی وشو بھارتی	۴۰ " " "	× ۱۰ " " "	۴۰۰ " " "
انگریزی انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا	۸۳ " " "	× ۱۰ " " "	۸۳۰ " " "

ریلوے ٹائم ٹیبل ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں میں چھپتے ہیں۔ میرے پیش نظر سنٹرل ریلوے کے ہندی اور انگریزی ٹائم ٹیبل (اپریل تا ستمبر ۱۹۶۵ء) ہیں۔ ان میں صفحات کا تقابل یوں ہے

	ہندی	انگریزی
پہلا ٹیبل بمبئی سے دلّی تک	۱۶ صفحے	۹ صفحے
دوسرا ٹیبل دلّی سے بمبئی تک	۱۷ صفحے	۱۱ صفحے

مدن گوپال صاحب نے پڑھنے سے متعلق بھی انگریزی اور ہندی کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔[۵] انھوں نے ایسے بچوں کو لیا جو ہندی اور انگریزی برابر کئی سال تک پڑھ چکے تھے۔ دونوں سے مقررہ وقت میں ہندی اور انگریزی کی عبارتیں پڑھوائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی میں پڑھنے کی رفتار انگریزی کے مقابلے میں ۳۰ سے ۵۰ فی صدی تک سست تھی۔

رومن کے مقابلے میں دیوناگری کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ اس کے استعمال پر قوم کا کتنا زیادہ وقت، محنت اور روپیہ خرچ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف ناگری خط کی خوبیاں یہ کہی جاتی ہیں: (ا) اس میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہی پڑھا جاتا ہے یعنی تلفظ کو صحیح صحیح لکھنا اور ظاہر کرنا ممکن ہے، (ب) یہ خط مکمل اور سائنٹیفک ہے۔ دیکھیں ان دعووں میں کہاں تک صداقت ہے۔

یہ تسلیم کہ ناگری خط تلفظ کو بڑی حد تک صحت کے ساتھ ادا کر دیتا ہے، لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ اردو ہندی میں موٹے طور سے ۱۳ مصوتے ہیں، لیکن ناگری میں صرف دس کے لیے علامتیں ہیں۔ خفیف اِے، خفیف اے اور خفیف اُو کے لیے اردو کی طرح ہندی میں بھی کوئی علامت نہیں۔ اس لیے اس خط میں کہنا، کہرام، سہرا، عوض جیسے الفاظ کا صحیح تلفظ نہیں ادا ہو سکتا۔ ناگری میں اَے اَئی۔ اَو۔ اَوٗ۔ میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا، جس کی وجہ سے پنڈت لوگ وَید، جَین، عورت وغیرہ کو وَئید، جَئین، عَئورت بولتے سنے گئے ہیں तैयार اور कौवा کو "تے یار" اور "کووا" بھی پڑھا جا سکتا ہے، تلفظ کے مطابق ان کا املا तइयार اور कउवा ہونا چاہیے۔

। है । मे । नही । लडको کے اوپر نون غنّہ کی علامت کے طور پر ایک نقطہ لگایا جاتا ہے جو دراصل انوسوار کی علامت ہے۔ اصولاً اس کی جگہ چندر بندو (ँ) ہونا چاہیے جیسا کہ यहाँ میں ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ہندی میں کسی قدر خلفشار ہے۔ رسم خط سے متعلق ایک کتاب[۲] کے ایک ہی صفحے پر ایک لفظ کو کہیں भाषाये اور کہیں भाषाऐं لکھا ہے۔ गाय کو य سے لکھا

جاتا ہے، حالاں کہ ہم یہاں ए بولتے ہیں نہ کہ य۔ کنیا (لڑکی) میں 'ن' کو مشدد بولا جاتا ہے لیکن ہندی میں غیر مشدد لکھتے ہیں سंयम کا تلفظ ہم عموماً सइयम کرتے ہیں۔ जय اور विशय کو تلفظ سے بے نیاز ہو کر य سے لکھنے پر اصرار ہے حالاں کہ انھیں जै اور विशै بولا جاتا ہے۔

ہندی رسم خط کے سائنٹیفک ہونے کا دعویٰ کچھ ایسا بار بار دہرایا گیا ہے کہ غور کیے بغیر سب اس پر ایمان لے آئے ہیں، حالاں کہ اس کے سائنٹیفک ہونے میں شبہ ہے۔

(۱) فنِ تحریر کے ارتقا میں کئی منزلیں پیش آتی ہیں۔ تصویری، تصوری اور صوتی۔ صوتی منزل کے بھی دو حصے ہیں صوت رُکنی اور ابجدی۔ ابجدی رسم خط فن تحریر کے ارتقا کی معراج ہے۔ جدید زبانوں کا رسم خط عام طور پر ابجدی ہے لیکن ناگری اب بھی جزوی طور پر صوت رُکنی اور جزوی طور پر ابجدی ہے۔ اس کے مصمتوں کو صوت رکن فرض کر لیا گیا ہے یعنی یہ واحد آوازیں نہیں بلکہ دہری آوازیں ہیں جن کے آخر میں خفیف مصوتہ अ بھی شامل ہے لیکن حسبِ ضرورت اسے حذف بھی کر دیا جاتا ہے اور اس پر کوئی سکون کا نشان (ہلنت) نہیں لگایا جاتا۔ द دّ میں پہلے द میں अ شامل ہے دوسرے میں نہیں اور دونوں لکھے ایک ہی طرح جاتے ہیں۔ یہ نہ صرف آخر میں عام ہے بلکہ لفظ کے درمیان میں بھی ہو جاتا ہے مثلاً पहले, निचला, लगभग, करते, आसपास کے وسطی ر، س، گ، چ اور ہ تحریر کے اعتبار سے مفتوح ہیں، لیکن تلفظ میں ساکن ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ ہندی کے مصمتوں میں अ کی آواز شامل ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں دوسرے مصوتوں کی وسطی صورت کو ماترا کی شکل میں ظاہر کیا جاتا ہے وہاں अ کی وسطی شکل کے لیے کوئی علامت مقرر نہیں کی گئی۔ اگر अ مصمتے کا لازمی جزو ہوتا تو का اور की کا تلفظ कआ اور कई ہوتا۔ درمیانی अ کی کوئی شکل معین نہ کرنے سے ہندی کو کتنی بڑی قیمت دینی پڑی ہے اس کا کسی کو اندازہ نہیں۔ شاید ذیل کی تفصیل سے یہ واضح ہو جائے۔

ہندی میں ایک افسانہ رائج ہے کہ بعض موقعوں پر مصمتے آدھے بولے اور اس لیے آدھے ہی لکھے جاتے ہیں حالاں کہ صوتیات کی مبادیات جاننے والا بھی بتا سکتا ہے کہ مصمتہ کبھی آدھا نہیں بولا جاتا۔ یہ یا تو پورا بولا جائے گا یا بالکل ہی نہیں بولا جائے گا۔ یہ کہاں کی سائنس ہے کہ बन میں पूरا न ہو اور बन्ना میں آدھا، शर میں پورا र ہو اور शर्म میں آدھا۔ शरम اور शर्म میں یہ فرق نہیں کہ ایک میں پورا ہے اور دوسرے میں آدھا، بلکہ یہ کہ پہلے میں "ر" کے بعد ایک مصوتہ

आ ہے جب کہ دوسرے میں "ر" اور "م" کے بیچ میں کوئی مصوتہ نہیں अ کے اس حذف کو دکھانے کے لیے مختلف حروف کے بیچ میں دیوناگری کو کیا کیا کھڑاگ کرنا پڑتا ہے۔ مسلسل دو یا تین مصمتوں کے جوڑ (سنیکت اکشر) کیسی کیسی انوکھی شکلیں اختیار کرتے ہیں یہ کسی نوآموز سے پوچھیے جسے اس کا تلخ تجربہ ہے۔ بلامبالغہ کئی سو شکلیں ہیں جو علیحدہ علیحدہ یاد کرنی پڑتی ہیں तद्भव جیسے لفظ میں نیچے لٹکتے ہوئے भ پر رحم آتا ہے

سنیکت اکشروں کے اس منڈی دل سے چھٹکارا پانے کا سہل علاج یہ ہے کہ درمیانی आ کے لیے بھی کوئی ماترا وضع کرلی جائے۔ فرض کیجیے یہ ماترا ایک ترچھی لکیر " / " سے ظاہر کی جائے۔ اب ہم کسی مصمتے کو آدھا نہیں لکھیں گے۔ صَدَر بہ دال مفتوح کو स/द/र اور صدْر بہ دال ساکن کو स/दर لکھیں گے۔ ستری۔ دھرم۔ پرچار۔ راشٹر۔ کرشی کو یوں لکھیں گے:

सतरी ध/रम पर/चार राषटर करषि

(۲) مصوتوں کی بارہ کھڑی میں अः ऋ کو بھی مصوتہ ظاہر کیا گیا ہے حالاں کہ یہ دراصل مصمتے ہیں۔ لطیفہ یہ ہے کہ ऋ کو مصوتہ ماننے پر اصرار ہے۔ حالاں کہ یہ سیدھا سادا रि ہے اور کچھ نہیں۔

(۳) تین خفیف مصوتوں یعنی مختصر اِے، مختصر اَے، مختصر اُو کے لیے کوئی نشان نہیں۔

(۴) ए ऐ کی سالم شکلیں یہ ہیں اور ان کی ماترائیں بالترتیب ◌े ◌ै ہیں، جس کے معنی یہ ہیں کہ ◌े ماترا ऐ سے مماثل ہے، اپنے سالم حرف ए سے نہیں ऐसा اور कैसा اور गए اور अ کے جوڑوں میں مماثل آوازیں مختلف انداز سے لکھی گئی ہیں۔

(۵) کئی حرفوں کی دو شکلیں ہیں۔ ہندی کی حد تک श اور ष کے تلفظ میں بھی کوئی فرق نہیں۔ ان میں سے ایک کو ترک کر دینا چاہیے۔

ایک آواز کے لیے ایک ہی نشان ہونا چاہیے لیکن ہندی میں مثلاً ایک र کی آواز کتنے طریقوں سے لکھی جاتی ہے ملاحظہ ہو۔

रस , धर्म , प्रेम , ट्रेन , कृषि , ऋषि

ان چھ کے چھ لفظوں میں "ر" کی ایک ہی آواز ہے جس میں قطعاً کسی جگہ فرق نہیں۔

(۶) بعض نشانات اپنے ملفوظی مقام سے ہٹ کر لکھے جاتے ہیں ई کی ماترا کو مصمتے سے پہلے لگانا کتنا خلاف حقیقت ہے جیسے चन्द्रिका لفظ میں ई کی ماترا नद्रक سے پہلے لکھی گئی ہے

حالاں کہ بولی اُن کے بعد جاتی ہے पुनजीगररा , अनार्थी میں " ر " کی آواز بالترتیب
न اور अ کے بعد بولی جاتی ہے لیکن ان سے دور ہٹ کر لکھے جانے کی وجہ سے ان الفاظ کو
"پُن جارگرن " اور " انا یوں رٖ" پڑھا جائے تو زیادہ مناسب ہو گا۔

(۷) انوسوار سے کم از کم تین مختلف آوازوں کا کام لیا جاتا ہے لیکن ظاہر یہ کیا جاتا ہے کہ
یہ ایک ہی آواز ہے۔ چنانچہ सगम , सत सबह میں تین مختلف آوازوں کے لیے
ایک ہی نشان استعمال کیا گیا ہے۔

(۸) کئی نشانات دو مصمتوں کا مجموعہ ہیں क्ष - त्र - ज्ञ انھیں یکسر خارج کر دینا
چاہیے۔ جس لپی میں اتنی کمیاں ہوں اسے سائنٹیفک کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

اصلاح شدہ رومن یا صوتیاتی خط

چوں کہ لکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ ہر حرف کو ملا کر لکھا جائے
اور پڑھنے کا تقاضا یہ ہے کہ ہر حرف منقطع ہو اس لیے
رومن نے ان متضاد تقاضوں کو آسودہ کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ لکھنے اور چھاپے کے حروف کی
شکلیں مختلف کر دیں۔ رومن لکھائی میں قلم کو صرف " i " پر نقطہ لگانے اور " t " کو کاٹنے کے لیے
اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی کے مقابلے میں رومن لکھنے میں ۲۰ سے ۵۰ فی صدی تک
کم وقت لگتا ہے۔ ادھر منقطع ہونے کی وجہ سے پڑھنا بہت سہل ہو جاتا ہے۔ آپ نے سڑک پر
بس سے سفر کرتے ہوئے ہندی اور انگریزی میں کندہ سنگ میل دیکھے ہوں گے۔ موٹر تیز چل رہی ہو تو
ہندی میں لکھا ہوا شہر کا نام نہیں پڑھا جا سکتا جب کہ انگریزی میں لکھا ہوا پڑھا جا سکتا ہے۔

رومن رسم خط کے معنی لازماً انگریزی یا فرانسیسی کا خط نہیں۔ انگریزی اور فرانسیسی میں
ہجے کی جو بوالعجبیاں ملتی ہیں انھوں نے رومن کو بدنام کر دیا ہے۔ ان زبانوں میں مستعمل رومن خط
بدترین صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ برنارڈ شا کی وصیت کے مطابق انگریزی حروف ہجا میں جو
اصلاح ہوئی ہے اس میں کوئی ۲۱ حروف کا اضافہ کیا گیا اور دو حرف یعنی x اور Q نکال دیے
گئے ہیں۔ ایک طرف انگریزوں کی روایت پرستی ہے کہ وہ انگریزی املا کی کسی لغویت کو دور کرنے
پر رضامند نہیں ہوتی اور دوسری طرف انگریزی بولنے والی قوم کی یہ دھاک ہے کہ آج یہ رسم خط دنیا
کا مقبول ترین خط ہے۔ کوئی ۶۰ زبانوں نے اسے اختیار کر لیا ہے لیکن یہ ہر جگہ یکساں نہیں
اپنی اپنی زبان کی مخصوص ضروریات کے مطابق اس کے حروف کی آوازوں میں ترمیم کی جا سکتی ہے
مثلاً " t " اور " d " اطالوی، اسپانوی اور پرتگالی میں " ت " اور " د " کی آواز دیتی ہیں حالاں کہ

انگریزی میں اس سے مختلف ہے "Ch" انگریزی میں چ، فرانسیسی میں ش اور اسکاچ اور جرمن میں خ اور اطالوی میں ک کا قائم مقام ہے۔ ج کی آواز کے لیے انگریزی میں ز یا G ہے، ترکی میں C اور انڈونیشیا میں Dj

رومن کا مکمل اور بہترین روپ بین الاقوامی صوتیاتی تحریر ہے۔ ہندوستان کی ہر اہم زبان کے لیے اس کی علامتیں وضع کر لی گئی ہیں۔ ان کے امتزاج سے جو ہندوستانی I.P.A تیار ہوتا ہے اسے سہل کرنے کے لیے معمولی سی ترمیمیں کر لی جائیں، تو یہ بخوبی مشترکہ رسم خط کا کام دے سکتا ہے۔ اس میں مروجہ رومن کی خوبیاں تو ہیں مثلاً حروف کا منقطع لکھا جانا اور چھاپے کی سہولتیں لیکن یہ اس کی خرابیوں سے مبرا ہے۔ دوسری طرف دیوناگری جس بات پر فخر کرتی ہے یعنی املا اور تلفظ کی مطابقت وہ یہاں دیوناگری سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ اس خط میں ہندوستانی زبانوں کے تلفظ کو جس صحت کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے وہ خود ان زبانوں کے مخصوص رسم خط میں بھی ممکن نہیں۔ ہم ہندوستان کی تمام زبانوں کو ملا کر ایک مصنوعی مشترکہ زبان تو نہیں بنا سکتے لیکن ان کی آوازوں کے لیے ایک مشترکہ رسم خط ضرور ایجاد کر سکتے ہیں۔

رومن خط پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ "چوں کہ اس میں املا تلفظ کے مطابق نہیں اس لیے ہر حرف کے ہجے یاد کرنے پڑتے ہیں۔ ہندوستانی زبانوں کے لیے رومن خط اختیار کرنے سے اسی تکلیف کا یہاں بھی سامنا کرنا پڑے گا مثلاً DHARM کو ڈی، ایچ، اے، آر، ایم، کہنا کتنا مصنوعی لگتا ہے۔" لیکن یہ واضح ہونا چاہیے کہ ہم اس رسم خط کے حروف کو محض ان کی آواز کے نام سے پکاریں گے، جیسا کہ ناگری خط میں ہوتا ہے۔ D کو "ڈی" نہیں بلکہ ڈے اور R کو "آر" نہیں بلکہ "رے" کہیں گے۔ اسی طرح حروف کی ترتیب بھی صوتیاتی اصولوں کے مطابق ہوگی مثلاً:-

P- B- T- D- J- D- C- K- J- G- Q

ہماری زبان میں عام طور سے ۱۲ مصوتے ہیں۔ رومن میں محض پانچ نشانات ہیں۔ لیکن صوتیاتی خط میں ان سب کے لیے نشانات موجود ہیں۔ یہی حال مصمتوں کا ہے۔ اس طرح ترمیم شدہ رومن خط یا ترمیم شدہ صوتیاتی خط مروجہ رومن خط سے کسی قدر مختلف ہو جائے گا۔ ایک اور اعتراض یہ ہے کہ "اس طرح ایک ہی نشان کی آواز صوتیاتی خط میں کچھ اور، انگریزی خط میں کچھ اور ہوگی۔ مثلاً مروجہ انگریزی خط میں C کی آواز 'ک' یا 'س' ہے۔ صوتیاتی خط میں یہ

'چ' ہوگی۔ یا مثلاً x کو لیجیے۔ مروجہ خط میں یہ 'ک س' کا مجموعہ ہے۔ مجوزہ خط میں یہ 'خ' کی قائم مقامی کرے گا۔ اس کی وجہ سے بچوں کو دونوں خط سیکھنے میں بڑی مشکل ہوگی۔" لیکن رومن استعمال کرنے والے دوسرے ملکوں کا تجربہ اس کی تائید نہیں کرتا۔ روس۔ ترکی۔ انڈونیشیا میں انگریزی زبان روز بروز مقبول ہوتی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مروجہ رومن خط ہی میں پڑھائی جاتی ہوگی۔ اس کے باوجود اس کا ان زبانوں کے اپنے رومن اسلوب سے کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ روسی حروف تہجی میں سے اکثر رومن سے مشابہ ہیں، لیکن ان کی آواز میں فرق ہے۔ مثلاً روسی میں H "ن" کی اور P "ر" کے قائم مقام ہیں۔ روسی میں نہرو کے ہجے ہیں HEPY جو غالباً NERU کے برابر ہے آج روس کے اسکولوں میں ایک کروڑ بچے انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ یہی حال کئی دوسرے ملکوں کا ہے اگر ان سب کا ذہن ایک رسم خط سے دوسرے میں جاتے وقت نشانات کی مختلف آوازوں کو خلط ملط نہیں کرتا، تو آخر ہمیں کیوں الجھیں گے۔

آج ایک تامل یا اُردو بولنے والے کو تین رسم خط سیکھنے پڑتے ہیں۔ اپنی مادری زبان کا خط، رومن اور دیوناگری۔ اگر اصلاح شدہ رومن کو سب زبانوں کے مشترکہ خط کے طور پر مان لیا جائے تو محض ایک خط سے کام چل جائے گا کیوں کہ یہ مروجہ رومن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگا۔ ایک مزید پیپی دیوناگری کیوں سیکھی جائے۔ پھر یہ اصلاحی رومن خط صرف بین ہندستان خط ہی نہیں ہوگا۔ یہ دنیا بھر کا مشترکہ خط ہے۔ اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ کوئی ہندستانی زبان اپنا موجودہ خط چھوڑ کر دیوناگری خط اختیار کرنے پر رضامند ہو جائے۔ لیکن ترمیم شدہ صوتیاتی خط اپنا لینے میں تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔

اصلاح شدہ رومن کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس خط کے ہوتے ہوئے ہمیں سائنس، ڈاکٹری، انجینئرنگ وغیرہ کی بین الاقوامی اصطلاحوں کا اجنبی ہندی (یا سنسکرت) میں ترجمہ کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ کہا جاتا ہے تمام تکنیکی علوم میں کوئی بیس لاکھ اصطلاحیں ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ہم کہاں تک ان کا ترجمہ کریں گے اور ان چیستانوں کو کون سمجھے گا۔ ہم سائنس اور دوسرے موضوعات سے متعلق سب کچھ اصلاح شدہ رومن میں لکھ سکتے ہیں اور اس میں تمام مروجہ بین الاقوامی اصطلاحیں جوں کی توں برقرار رکھی جائیں گی۔ دوسرے لفظوں میں اگر رومن خط اپنا لیا جائے تو تمام علوم و فنون کی تعلیم آج ہی سے ہندی یا علاقائی زبانوں میں دی جاسکتی ہے۔ وہی اصطلاحیں جو دیوناگری کے ساتھ بے میل ہیں

رومن خط میں آسانی سے گھُل مل جائیں گی۔

۱۹۲۷ء میں ترکی میں پڑھے لکھوں کی تعداد صرف ۷ فی صدی تھی۔ رومن رسمِ خط اختیار کر لینے کے بعد ۲۰ فی صدی تک پہونچ گئی۔ انڈونیشیا میں آزادی سے پہلے حرف شناس بھی بہت ہی کم تھے۔ رومن رسم خط کا کمال یہ ہے کہ صدر عبدالرحمان سوکارنو کے بیان کے مطابق ۶۵ء میں خواندگی سو فی صدی ہوگئی۔ ہمارے ملک میں کشمیر کو چھوڑ کر سب سے زیادہ ناخواندہ لوگ ہندی ریاستوں میں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دیوناگری لپی میں (اور اردو میں بھی) خواندگی کو فروغ دینے کی کوئی خاص صلاحیت نہیں۔ اگر ملک کی سب زبانیں اصلاح شدہ رومن خط میں لکھی جانے لگیں، تو یقین ہے کہ خواندگی کی رفتار بہت تیز ہو جائے گی۔

جذبات دیوناگری کے حق میں ہوں تو ہوں لیکن عقل کی ہر دلیل اصلاح شدہ رومن کو مشترک رسمِ خط کے طور پر اپنا لینے کی تائید کرتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھیے کہ ہم وطن کی حدود میں محصور رہ کر خود کفیل نہیں ہو سکتے، یہ بین الاقوامیت کا زمانہ ہے۔

حواشی

(۱) دیوناگری لپی، سوروپ، وکاس اور سمسیائیں (ہندی) ص ۲۰ (ہندی ساہتیہ بھنڈار امین آباد لکھنؤ، ۱۹۶۲ء)۔

(۲) ایضاً ص ۲۴

(۳) ایضاً ص ۱۴۰

(۴) راج بھاشا ۷، رفروری ۱۹۵۷ء) ص ۲

(۵) "ہندوستان کی سبھی بھاشاؤں کے لیے ناگری لپی مانیہ ہو۔" از ونوبا بھاوے مشمولہ راج بھاشا (۲۴ مئی ۱۹۶۰ء) ص ۷

(۶) Official language commission Report. ص ۲۲۹

(۷) "راشٹریہ لپی کے روپ میں دیوناگری" مشمولہ دیوناگری لپی، سوروپ، وکاس اور

سمسیائیں۔ ص ۲۳۸

(۸) This Hindi and Devnagri از من گوپال ص ۳۸۰- ۳۸۱ (۱۹۵۳ء)

(۹) ایضاً ص ۲۹۰

(۱۰) دیوناگری لپی، سوروپ، وکاس اور سمسیائیں (ہندی) ص ۱۵۳

(۱۱) Roman or Devnagri از ڈاکٹر ایم اے گھاٹگے۔ مشمولہ دیوناگری لپی، سوروپ، وکاس اور سمسیائیں۔ (ہندی) ص ۵۰۴

(۱۲) ایضاً

(۱۳) اُردو رسم خط اور طباعت از ہارون خاں شروانی ص ۶۳

اُردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ

کسی قوم کی تشکیل کے لیے یگانگی اور یک جہتی کا شعور ضروری ہے۔ ہمارا ملک جو مختلف نسلوں، فرقوں، ملتوں اور لسانی گروہوں کا گلدستہ ہے کثرت کے بیچ وحدت کی کھوج کرتا ہے۔ بدقسمتی سے ہماری تاریخ میں ایسے یادگار ایام کم گزرے ہیں جب یک جہتی کا جذبہ تنوع کے احساس پر غالب رہا ہو۔ قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے والی قوتوں میں مذہب اور زبان پیش پیش رہے ہیں۔ آیندہ اوراق میں ہمیں زبان کے مسئلے کے ایک پہلو پر غور کرنا ہے

نطق انسانی اور زبان کے وجود میں آنے کی واحد علت ابلاغ وترسیل کی ضرورت ہے۔ یہ ابلاغ خیالات کا بھی ہوسکتا ہے جذبات کا بھی۔ لیکن ہمارے دیار میں اس بنیادی پہلو کو خاک تلے دبا کر زبان کو مقصود بالذات سمجھ لیا گیا۔ ایک صنم بنا دیا گیا۔ اُردو اور ہندی کے مسئلے پر سائنسی غیر جانبداری سے کم اور جذباتیت سے زیادہ غور کیا گیا۔ یہ علمی مسئلہ فرقہ وارانہ سیاست کا ایک شاخسانہ ہو کر رہ گیا۔ لیڈروں کو چھوڑیے، اس موضوع پر جب ہم اردو اور ہندی کے جید علما کی تحریریں پڑھتے ہیں تو ان میں علمی دلائل کے ساتھ طنز وتشنیع کی ایسی بوچھار، درپردہ مذہبی حملوں کا ایسا طوفان اور حقارت کے ایسے شعلے دکھائی دیتے ہیں کہ یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ دونوں گروہوں میں کون زیادہ زہر اگلتا ہے۔ ایسے میں "اُردو، ہندی، ہندوستانی" کے مصنف سید سجاد ظہیر کا متوازن نظریہ نسیمِ صبح کی طرح سکون بخشتا ہے۔

ذیل میں ان دونوں زبانوں کے باہمی تعلق یا عدمِ تعلق پر لسانی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے گا۔ سب سے پہلے یہ متعین کرنے کی ضرورت ہے کہ ہندی اور اُردو سے کیا مراد ہے۔

بعض اوقات بلکہ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک زبان جس علاقے میں بولی جاتی ہے، وہاں جغرافیائی اور تہذیبی اسباب کی بنا پر ممیز خطے قرار دے جا سکتے ہیں۔ ارتباط باہمی کی کمی کی وجہ سے ان کی مغائرت نمایاں ہوتی جاتی ہے جس کا سب سے بڑا مظاہرہ بولیوں کے اختلاف میں رونما

ہوتا ہے اس طرح ایک زبان مختلف بولیوں میں بٹ جاتی ہے۔ کئی صدیوں میں ان بولیوں کا اختلاف اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ ان کو الگ الگ زبان کہنا زیادہ درست ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان میں سے بعض بولیاں ختم بھی ہو جاتی ہیں۔ زبان اور بولی کا رشتہ بڑی الجھن میں ڈالنے والا ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ پڑوس میں بولی جانے والی دو زبانیں ایک زبان کی دو بولیاں ہیں کہ آزاد زبانیں ہیں۔ ایک مسلمہ اصول یہ پیش کیا گیا ہے کہ ایک زبان کی دو بولیوں کے بولنے والے ایک دوسرے کو بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں لیکن دو زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کے لیے ناقابلِ فہم ہیں۔

خرابی یہ ہے کہ سمجھنا ایک شخصی اور اضافی امر ہے۔ کس حد تک سمجھنے کو معیار قرار دیا جائے ایک بولی یا زبان کے بولنے والوں کے مختلف طبقات کی لسانی واقفیت بھی یکساں نہیں ہوتی۔ ایک اجڈ گنوار شاید پڑوس کی بولی بھی نہ سمجھ سکے۔ ایک پڑھا لکھا انسان پڑوس کی ایسی زبانوں کا بھی کچھ نہ کچھ مفہوم بھانپ لیتا ہے جس کا اس نے باقاعدہ درس نہ لیا ہو۔

ایک زبان کی مختلف بولیوں میں مختلف اسباب کی بنا پر کوئی بولی زیادہ اہم ہو جاتی ہے اور اسے معیاری زبان مان لیا جاتا ہے۔

ہندوستان کی جدید زبانیں گیارھویں صدی سے ابھرنا شروع ہوتی ہیں۔ گریرسن نے یوپی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بولی جانے والی بولیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ ایک کا نام مغربی ہندی رکھا اور دوسری کا مشرقی ہندی۔ پراکرتوں اور اپ بھرنشوں میں نئی زبانوں کے حسب نسب کی کھوج لگانا بڑا پیچیدہ کام ہے۔ پھر بھی ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ مغربی ہندی[۱] شورسینی پراکرت اور شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہے اور مشرقی ہندی اردھ ماگدھی پراکرت اردھ ماگدھی اپ بھرنش کی۔ مغربی ہندی پانچ بولیوں میں بٹ گئی۔ ہریانی۔ کھڑی۔ برج۔ قنوجی اور بندیلی۔ مشرقی ہندی کی تین شاخیں اودھی، باگھیلی اور چھتیس گڑھی ہیں۔ گریرسن نے راجستھان کی زبان کا نام راجستھانی قرار دیا۔ یہ اپ ناگر اپ بھرنش سے ارتقا پاتی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اپ ناگر اور

---

[۱] اس موقع پر ہم ڈاکٹر شوکت سبزواری کے اختلافی نظریہ کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ان کے مطابق شورسینی پراکرت اور اپ بھرنش ادبی بولیاں تھیں۔ دلّی اور میرٹھ کے علاقے میں عوامی بول چال کی زبان کا روپ دوسرا تھا۔ وہی روپ ارتقا پاکر کھڑی بولی بنا۔

شورسینی یا مغربی اپ بھرنش ایک ہی ہیں۔ بہار کی زبان کو مجموعی طور سے بہاری کہا گیا جس کی تین بولیاں میتھلی، مگھئی اور بھوج پوری ہیں۔ بھوج پوری کی بولی یوپی کی بنارس اور گورکھپور کمشنریوں میں بھی بولی جاتی ہے۔ یوپی کے باقی علاقوں کی زبان مشرقی اور مغربی ہندی ہے۔ ہریانی پنجاب کی انبالہ کمشنری کی زبان ہے۔ مدھیہ پردیش میں راجستھانی کی شاخ مالوی۔ مغربی ہندی کی شاخ بندیلی اور مشرقی ہندی کی شاخیں باگھیلی اور چھتیس گڑھی بولی جاتی ہیں۔

گریرسن نے اپنے لسانیاتی جائزۂ ہند کی جلد اول حصۂ اول باب ۱۵ میں چند صفحات ہندی اردو اور ہندوستانی کے بارے میں بھی لکھے ہیں۔ اس نے دو باتیں واضح کی ہیں: اول یہ کہ کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ ایک میں عربی فارسی الفاظ زیادہ ہوتے ہیں اسے اُردو کہتے ہیں۔ دوسری میں عربی فارسی کی جگہ سنسکرت الفاظ کی کثرت ہوتی ہے اسے ہندی کہتے ہیں۔ دونوں کے درمیان جو قدرِ مشترک ہے اس کا نام اس نے ہندوستانی قرار دیا۔ دوسرے یہ کہ ہندی سے دو معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ ایک تو سنسکرت آمیز کھڑی بولی اور دوسرے پنجاب اور بنگال کے درمیان بولی جانے والی تمام بولیاں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہاری اور راجستھانی کو بھی ہندی کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے گریرسن نے محض مغربی اور مشرقی ہندی کو ہندی قرار دیا۔ ڈاکٹر گراہم بیلی[1] کو بھی اس مشکل کا احساس ہے کہ کبھی ہندی میں اودھی، راجستھانی، برج اور بہاری بھی شامل کرلی جاتی ہیں اور کبھی اس کا مطلب محض اعلیٰ ہندی سے ہوتا ہے۔ وہ دلّی، سہارنپور اور الٰہ آباد کے درمیانی علاقے کو ہندی کا صحیح نمائندہ مانتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر میں بابو ایودھیا[2] پرشاد کھڑی بولی ہندی کے پُرجوش مبلغ تھے۔ وہ اودھی اور برج بھاشا کو ہندی تسلیم نہ کرتے تھے۔ چنانچہ چاروں طرف گھوم گھوم کر کہتے تھے کہ "ابھی ہندی میں کوِتا ہوئی کہاں۔ سور، تلسی، بہاری وغیرہ نے جس میں کوِتا کی ہے وہ تو بھاکھا ہے ہندی نہیں" لیکن آج تمام ہندی ادیب ان تمام بولیوں کو ہندی کہتے ہیں۔

شیام سُندر داس[3] دوسروں کی نسبت زیادہ متوازن نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ عام

---

[1] 'اردو اور ہندی کا تلفظ'، شایع شدہ بلیٹن اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز لندن۔ جلد ۲۔ حصہ ۳۔ ۲۳-۱۹۲۱ء
اردو ترجمہ شایع شدہ اردو ادب دسمبر ۵۶ء

[2] ہندی ساہتیہ کا اتہاس (ہندی میں) از رام چندر شکل ص ۲۰۰۲

[3] بھاشا وگیان (ہندی) طبع پنجم ص ۱۰۵ از شام سندر داس

بول چال میں جیسلمیر، انبالہ، شملہ سے لے کر مشرقی نیپال تک اور بہار سے لے کر رائے پور اور کھنڈوا تک کے علاقے کو ہندی کا خطہ کہا جاتا ہے لیکن لسانیات کی رو سے اس علاقے میں راجستھانی، بہاری پہاڑی، پوربی ہندی وغیرہ کئی زبانیں ہیں۔ وہ گریرسن اور ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کی تائید کرتے ہوئے مغربی ہندی کو ہندی مانتے ہیں۔ مشرقی ہندی کو بھی ہندی کے زمرے میں شامل کرنے کے روادار نہیں کیوں کہ اس کا نسب مغربی ہندی سے مختلف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ محدود معنی میں گریرسن اور چٹرجی نے مغربی ہندی نہیں بلکہ کھڑی ہندی ہی کو اصل ہندی مانا ہے۔ ڈاکٹر دھریندر ورما[1] بھی ہندی کے دو معنوں سے خبردار ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ معمولاً ادبی کھڑی بولی ہندی ہی کے لیے لفظ ہندی کا استعمال ہوتا ہے لیکن اس وسیع علاقے کی مختلف بولیوں کو بھی ہندی میں شامل کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر اودے نرائن تواری نے اپنی ہندی کتاب "ہندی بھاشا کا ادگم اور وکاس" کے چھٹے باب میں ہندی کی بولیوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مغربی ہندی، مشرقی ہندی اور بہاری کو ہندی کے ذیل میں لیا ہے لیکن راجستھانی کو نہیں۔

ہندی میں علاقائی حیثیت سے پھیلنے کا رجحان رہا ہے۔ شیام سندر داس[2] کی طرح دھریندر ورما[3] بھی ہندی کے زمرے میں پہاڑی کو گھسیٹ لیتے ہیں۔ پہاڑی کا علاقہ ہماچل پردیش، شمالی یوپی اور وادیِ نیپال ہے۔ وہ کٹھمنڈو کی بولی گورکھالی کو بھی ہندی کا جزو قرار دیتے ہیں۔

بظاہر یہ کیسی عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک زبان ہندی کئی اپ بھرنشوں اور کئی پراکرتوں کی ارتقا یافتہ شکل ہے۔ اگر مختلف بولیوں کا باہم سمجھ میں آسکنا ان کے ایک زبان ہونے کا معیار ہے تو بہاری اور راجستھانی کو ہندی کی بولی جاننے میں کوئی قباحت نہیں۔ بہاری بولیاں قواعد کے اعتبار سے بنگالی سے نزدیک ہیں لیکن تہذیبی اور ادبی رو سے مشرقی ہندی سے مماثل ہیں۔ ہاں پہاڑی[4] بولیوں کے بارے میں اتفاق کرنا مشکل ہے۔ پہاڑی بولیوں پر راجستھانی کے اثرات ہیں لیکن ان بولیوں کا مورث کھش اپ بھرنش کو بتایا جاتا ہے۔ آج پنجاب کے انبالہ ڈویژن، یوپی، بہار اور

---

[1] ہندی بھاشا کا اتہاس (ہندی)، طبع چہارم ص ۵۹

[2] بھاشا وگیان ص ۱۰۴

[3] ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۶۸

[4] راقم الحروف نے مسوری کے پہاڑی قلیوں کی زبان سنی۔ اس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آسکا۔

مدھیہ پردیش کو ہندی کا علاقہ کہا جاتا ہے اور واقعی ان مقامات کے باشندے اپنی زبان کے سہارے ایک دوسرے کا مطلب بخوبی سمجھ سکتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں لہٰذا ان کی بولیوں کو علیحدہ زبان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ان علاقائی بولیوں میں تصنیف و تالیف کا رواج گویا ختم ہو چکا ہے۔ ہندی (ہندوستانی) اس پورے علاقے کی معیاری، علمی اور مجلسی زبان ہے۔

اگر باہم سمجھ میں آنا ہی بولیوں کا رشتہ ظاہر کرتا ہے تو ہم اس مخدوش حقیقت سے کیوں کر منہ موڑ سکتے ہیں کہ ہندی کے علاقے والوں کو پنجابی سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ کھڑی بولی اور میتھلی، الفاظ کا تلفظ اور لہجہ جس قدر مختلف ہے ہریانی اور پنجابی کا اس قدر نہیں۔ آج سے پون صدی پیشتر جون بیمز[1] نے لکھا تھا:

"سیاسی اتفاق کی ایک مثال یہ ہے کہ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں ایک آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے کی بولی ایک زبان سمجھی جانے لگی گو حقیقتاً اسے بھوج پوری یا برج بھاشا سے زیادہ اس بات کا حق حاصل نہیں ہے۔"

عجیب بات یہ ہے کہ خود بیمز ہی آگے چل کر اس کی تردید کر دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "پنجابی کا ذخیرۂ الفاظ ہندی سے اتنا مختلف ہو گیا ہے کہ دونوں ایک ہی طرح نہیں سمجھی جا سکتیں۔" راقم الحروف کی رائے میں ہندوستانی بولنے والے لوگ مشرقی پنجابی تو سمجھ لیتے ہیں لیکن لہندا (مغربی پنجابی) کو نہیں سمجھ سکتے۔ گریرسن کی رائے میں پنجابی ایک ملواں زبان ہے جو لہندا اور ہندی کی آمیزش سے بنی ہے۔ محمود شیرانی گراہم بیلی اور ڈاکٹر زور اُردو (یعنی لسانی اصطلاح میں ہندی) کو کسی نہ کسی حد تک پنجابی سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ گویا ہندی اور پنجابی کی قرابت داری مسلّم ہے۔

پنجاب کے ہندو لیڈر ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے ایک مراسلے[2] میں انکشاف کیا ہے "چند ماہ پیشتر ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے الہ آباد میں ایک تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پنجابی اسی طرح سے ہندی کی ایک بولی ہے جس طرح میتھلی یا راجستھانی۔" نارنگ صاحب نے اس کی تائید میں لکھا ہے کہ پنجابی میں ۹۵ فی صدی ہندی الفاظ ہیں۔ بعد میں سوشلسٹ پارٹی کی مجلسِ عاملہ نے ایک قرار داد کے

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ مترجمۂ احتشام حسین۔ طبع دوم ص ۱۲۴

[2] شایع شدہ انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز بابت ۷ رفروری ۱۹۶۱ء

ذریعے پنجابی کو ہندی کی ایک بولی قرار دے دیا۔ اہلِ سیاست ماہرِ لسانیات بھی ہو گئے۔ کچھ عرصہ پہلے پنجابی اور ہندی نزاع اتنے ہی زوروں پر تھا جتنا کسی زمانے میں اُردو اور ہندی کا جھگڑا۔ ہم سیاسی بحث میں نہ پڑ کر فی الحال یہی مانیں گے کہ پنجابی ہندی سے علیحدہ زبان ہے۔ سوال یہ ہے کہ راجستھانی اور بہاری کو ہندی کہنا درست ہے کہ نہیں؟ ہماری مشکل کو حل خود ان بولیوں کے بولنے والوں نے کر دیا ہے۔ ان کی اکثریت نے اپنی مجلسی اور سرکاری زبان ہندی قرار دی ہے۔ ان بولیوں کی ادبی روایات وہی ہیں جو ہندی ادب کی۔ اس لیے بصورتِ موجودہ ان بولیوں پر ہندی کا اطلاق کرنے میں پس و پیش کرنا بے سود ہے۔

گریرسن نے کھڑی بولی کے دوسرے روپ اُردو کا بھی ذکر کیا۔ اُردو نے خود کو شروع سے آج تک محض کھڑی بولی کے ساتھ وابستہ رکھا لیکن اس میں بھی کسی حد تک بولیوں کا اختلاف ملتا ہے۔ اس میں کھڑی کے ساتھ ساتھ ہریانی اور دکنی بولیاں بھی ہیں لیکن ان بولیوں کا بنیادی ڈھانچہ کھڑی سے مختلف نہیں۔ ایک زمانے میں اردو کا ایک نام گجری بھی تھا۔ ڈاکٹر سُنتی کمار چٹرجی[1] نے لکھا ہے کہ اس کا گجرات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نام گجراں والا اور گجرات (پنجاب) کے دکن وارد سپاہیوں کا عطا کردہ ہے۔ چنانچہ دکنی شعراء شاہ برہان الدین جانم اور امین الدین دکنی نے اپنی زبان کو گجری کہا ہے۔ ڈاکٹر زور گجراتی کو دکنی سے علیحدہ بولی قرار دیتے ہیں لیکن وہ مذکورہ بالا شعرا کی گجری کو گجراتی نہیں مانتے بلکہ گجرات کے شاعر میاں خوب محمد کی مثنوی خوب ترنگ کو گجراتی کا نمائندہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی مثنوی[2] کی بنا پر انھوں نے دکنی اور گجراتی کے اختلافات درج کیے ہیں۔ بہر حال یہ اختلافات چنداں اہم نہیں۔ ان کی بنا پر گجراتی کو علیحدہ بولی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اردو ادب میں کھڑی بولی کے علاوہ دکنی اور ہریانی ادب بھی شامل ہے۔ آج کیفیت یہ ہے کہ حیدر آباد کے علاقے میں گفتگو کی بولی دکنی ہے لیکن کتابوں میں محض معیاری اُردو (کھڑی) ہی استعمال کی جاتی ہے۔ ہریانہ کے علاقے کے لوگ بڑی شدت کے ساتھ اپنی زبان کو ہندی کہہ رہے ہیں۔ اس طرح اردو میں اب محض دو بولیاں شامل ہیں، کھڑی اور دکنی۔

---

[1] بدقسمتی سے مجھے ڈاکٹر چٹرجی کی انگریزی کتاب انڈو ایرین اینڈ ہندی دستیاب نہ ہو سکی۔ اس کے ہندی ترجمہ "بھارتیہ آریہ بھاشا اور ہندی" مترجمہ گوپی ناتھ سیٹھ ۱۹۵۴ء سے کام چلایا۔ مندرجہ بالا بیان ص ۲۰۰ پر ہے۔

[2] ہندوستانی لسانیات طبع دوم ص ۱۰۶ تا ۱۱۰

گریرسن نے ہندی اور اردو کے ساتھ ہندوستانی کا بھی ذکر کیا۔ یہ اُردو اور ہندی کے آسان الفاظ پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر سینتی کمار چٹرجی نے ہندی کی ہندی کی اور ہندوستانی[۱] کے پانچ روپ قرار دیے (۱) اُردو (۲) اعلیٰ ہندی یا ناگری ہندی یہاں وہ ایک معرکے کا اعتراف کر گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اصل میں یہ مشرقی پنجاب نیز مغربی یو۔پی کے تعلیم یافتہ ہندوؤں کے گھر کی بھاشا ہے لیکن روزانہ کے کاروبار میں یہ لوگ بھی ہندی اور اُردو کے بیچ کی بھاشا بولتے ہیں۔ (۳) ہندوستانی اس میں دونوں کے آسان الفاظ ہیں۔ اس کا جھکاؤ ٹھیٹھ اسلوب کی طرف ہے۔ (۴) ورناکیور ہندوستانی یہ روہیلکھنڈ۔ میرٹھ۔ انبالہ ڈویژن اور دلی کی علاقائی زبان ہے (۵) سوقیانہ ہندی یا سوقیانہ ہندوستانی (Low Hindi) یہ ملک کے عوام کی مشترک مسخ شدہ بولی ہے جس میں قواعد کا خیال نہیں کیا جاتا۔ بعض مقامات پر چٹرجی[۲] نے بھی تین روپ یعنی اُردو، ہندی اور بازاری ہندی یا ہندوستانی تسلیم کیے ہیں۔

آزادی اور تقسیم ملک کے بعد ہندی اور اُردو کی آمیزش ختم ہوگئی۔ ہندوستانی بھی مہاتما گاندھی کے ساتھ ختم ہوگئی۔ آج ہندی والوں کا جو نقطۂ نظر ہے اس کی ترجمانی ڈاکٹر اودے نرائن تواری اس طرح کرتے ہیں کہ گریرسن[۳] کی ہندوستانی کوئی زبان نہیں۔ یہ دراصل سہل ہندی ہی ہے۔ وہ کھڑی بولی کو بھی ناگری ہندی[۴] کہتے ہیں۔

اس طرح اُردو جو کھڑی بولی یا ہندوستانی کا ایک روپ ہے ان کے مطابق ہندی کا روپ قرار پائے گا۔ اگلے مورخین ہندی کا اطلاق محدود معنی میں دلی، میرٹھ اور بریلی کمشنری کی بولی پر کرتے تھے اور وسیع معنی میں راجستھان، ہریانہ، یو۔پی، بہار اور مدھیہ پردیش کے علاقے پر۔ اب محدود معنی میں ہندی آخرالذکر مقامات کی علاقائی زبان ہے اور وسیع تر معنی میں پورے ملک کی قومی زبان۔ پہلے جس معنی میں ہندوستانی کا لفظ استعمال ہوتا تھا اب اسی مفہوم کے لیے ہندی کا لفظ بولا جاتا ہے۔

۱۔ انڈو ایرین اینڈ ہندی (ہندی ترجمہ) ص ۱۶۳

۲۔ ایضاً ص ۲۱۴

۳۔ ہندی بھاشا کا ادگم اور وکاس (ہندی میں) طبع اول ص ۱۹۳

۴۔ ایضاً پیش لفظ ص گ۔

لیکن ان اوراق میں ہم ہندی سے کھڑی بولی ہندی مراد لیں گے۔

گریرسن نے اپنے لسانیاتی جائزہ ہند جلد اول حصہ اول میں ہندی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کھڑی بولی ہندی کی ابتدا فورٹ ولیم کالج میں ہوئی۔ اس وقت وہاں کے ہندو مصنفین خاص کر للو لال اور سدل مسر نے اُردو سے عربی فارسی الفاظ نکال کر سنسکرت الفاظ داخل کیے تاکہ ہندوؤں کے لیے ایک مشترک زبان بن سکے۔

اس نظریے کو اُردو کے مورخوں[۱] نے بھی دہرایا۔ انھوں نے یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ عمل انگریزوں کے ایما پر ہوا تاکہ ہندو اور مسلمانوں میں افتراق پیدا ہو سکے۔ گویا کھڑی ہندی ایک مصنوعی زبان ہے جو فورٹ ولیم کالج میں اُردو کو مسخ کر کے بنائی گئی۔ دوسری طرف ہندی والے[۲] اردو کو ہندی کا بگڑا ہوا مصنوعی روپ قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سینتی کمار چڑجی[۳] اقبال کا یہ مصرع اور کسی کا یہ شعر نقل کرتے ہیں

ع کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

ے ترے دیدار کی مشتاق ہے نرگس بہ چشم وا
تری تعریف میں رطب اللساں سوسن زباں ہو کر

اور طنز کرتے ہیں کہ "مندرجہ بالا سطور کی زبان اور اسلوب دو صدی پرانے بھی نہیں۔ ان کو تین ہزار سال سے بھی زیادہ لمبی روایات رکھنے والی زبان کی جگہ دینے کی کوشش کرنا حمق ہے۔" گویا دونوں گروہ اپنے حریف کی عمر ڈیڑھ دو صدی تک محدود کرنا چاہتے ہیں جس سے کم از کم یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ انیسویں صدی سے پیشتر دونوں زبانوں کا رنگ روپ جدا نہ تھا دونوں کے راستے علیحدہ نہ ہوئے تھے۔ ہمیں یہ طے کر کے آگے بڑھنا چاہیے کہ کھڑی بولی پہلے کس روپ میں نمودار ہوئی۔

۱؎ ملاحظہ ہو ڈاکٹر زور: ہندوستانی لسانیات طبع دوم ص ۱۳۴۔ احتشام حسین: ہندوستانی لسانیات کا خاکہ طبع دوم ص ۶۸۔ ڈاکٹر محمد حسن: ہندی ادب کی تاریخ ص ۱۶۶۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری: داستان زبانِ اُردو ص ۷ و ۸ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۸ء

۲؎ ہندی ساہتیہ کا اتہاس از رام چندر شکل ص ۳۵۹

۳؎ انڈو ایرین اینڈ ہندی۔ ہندی ترجمہ ص ۱۳۹

یہ ظاہر ہے کہ کھڑی بولی نہ بیرونی فاتح لے کر آئے نہ یہ خلا میں پیدا ہو گئی۔ ہندوستان میں اس کی کوئی روایت، کوئی مورث کوئی آبا و اجداد رہے ہوں گے۔ کھڑی بولی کو مغربی ہندی کی شاخ قرار دیا گیا ہے جو شورسینی اپ بھرنش سے ارتقا پاتی ہے۔ رام چندر شکل اُردو والوں کے اعتراض کے جواب[۶] میں لکھتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج سے پہلے ہندی کی بولیوں میں برج بھاشا ادبی زبان تھی۔ کھڑی بولی کو ادب کے شایاں نہ سمجھا گیا تھا لیکن اس کا وجود تھا ضرور اور اس میں کچھ نہ کچھ ادب بھی تھا اس لیے آگے وہ اس ادب کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ ۱۸۰۰ء سے پہلے کھڑی بولی ہندی کا ادبی سرمایہ یہ ہے

(۱) اپ بھرنش کویوں کے کلام میں کھڑی بولی کی جھلک۔ اس سلسلے میں بجریانی سدھ اور ناتھ پنتھی جوگیوں کے دوہے (۸۰۰ء تا ۱۳۰۰ء) قابل ذکر ہیں۔ بعد میں ان کی زبان اپ بھرنش کے بجائے قدیم ترین کھڑی بولی ہو گئی۔

(۲) بیل دیو راسو اور پرتھوی راج راسو کے بعض حصے جو کھڑی بولی میں ہیں۔

(۳) پرتھوی راج کے دس پروانے۔ بیشتر علماء انھیں جعلی مانتے ہیں۔

(۴) خسروؔ کی شاعری۔

مذکورہ بالا میں سے کسی کا قدیم نسخہ نہیں ملتا۔ یہ صدیوں تک زبانوں پر جاری رہنے کے بعد معرضِ تحریر میں لائے گئے۔ اس لیے ان کی موجودہ شکلیں بہت مشتبہ ہیں ان کے بیشتر اجزا الحاقی ہیں۔

(۵) نامدیو اور کبیر کی شاعری۔ کبیر کا وہ کلام جو گرنتھ صاحب میں ہے یقیناً مستند ہے۔ ڈاکٹر دھریندر ورما ان میں سے کسی کی صحت[۷] سے پوری طرح مطمئن نہیں لیکن دوسرے علما ان کے بعض اجزا کو اصلی مانتے ہیں۔ اُردو میں اس عہد میں فارسی تاریخوں اور سفرناموں میں چند دیسی الفاظ ملتے ہیں اور صوفیا کے چند فقرے، چودھویں صدی کے آغاز تک اُردو میں کوئی مستقل تصنیف نہیں کی گئی۔ بابا فرید گنج شکر اور امیر خسرو سے جو کلام منسوب کیا جاتا ہے وہ زبان کی صفائی کی بنا پر اس دور کا نہیں ہو سکتا۔ پندرھویں صدی کی ابتدا سے اردو میں کھڑی بولی کے ادب کا ایک

---

۶ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۵۵

۷ ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۸۰

اٹوٹ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن ہندی میں ۱۸۰۵ء کے بعد۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے کی مسلم الثبوت متاع محض یہ ہے :

۱۔ گرو نانک کی کھڑی بولی کی شاعری۔

۲۔ عہدِ اکبری میں گنگ کوی کا رسالہ ' چند چھند برنن کی مہما ' نثر۔

۳۔ شیوا جی کے مدّاح بھوشن کے کلام میں کھڑی بولی کے بعض حصّے۔

۴۔ ۱۷۴۱ء میں رام پرساد نرنجنی کی بھاشا یوگ واشسٹ۔ نثر۔

۵۔ ۱۷۶۱ء میں مدھیہ پردیش میں پنڈت دولت رام کا ترجمہ جین پدم پران، نثر۔

۶۔ ۱۷۷۳ء اور ۱۷۸۳ء کے بیچ راجستھان کے کسی مصنف کا رسالہ منڈوور کا ورنن۔ بول چال کی نثر میں۔

۷۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں منشی سدا سکھ نیاز کا سکھ ساگر۔ نثر۔

فورٹ ولیم کالج میں آگرہ کے للولال نے کاظم علی جوآن کی شرکت میں شکنتلا اور بیتال پچیسی کا اور مظہر علی ولا کی شرکت میں قصہ مادھونل وکام کندلا اور سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ ہندی میں پریم ساگر لکھی۔ ان میں سے بیتال پچیسی اور سنگھاسن بتیسی اُردو اور ناگری دونوں میں شایع ہوئیں۔

رام چندر شکل رقم طراز ہیں کہ "پریم ساگر کے پہلے کی چاروں پستکیں بالکل اُردو میں ہیں۔"[1]

بہار کے سدل مسر نے ناسکیتو پاکھیان لکھی اور کالج کے باہر انشا نے اُردو ہندی کی مشترکہ کتاب رانی کیتکی کی کہانی۔ اس کے بعد پھر عرصے تک ہندی ادب کے افق پر سناٹا ہے۔ شکل جی اعتراف کرتے ہیں۔

"۱۸۰۳ء اور ۱۸۵۸ء کے بیچ کا دور نثر نگاری کے اعتبار سے بالکل صفر ہی ہے۔"

غدر کے بعد بھارتیندو ہریش چندر کا دور شروع ہوتا ہے اور ہندی میں باقاعدہ نثر نگاری کا سلسلہ چل نکلتا ہے۔ انیسویں صدی کے وسط تک کھڑی بولی کے ادبی سرمائے سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ذیل کے بزرگوں کے اعترافات ملاحظہ فرمایئے۔

گریرسن لسانی جائزہ ہند جلد اوّل حصہ اوّل باب ۱۵ میں رقم طراز ہیں۔

۱۔ ادبی زبان کی شکل میں ہندوستانی کے قدیم ترین نمونے اُردو میں ملتے ہیں۔

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۴۶۶

۲۔ کھڑی بولی ہندی میں نظم کا ایک طرح سے فقدان ہے

رام چندر شکل یہ ماننے پر مجبور ہیں

"آرنبھ کال کے چاروں لیکھکوں (سدا لال، للولال، سدل مسر، انشا) میں انشا کی بھاشا سب سے چٹکیلی، محاورے دار اور چلتی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ کھڑی بولی اردو کو تا میں پہلے سے بہت منجھ چکی تھی۔"[1]

ڈاکٹر دھریندر ورما تسلیم کرتے ہیں۔

(۱) تاریخی نقطۂ نظر سے ادبی کھڑی بولی ہندی کی نسبت کھڑی بولی اُردو کا چلن پہلے ہونے لگا تھا۔

(۲) قدیم اور وسطی عہد[2] (ابتداء سے ۱۸۰۰ء تک) میں کھڑی بولی کا وجود ابتداء سے تھا اگرچہ اس بولی کا استعمال ہندو کوی اور نیکھک ادب میں کوئی خاص نہ کرتے تھے۔ یہ مسلمانی بولی سمجھی جاتی تھی۔

(۳) کھڑی بولی[3] ہندی کا رواج نثری ادب میں انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں ہوا اور نظم میں بیسویں صدی میں۔

ڈاکٹر سینتی کمار چڑجی رقم طراز ہیں

(۱) ہندوستانی[4] کے اس اُردو روپ کا سترھویں صدی سے پہلے کوئی مقام ہی نہ تھا

(۲) انیسویں[5] صدی کی ابتدا میں ہندوستانی کے دونوں رخوں یعنی اُردو اور ہندی میں نثر کا آغاز ہوا۔ اردو میں شاعری کا رواج صدیوں سے تھا لیکن ناگری ہندی میں اس کی ابتدا ہونے کو تھی۔

(۳) انیسویں[6] صدی کے وسط میں ہندوؤں نے بھی ناگری ہندی (کھڑی بولی) میں شعرگوئی شروع کی۔

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۳۶۴

[2] ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۶۰

[3] ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۸۱

[4] ایضاً ص ۸۲

[5] ہندی ترجمہ انڈو ایرین اینڈ ہندی ص ۱۶۱

[6] ایضاً

[7] ایضاً ص ۲۰۵

مندرجہ بالا جائزے سے ہم ان نتائج پر پہونچتے ہیں ۔

(۱) کھڑی بولی کی ابتدا ہندی میں ہوتی ہے ۔

(۲) انیسویں صدی سے پہلے ہندی میں کھڑی بولی کے نمونے نہایت شاذ ہیں جب کہ اس وقت اردو میں قابلِ فخر ادبی ذخیرہ تیار ہو چکا تھا ۔

(۳) اُردو کی مقبولیت دیکھ کر انیسویں صدی کی ابتدا میں کھڑی بولی ہندی کا احیا ہوا اور اُسے اردو کے نمونے پر تیار کیا گیا ۔

(۴) کھڑی بولی ہندی میں ادب کی مسلسل باقاعدہ روایت غدر کے بعد سے ملتی ہے یا مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کھڑی بولی کی ابتدا ہندی روپ میں ہوتی ہے اور ارتقاء اردو روپ میں ۔

ہند کے دستور میں چودہ زبانوں میں سے ایک ہندی اور دوسری اُردو ہے لیکن اگر یہ دونوں کھڑی بولی ہی کا روپ ہیں تو ان کو علیحدہ زبانیں کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے ۔ سچ یہ ہے کہ لسانیات کی رو سے یہ ایک ہی ہیں ۔ جون بیمز[1] کا یہ فیصلہ ہے :

"کوئی یہ نہ کہے کہ اُردو ہندی سے الگ کوئی زبان ہے ۔"

سید احتشام حسین[2] بھی تسلیم کرتے ہیں ،

"حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے اردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں ہے ۔"

ہماری بحث کا موضوع اس وقت زبان ہے ادب نہیں ۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا اُردو اور ہندی دونوں کھڑی بولی کے دو روپ ہیں جن کی بنائے اختلاف رسم الخط اور لسانی سرمایہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو اور ہندی کی تفریق تحریر میں تو کی جا سکتی ہے لیکن اکثر اوقات گفتگو میں نہیں ۔ گفتگو کی زبان کو اب بھی قطعی طور پر نہ ہندی کہہ سکتے ہیں نہ اُردو ۔ وہ اب بھی وہی ہندوستانی ہے جس کا نام لینا ممنوع ہے ۔ بعض اوقات تو رسم الخط بھی ہماری رہنمائی نہیں کرتا ۔ ہندی میں بھگتی کال کے مسلمان صوفیوں کی نظمیں مثلاً مرگاوتی ، پدماوت ، چتراولی وغیرہ اور ابراہیم عادل شاہ کی نورس اردو رسم الخط میں وجود میں آئیں ۔ ان کے قدیم مخطوطے اُردو میں ہیں لیکن ہیں یہ ہندی ۔ انشا کی رانی کیتکی کی کہانی

---

[1] اے کمپریٹو گرامر آف دی ماڈرن آرین لنگویجز ص ۳۲ بحوالہ احتشام حسین ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۱۴

[2] ۔ لسانیات کا خاکہ ص ۱۳

کا مخطوط اُردو میں ہے لیکن اس پر ہندی ادب نے بھی اپنا قبضہ جمالیا ہے۔ راجہ شوپرشاد ستارۂ ہند کا بنارس اخبار ہندی میں نکلتا تھا لیکن اس کی اُردو نما زبان کی وجہ سے رام چندر[۱] شکل لکھتے ہیں کہ "پرچے کی زبان اُردو ہی رکھی گئی اگرچہ حروف دیوناگری کے تھے۔"

کچھ اور ایسی مثالیں ملتی ہیں جب رسم الخط ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔ اوسط اُردو اور اوسط ہندی میں کوئی فرق نہیں۔ بعض اوقات یہ مطابقت اتنی مکمل ہوجاتی ہے کہ ایک ہی ادب پارے کو اُردو والے اُردو کی اور ہندی والے ہندی کی پونجی قرار دیتے ہیں۔ انشا کی رانی کیتکی کی کہانی، اور فورٹ ولیم میں ترجمہ ہونے والی سنگھاسن بتیسی اور بیتال پچیسی اسی طرح اُردو ادب کی ملک ہیں جس طرح ہندی کی۔

بعض اوقات ایسے تعلیم یافتہ جاہلوں سے سابقہ پڑتا ہے جو اپنی ناواقفیت کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ عرب یا ایران میں اُردو بولی جاتی ہے۔ ہارون خاں[۲] شروانی لکھتے ہیں:

"دس بارہ برس ہوئے الٰہ آباد یونی ورسٹی سے ایک پروفیسر نے وہاں کے ایک مجلے میں ایک مضمون لکھا تھا جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اردو دراصل فارسی زبان ہی کی ایک شکل ہے اور اس مضمون میں خاص طور پر رسم خط سے استدلال کیا گیا تھا۔"

ڈاکٹر شوکت[۳] سبزواری کے مطابق اُردو کا لسانی سرمایہ تین اجزا پر مشتمل ہے

الف۔ مفرد الفاظ۔ اس میں اسما و صفات شامل ہیں

ب۔ افعال و حروف

ج۔ اصولِ صرف و نحو

ان میں سے مفرد الفاظ ہی میں عربی و فارسی کی آمیزش ہے لیکن اردو کی سرشت، اس کی اصل اس کے حسب و نسب پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ افعال و حروف اور اصولِ صرف و نحو چند مستثنیات کے سوا ہندوستانی ہی ہیں۔ تقابلی لسانیات میں سب سے زیادہ اہمیت افعال، ان کے مشتقات اور ضمائر کی ہوتی ہے۔ ان کے بعد حروف جار بھی ہماری رہبری کرتے ہیں۔ اعداد کے نام بھی زبان کے خاندان پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اردو نے ان میں سے کون سی چیز باہر سے لی۔

۱۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۴۷۵

۲۔ اردو رسم خط اور طباعت ص ۱۳

۳۔ داستانِ زبانِ اردو۔ اُردو۔ اپریل ۵۸ء ص ۲۱

اُردو کے عربی و فارسی عناصر کا تجزیہ یوں کیا جا سکتا ہے۔

(۱) عربی فارسی کے مفرد الفاظ جن میں سے بیشتر اسم اور کچھ صفات ہیں۔

(۲) عربی و فارسی کے سابقے ولاحقے جن کے دوش پر (اور بعض اوقات ان کی دست گیری کے بغیر) اُردو میں عربی فارسی مرکبات در آئے۔

(۳) فارسی و عربی اضافت۔ مثلاً سلطانِ عالم۔ بیت المال۔ کتاب الہند۔ عربی اضافت اُردو میں شاذ ہے۔

(۴) کہ بیانیہ۔ فارسی عطف۔ عربی و فارسی حروفِ جار مثلاً از سرِ نو۔ بر خود، درمیان۔ منجملہ۔ فوق الفطرت۔ بدولت۔ بالعموم

(۵) یائے نسبتی جیسے اکبر الٰہ آبادی۔

(۶) عربی ضمیر۔ یہ اُردو کے چند الفاظ میں پائی جاتی ہے مثلاً بعینہٖ۔ کماحقہٗ۔ بفضلہٖ۔ مستعار منہٗ۔

ان میں سے فارسی اضافت، عطف اور عربی و فارسی کے قاعدے اُردو کی فطرت میں رچ بس نہیں سکے۔ ان کی رسائی دیسی یعنی ہندی الاصل الفاظ تک نہیں ہو سکی۔ اُردو میں عربی وفارسی حروفِ جار اور عربی ضمائر کے استعمال پر اعتراض کیا جا سکتا ہے لیکن ان کا استعمال کم ہی ہوتا ہے۔ عربی و فارسی کے مفرد الفاظ و مرکبات کی ایک بڑی تعداد اُردو میں ہے لیکن دیسی سرمایہ سے کم۔ ان میں بہت سے الفاظ اور یائے نسبتی ہندی میں بھی دخل پا گئے ہیں۔ اُردو کی نوعیت کے بارے میں کسی قیاس کی ضرورت نہیں۔ خوش قسمتی سے سید احمد دہلوی نے فرہنگِ آصفیہ کے آخر میں اردو زبان کے ہر قسم کے الفاظ کی تعداد درج کر دی ہے۔

اس جدول کا خلاصہ درج ذیل ہے[2]۔

فرہنگِ آصفیہ میں شامل کُل الفاظ	۵۴۰۰۹
(۱) الف ہندی جس کے ساتھ پنجابی اور پوربی زبان کے بعض خاص الفاظ بھی شامل ہیں	۲۱۶۴۴

---

[1] ہندی میں استعمال ہونے والے عربی فارسی سابقوں لاحقوں کی فہرست کامتا پرشاد گرو کے ہندی ویاکرن (ہندی) میں ص ۴۲۵ تا ۴۴۲ پر درج ہے۔

[2] بحوالہ وضع اصطلاحات۔ مصنفہ سلیم پانی پتی ص ۱۵۶

	ب۔ سنسکرت	۵۵۴
	ج۔ پالی	۲
	د۔ مالاباری (ملیالم)	۱
	ہ۔ برہمی	۲
	خالص دیسی الفاظ کی میزان	۲۲۲۰۲
(۲)	اُردو۔ یعنی وہ الفاظ جو غیر زبانوں سے ہندی کے ساتھ مل کر بنے ہیں	۷۵۰۵
(۳)	الف۔ عربی	۷۵۸۴
	ب۔ فارسی	۶۰۴۱
	ج۔ ترکی	۱۰۵
	د۔ عبرانی	۱۱
	ہ۔ سریانی	۷
	مشرقِ وسطیٰ کی زبانوں کے الفاظ کی میزان	۱۳۷۴۸
(۴)	الف۔ انگریزی	۵۰۰
	ب۔ یونانی۔ لاطینی۔ فرنچ۔ پرتگال۔ ہسپانوی	۵۲
	یورپی الفاظ کی میزان	۵۵۲

چوں کہ گروہ ع۲ کے اردو الفاظ بھی ہندوستان ہی میں بنے ہیں اس لیے ع۱ اور ع۲ کی میزان ۲۹۷۰۸ اُردو کے لسانی سرمایے کا ہندوستانی عنصر ہے۔ اس طرح:

اُردو میں ہندوستانی الفاظ	۷۳½	فی صدی ہیں
اُردو میں سامی۔ فارسی اور ترکی الفاظ	۲۵½	فی صدی ہیں
اُردو میں یورپی الفاظ	۱	فی صدی ہیں

فرہنگِ آصفیہ کی ترتیب کے بعد اُردو میں عربی فارسی الفاظ کے بڑھنے کا کوئی امکان نہیں

لیکن انگریزی اور ہندی الفاظ یقیناً بڑھ گئے ہوں گے۔ آزادی کے بعد ہندی اصطلاحوں کا سیلاب آگیا ہے جن میں سے کچھ نہ کچھ اُردو کو بھی تر دامن کر گئی ہیں۔ اُردو کے ہندوستانی زبان ہونے کی تائید میں اگر کسی مزید شہادت کی ضرورت ہے تو سید مسعود حسن رضوی کے الفاظ میں اس کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ کتاب کی کتاب ایسی عبارت میں لکھی جا سکتی ہے جو فارسی عربی لفظوں سے بالکل خالی ہو اور اس کو ٹکسالی اردو کہیں لیکن ایک جملہ بھی ایسا نہیں بنایا جا سکتا جو ہندی الفاظ سے بالکل خالی ہو اور اس کو اُردو قرار دے سکیں۔[۱]

اُردو نے اگر اپنا دامن تقریباً ۲۵ فی صدی غیر ملکی سرمائے سے بھرا تو کوئی عیب نہیں۔ تہذیبی لین دین سے بنی نوعِ انسان کا رشتۂ اتحاد مضبوط ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی[۲] انکشاف کرتے ہیں:

"آج کسی بھی جدید آریہ بھاشا میں سنسکرت الفاظ ۵۰ فی صدی کے لگ بھگ کہے جا سکتے ہیں … یہ دیکھ کر ہمارے دُکھی ہونے کی کوئی وجہ نہیں جیسا کہ ہم بیّن طور پر دیکھتے ہیں کہ انگریزی میں بھی ۶۰ فی صدی بدیسی (لاطینی و فرانسیسی اور فارسی میں ۶۰ سے ۸۰ فی صدی تک بدیسی (عربی الفاظ) موجود ہیں۔"

اُردو کی کوئی اوسط تحریر لے لیجیے اور اس کی ایک سطر میں استعمال ہونے والے عربی فارسی الفاظ گنیے۔ پانچ چھ سے زیادہ نہ ہوں گے جب کہ پوری سطر میں پندرہ سولہ الفاظ ہوتے ہیں۔

فرہنگ کی رو سے دیکھا جائے تو اٹھارویں صدی کے وسط سے پہلے اُردو ہندی میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا۔ مولوی عبدالحق کے رسالہ 'اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام' کے اوراق الٹیے۔ از ابتدا تا انتہا تمام نمونے خالص ہندی کے معلوم ہوتے ہیں۔ دکنی اردو پر ادبی روایات اور لفظیات کے اعتبار سے بھاشا شاعری کا گہرا اثر تھا۔ ابتدا میں اس کی بحریں بھی ہندی ہوتی تھیں۔

ڈاکٹر سُنیتی کمار چٹرجی[۳] مسرت سے باغ باغ ہو کر لکھتے ہیں

"سولھویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے دکن میں شمالی ہند سے وارد مسلمان ہندوستانی

---

[۱] اردو زبان اور اس کا رسم خط ص ۱۷

[۲] ہندی ترجمہ انڈو ایرین اینڈ ہندی ص ۱۳۷

[۳] ہندی ترجمہ انڈو ایرین اینڈ ہندی ص ۱۹۹

میں، ہندی دیسی بحروں میں نیز سنسکرت اور پراکرت الفاظ سے بھری زبان میں
مذہبی شاعری کرنے لگے تھے۔ صرف رسم خط کو چھوڑ کر یہ سارا ادب بالکل ہندو روایات
کا منت کش تھا۔

دکنی کے ہندی رنگ کی وجہ سے دکنی ادب اردو بیزار ہندی مورخوں میں بڑا منظورِ نظر رہا ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے تو دکنی ہندی نام کی کتاب لکھ کر اس پر چھاپہ مارنا چاہا اور پورے دکنی ادب کو ہندی ادب کا جزو بنا کر پیش کیا۔ شمال میں افضل پانی پتی اور فائز دہلوی بھی بے تکلف ہندی الفاظ اور تراکیب استعمال کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہندی کی شاعرانہ روایات بھی ملتی ہیں لیکن اٹھارویں صدی کی ابتدا میں ولی اور ان کے بعد حاتم اور مرزا مظہر نے اصلاح زبان کے نام پر جن الفاظ کو متروک قرار دیا وہ سب ہندی تھے۔ ان کی جگہ فارسی الفاظ و تراکیب کو داخل کیا۔ اس تحریک کو لکھنؤ میں ناسخ نے اوج پر پہنچایا۔ حتیٰ کہ اردو کا وہ رنگ ہوگیا کہ وہ ہندوستان کے لسانی دھارے سے علیحدہ بھٹک گئی۔
پروفیسر عبدالقادر سروری کو بھی اس ترقی معکوس کا احساس ہے فرماتے ہیں:۔

"تھوڑے عرصے کے اندر اندر خود یہ زبان اس قدر ترقی کر گئی کہ اس کے بولنے اور
پڑھنے والے اس کی اصل سے دور ہوتے چلے گئے"۔[۱]

رجب علی بیگ سرور کی نثر اور غالب کی ابتدائی شاعری فارسیت کے عدم اعتدال کی معراج ہے۔ بیسویں صدی میں بعض شعراء نے اردو کو ہندی کے نزدیک لانا چاہا ہے مثال کے طور پر فراق کی رباعیاں دیکھیے۔

وہ چال کہ جیسے مل کرنا چیں سو مور | لچکیلا گات اور اوستھا ہے کشور
منہ تکتا ہے چندرماں کے دھوکے میں چکور | کوک اٹھتی ہیں کوئلیں وہ کالی زلفیں

نئے شعرا نے گیت بھی لکھے جو لسانی حیثیت ہی سے نہیں تہذیبی اور فنی حیثیت سے بھی ہندی سے شرابور ہیں۔

خود ہندی بھی عربی فارسی الفاظ و مرکبات سے چھوت چھات نہ برت سکی۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے کھڑی ہندی کے جو بھولے بھٹکے نمونے ملتے ہیں ان میں عربی فارسی الفاظ سے وہ اجتناب نہیں پایا جاتا جو بعد کی ہندی میں ہے۔ کھڑی بولی ہندی نثر کے قدیم ترین نمونے پرتھوی راج کے

---

[۱] اردو مثنوی کا ارتقا ص ۲۴

دس فرامین ہیں۔ بعض علماء انھیں جعلی جانتے ہیں اور دوسرے لوگ ان میں سمبت درج ہونے کی وجہ سے انھیں صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ ان پروانوں میں بہت سے عربی فارسی الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اگر انھیں متنازعہ فیہ ہونے کی وجہ سے قابلِ اعتنا نہ سمجھا جائے تو عہد اکبری کے گنگ کوی کی 'چند چھند برنن کی مہما' دیکھیے جو علم بیان کا رسالہ ہے۔ اس کی زبان اردو[1] سے کتنی نزدیک ہے

" سدھی شری ۱۰۸ شری پات ساہی جی شری وپتی جی اکبر ساہی جی عام کھاس میں تکھت اوپر براجمان ہو رہے اور عام کھاس بھرنے لگا ہے جس میں تمام امراؤ آئے آئے کرنش بجائے جُہار کر کے اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں اپنی اپنی مثل سے جن کی بیٹھک نہیں سو ریسم کے رستے میں ریسم کی لو میں پکڑ پکڑ کے کھڑے تاجیم میں رہے۔"

اس میں بادشاہ، عام خاص۔ تخت، امرا، کورنش، مثل، ریشم، تعظیم بیرونی الفاظ ہیں۔ کبیر اور نانک ہندو مسلم آشتی کے بڑے حامی تھے۔ ان کے کلام میں عرب ایرانی الفاظ کا ہونا فطری ہے لیکن تلسی داس اور سور داس جیسے سنتوں کو بھی ان الفاظ سے پرہیز نہیں۔

فورٹ ولیم کالج میں ہندی نثر کی جو تشکیل ہوئی اس میں عربی فارسی الفاظ کو نکال کر سنسکرت کے تت سم الفاظ کو جگہ دی گئی۔ رام چندر[2] شکل دھوکے میں قبول گئے ہیں کہ

"اگر للّو لال اردو نہ جانتے ہوتے تو پریم ساگر سے عربی فارسی الفاظ دور رکھنے میں اتنے کامیاب نہ ہوتے جتنے ہوئے۔ بہت سے عربی فارسی الفاظ بول چال کی زبان میں اتنے گھل مل گئے تھے کہ انھیں صرف سنسکرت ہندی جاننے والے کے لیے پہچاننا بھی مشکل تھا۔"

اگر ہندی راجہ شو پرشاد ستارۂ ہند کے سجھائے ہوئے راستے پر چلتی تو اس کی مڈبھیڑ ہندوستانی سے ہو جاتی۔ اپنی ہندی تحریر[3] میں لکھتے ہیں۔

"ہم لوگوں کو جہاں تک بن پڑے چننے میں ان شبدوں کو لینا چاہیے کہ جو عام فہم

---

[1] بحوالہ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۳۵۷

[2] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۶۵

[3] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۸۱

اور خاص پسند ہوں۔ ارتھات جن کو زیادہ آدمی سمجھ سکتے ہیں اور جو یہاں کے پڑھے
لکھے عالم فاضل، پنڈت ودوان کی بول چال میں چھوڑے نہیں گئے ہیں اور جہاں
تک بن پڑے ہم لوگوں کو ہرگز غیر ملک کے شبد کام میں نہ لانا چاہئیں اور نہ سنسکرت
کی ٹکسال قائم کرنے کے نئے نئے اوپری شبدوں کے سکے جاری کرنے چاہئیں۔"
بابو دیو کی نندن کھتری نے ہندی کی داستان بزرگ چندر کانتا ایسی صاف سادہ اور رواں
طرز میں تحریر کی ہے جسے ہندوستانی کا بہترین معیاری نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ خود بھارتیندو نے ایسی
عام فہم بولی میں شاعری کی:

کہاں ہوا ہے ہمارے رام پیارے کدھر تم چھوڑ کر ہم کو سدھارے

انیسویں صدی کے ربع آخر میں ہندی اُردو کا قضیہ کھڑا ہو گیا جس کے ردِ عمل کے طور پر
ہندی کو سنسکرت آمیز بنانے کا رجحان زور پکڑتا گیا۔ علی گڑھ تحریک نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اب
اردو اور ہندی دونوں کا ارتقا متضاد سمتوں میں ہو رہا تھا۔ یہ گلہ بے جا ہے کہ کون غلطی پر تھا۔ اس
زمانے میں بھی شدھ ہندی کے رجحانات کے خلاف ایودھیا سنگھ ہری اودھ نے ٹھیٹھ ہندی کا ٹھاٹھ
دکھایا۔ ان کے چوپدے بالکل اُردو کے قطعات معلوم ہوتے ہیں

بوند گرتے دیکھ کر یوں مت کہو آنکھ تیری گر گئی یا سڑ گئی
جو سمجھتے ہو نہیں تو چپ رہو کرکری اس آنکھ میں ہے پڑ گئی

اردو ہندی کے ادیب منشی پریم چند نے بھی صاف اور سہل ہندی لکھی لیکن دور حاضر میں
جوں جوں ہندو مسلم مناقشات بڑھتے گئے تیوں تیوں ہندی میں سنسکرتیت کا غلبہ ہوتا گیا۔ اس
رجحان کے دو قابلِ افسوس مظاہر ہیں

(۱) ہندی کے موقر ادیب اور مبلغ بول چال کے عربی فارسی الفاظ بھی ناپسند
کرتے ہیں۔ مثلاً ہمارے آل انڈیا ریڈیو کی ہندی فرہنگ میں خبر کا لفظ ٹکسال باہر
ہے۔ اس موقع پر سر چارلس[1] لائل کا وہ مشورہ یاد آتا ہے جو انھوں نے ۱۸۸۰ء
میں دیا تھا

"فارسی اب ہندوستان کے لیے بیرونی زبان نہیں اگرچہ اس کا بے حد استعمال

---

[1] بحوالہ لسانیاتی جائزہ ہند Sketch of the Hindustani Language 1880

پسندیدہ نہیں۔ پھر بھی ہندو ادب سے اسے نکالنے کی کوشش حماقت آمیز سیاسی بھول ہوگی۔[1]

گریرسن کی بھی یہی رائے ہے۔ ہندی سے مستعمل عربی فارسی الفاظ کو خارج کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

'ایسے الفاظ کو خارج کرکے بھاشا کو شدھ بنانا ویسا ہی ہوگا جیسے انگریزی سے لیٹن الفاظ کو نکالنا۔'

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی بھی جو اردو کے خلاف زہر اگلنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، روزانہ استعمال کے عربی فارسی الفاظ کو ہندی میں باقی رکھنے کے حامی ہیں۔ ان کے خیال میں ایسے الفاظ کی تعداد کوئی پانچ ہزار ہوگی۔[2] ان کا اندازہ اس مشاہدے پر مبنی ہے کہ بنگالی کی سب سے ضخیم لغت مرتبۂ گیانیندر موہن داس میں عربی فارسی کے ڈھائی ہزار الفاظ شامل ہیں۔ ڈاکٹر اودے نراین تواری کو اپنی بھاشا میں ۵۰ ہزار عرب ایرانی الفاظ کی تاب بھی نہیں۔ وہ قیاس کرتے ہیں کہ ہندی کے اندازاً ایک لاکھ الفاظ کے ذخیرے میں عربی فارسی الفاظ کی تعداد ساڑھے تین ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔ ہندی میں فارسی عناصر کا بھید آیندہ اوراق میں انشا کیا جائے گا۔

(۲) احیائیت کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ ہند آریائی زبان کے ارتقائی اصولوں کے برعکس تدبھور (ترمیم شدہ) الفاظ کو ان کی تت سم (اصل) شکل میں فروغ دیا جارہا ہے اور یہ سب صحتِ زبان کے نام پر ہے۔ زبان زندگی کی طرح نامیاتی حقیقت ہے اس کا ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ عام طور سے یہ رجحان اشکال سے تسہیل کی جانب ہے۔ صدیوں تک استعمالِ عام کی خراد پر چڑھا کر سنسکرت کے کاواک سنگم الفاظ اور زبان توڑ اصوات کو ہموار کیا گیا تھا لیکن احیائی ذہنیتوں نے ؎

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

کا فرمان جاری کردیا اور الفاظ کو ان کی قدیم ترین اصل شکل میں رائج کردیا۔ گویا

---

[1] ہندی ترجمہ انڈو ایرین اینڈ ہندی ص ۲۴۳

[2] ہندی بھاشا کا ادگم اور وکاس (ہندی) طبع اول ص ۱۹۳

پراکرت اور اپ بھرنش نے جو جان ماری کی تھی وہ اکارت گئی۔ اُردو انھیں موجودہ منجھے ہوئے روپ برقرار رکھتی ہے چند مثالیں ملاحظہ ہوں

سنسکرت	پراکرت	اُردو
اگنی	آگی	آگ
ہتِ	ہتھی	ہاتھی
جِہوا	جبھا	جیبھ
دگدھ	دڈھ	دودھ
دش	دس	دس
شاک	ساگ	ساگ
یمنا	جمنا	جمنا

اردو کو اعتراض ہے کہ سورج کو سوریہ، چاند کو چندر اور رات کو راتری نہ کہا جائے اگر اُردو میں سنسکرت کی جگہ ن ،ش کی جگہ س ، ی کی جگہ ج ، د کی جگہ ب کا چلن ہے تو یہ پراکرت اور اپ بھرنش کے رواج کی تقلید ہے، کوئی اُردو کی بدعت نہیں۔ آزادی سے پہلے حیدر آباد میں ایک سراسر مصنوعی اُردو تخلیق کی جا رہی تھی۔ آزادی کے بعد ہندی کے سر میں بھی وہی سودا سمایا ہے۔

ذیل میں موجودہ ہندی اور اُردو کے اختلافات اور مقاماتِ اشتراک پر غور کیا جاتا ہے۔

اردو رسمِ خط کو فارسی یا عربی رسم خط کہنا بھول ہے۔ عربی رسم الخط میں ۲۸ حروف ہیں فارسی نے ان پر چار حروف پ ۔ چ ۔ گ ۔ ژ کا اضافہ کیا۔ اس میں ہندی کی کئی آوازیں مفقود تھیں اس لیے اُردو نے انھیں ہندی سے مستعارلے کر شامل کیا۔ ذیل کی تین معکوسی اور دس ھکاری آوازیں ہندی سے لی گئیں۔

ٹ۔ ڈ۔ ڑ۔

کھ۔ گھ۔ جھ۔ چھ۔ ٹھ۔ ڈھ۔ دھ۔ تھ۔ پھ۔ بھ

اس طرح اُردو رسم الخط میں ۴۵ حروف ہیں۔ ہمزہ اور ’لا‘ کی اُردو میں کوئی آزاد حیثیت نہیں۔

یہ تو رسم الخط کی بات تھی۔ جہاں تک واقعی آوازوں کا تعلق ہے، ہندی اور اردو میں ایک

ایک مصمتے کا فرق ہے۔ اُردو کا مصمتہ ژ ہندی میں قطعاً استعمال نہیں ہوتا۔ خ۔ ز۔ غ۔ ف۔ ق سے ہندی کو عار نہیں۔ اس کے برعکس اُردو نے ہندی کا مصمتہ ण قبول نہیں کیا۔ اردو میں اس کے لیے کسی[1] نے موزوں ترین علامت (نٹ) تجویز کی تھی۔ اس کے لیے ڈاکٹر دھریندر ورما[2] اور ڈاکٹر اودے نرائن تواری[3] تسلیم کرتے ہیں کہ تت سم الفاظ کے سوا ہندی میں ण کا تلفظ ن ہی کی طرح ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کھڑی بولی کے علاقے کی بول چال میں اس آواز کا کوئی چلن نہیں بانگرو (ہریانی) اور پنجابی میں اس کی فراوانی ہے۔ بانگرو کے اثر سے سہارنپور اور میرٹھ کے علاقے میں کہیں کہیں ن کی بجائے ण بولنے کا رجحان ملتا ہے۔ آج کل ہندی کے حامی تت سم انداز سے ण بولنے پر اصرار کرتے ہیں لیکن اُردو میں اس متروک آواز کو اپنانے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہندی کا مصمتہ ङ ک۔ گ سے پہلے اُردو میں بھی بولا جاتا ہے۔ اردو رسم الخط میں اس کے لیے کوئی علامت نہ ہونے کے سبب اُردو والے اس کے وجود سے خبردار نہیں۔

اُردو نے ہندی کو ایک مصوتہ (خفیف اُو) دیا۔ یہ عربی فارسی الفاظ مثلاً محرّم، معطّل، کہن میں ملتا ہے۔ بقیہ سب مصوتے ہندی اُردو میں مشترک ہیں۔ ہندی میں انگریزی الفاظ مثلاً لارڈ، کانفرنس وغیرہ کے لیے ایک مخصوص مصوتہ ऑ وضع کیا گیا ہے۔ ابھی اسے عام طور پر تسلیم نہیں کیا گیا۔ ہندوستانی بول چال میں انگریزی خواں حضرات بھی اسے آ کی طرح بولتے ہیں۔ اس لیے اُردو میں فی الحال اس کے لیے کسی نئی علامت کی ضرورت نہیں۔

اہلِ اُردو ہندی کے بعض الفاظ کو ادا کرتے وقت ان میں کچھ تبدیلی کر لیتے ہیں۔ یہ طے کرتے چلیں کہ ان میں کون سی تبدیلی مستحسن ہے اور کون سی ناموزوں۔ مؤخر الذکر ناواقفیت کی وجہ سے ہوتی ہیں یا ہٹ دھرمی کی بنا پر ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ ابتدائی مصمتی خوشے۔ عربی و فارسی الفاظ کی ابتدا میں کبھی دو مصمتے نہیں آتے جب کہ ہندی میں (اور انگریزی میں) یہ ایک عام بات ہے۔ ان مصمتی خوشوں کی دو قسمیں کی جا سکتی ہیں۔

الف۔ وہ خوشے جن میں دوسری آواز ر۔ ل۔ ی۔ و۔ میں سے کوئی ایک ہے۔ ہندی

---

[1] ہندی کے ماترا اور اُردو کے اعراب از واقف کار 'ہماری زبان' ۸ ستمبر ۱۹۶۰ء

[2] ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۹۹ - ۱۰۶

[3] ہندی بھاشا کا اودگم اور وکاس ص ۳۱۶ و ۳۲۵

میں ان کی تعداد ۲۴[1] ہے۔ لیکن اُردو میں ان خوشوں والے بہت کم الفاظ بار پا سکے ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ اگر اُردو میں کبھی ان خوشوں والا کوئی ہندی لفظ استعمال کیا جائے تو اسے صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کیا جائے۔ ی۔ کا خوشہ تو اُردو میں عام ہے مثلاً کیا، پیار، دھیان، شیام۔ دوسرے خوشوں میں اہلِ اُردو درمیان میں ایک مصوتہ ڈال کر یعنی حرفِ اوّل کو متحرک کر کے بولتے ہیں مثلاً پریم، پرشاد، ترشول، گرام، کرانتی، جوالا۔ اس دور میں یہ تلفظ کم علمی کی غمازی کرتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اہلِ اردو ان الفاظ کے صحیح تلفظ پر قادر نہیں۔ انگریزی کے متعدد الفاظ میں اس قسم کے مصمتی خوشے ادا کرنا روزانہ کی بات ہے مثلاً

Bring, Click, Craze, Dry, Frame

بعض اصحاب کی رائے میں لفظ کی ابتدا میں مصمتی خوشہ لانا اُردو کے مزاج کے خلاف ہے لیکن اردو کا مزاج کیا ہے؟ اگر اردو کو صرف عربی و فارسی تک محدود کر دیا جائے تو یہ قول صحیح ہو سکتا ہے لیکن اگر اردو ہندوستانی زبان ہے اور اس کے ذخیرے میں سب سے بڑی تعداد ہندی الفاظ کی ہے تو مصمتی خوشے اس کی سرشت کا جزو ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم انگریزی لفظ "فریم" کو صحیح ادا کریں اور ہندی لفظ "پریم" میں پ کے بعد ایک مصوتہ ڈال دیں۔ سُور (مصوتہ کے لیے ہندی لفظ) کو سُوَر (خنزیر) بنا دیں۔ ہندوستان میں اُردو کو ہندی الفاظ سے روزافزوں اخذ و استفادہ کرنا ہے تاکہ دوسری ہندوستانی زبانوں کی اُردو سے بھڑک کم ہو سکے۔ اُردو کو اگر ان ہندوستانی زبانوں کا ہم صفیر و ہم زبان رہنا ہے تو ہندی کی ان آوازوں کو مسخ کرنے کی روش ترک کرنی چاہیے۔ جہاں تک رسمِ تحریر کا سوال ہے اُردو کے کئی اہلِ نظر ہندی کی مخصوص آوازوں کو اُردو میں قلم بند کرنے کے مسئلے پر اظہارِ خیال کر رہے ہیں۔ حیدرآباد کے غلام رسول صاحب[2] اور پاکستان کے ترقی اُردو بورڈ نے خاص طور پر اس قسم کی تجویزیں پیش کی ہیں۔

ب (۱) دوسری ذیل میں سات خوشے سپ، ست، سک، سم، سن، سپھ، ستھ اور سبھ ہیں مثلاً سپات، ستھان، سمرن۔ ان خوشوں کو سہل کرنے کے لیے ان کی ابتدا میں 'اَ' یا 'اِ' کا اضافہ کر لیا جاتا ہے۔ اردو میں اسے جائز قرار دینا چاہیے۔ اہلِ ہند انگریزی الفاظ (مثلاً اسکول میں

---

[1] ہندی اکشر از کیلاش چند بھاٹیا۔ راج رشی ابھینندن گرنتھ (ہندی میں)، ص ۵۵۱

[2] اُردو املا، از غلام رسول ص ۱۰ مطبوعہ ادارہ ادبیاتِ اردو، حیدرآباد

بھی ایسا کرتے ہیں۔ ہندی جاننے والے خواص بھی اپنی گفتگو میں سپات، منان، ستھان کی ابتدا میں الف کا اضافہ کرکے بولتے ہیں جب کہ پہلی ذیل کے خوشوں کو وہ مصمتی خوشوں کے طور پر ہی ادا کرتے ہیں۔

(۲) آخری مصمتی خوشے، یہ عربی، فارسی اور ہندی تینوں کے الفاظ میں آتے ہیں۔ روزانہ کی بول چال میں ان کے بیچ میں مصوتہ شامل کرکے تلفظ سہل کر لیا جاتا ہے مثلاً دھرم، جنم، اندر، تخت فکر وغیرہ میں آخری سے پہلے حرف کو متحرک کرکے بول دیا جاتا ہے لیکن جس طرح ثقات تخت فکر صدر وغیرہ کی اوسط کو عامیانہ تلفظ قرار دیتے ہیں اسی طرح ہمارا فرض ہے کہ ہندی الفاظ دھرم، جنم کے درمیانی حروف کو متحرک کرکے بولنا غیر معیاری قرار دیں۔ بعض ہندی الفاظ کے آخر میں پے بہ پے ۴ مصمتے تک پائے جاتے ہیں ان کو بھی صحیح طور سے ادا کرنا مستحسن ہے مثلاً اِندر، راجیندر، راشٹریہ، شاستریہ، چندر اور اِندر میں آخری حرف سے پہلے مصوتہ لانا کتنا بدنما معلوم ہوتا ہے ع

سبھا میں دوستو اِندر کی آمد آمد ہے

حامیانِ ہندی اگر شکوہ کرتے ہیں کہ اہلِ اُردو عربی کے زبان توڑ الفاظ اور اصوات کا تلفظ بھی صحیح صحیح ادا کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن ہندی الفاظ کو قصداً مسخ کرکے بولتے ہیں تو بعض اوقات کچھ بے جا نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) ہندی میں متعدد تت سم الفاظ خفیف مصوتہ इ उ پر ختم ہوتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ لفظ متحرک الآخر ہے۔ ان کا صحیح تلفظ ہمارے لیے دشوار ہے۔ اُردو میں ان مصوتوں کو حذف کر دیا جاتا ہے یا انکی بجائے بالترتیب طویل مصوتہ ई یا ऊ بولا جاتا ہے جو قابلِ اعتراض نہیں مثلاً

ہندی	اُردو
رگھوپتِ سہائے	رگھوپتی سہائے یا رگھوپت سہائے
نیتِ	نیتی یا نیت
رِتُ	رِتو یا رِت
اروِندُ	اروِندُ یا اروِند

(۳) ہندی کا ہر مصمتہ متحرک ہوتا ہے۔ زبر کی یہ حرکت اس کی فطرت میں مضمر مانی گئی ہے۔ سنسکرت کے اعتبار سے رام۔ کشن۔ بدھ۔ وید۔ شاستر۔ گپت۔ ہسر وغیرہ متحرک الآخر الفاظ ہیں۔ بعض پنڈت ان کا اصل سنسکرت تلفظ ادا کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اُردو میں ہر لفظ سکون پر ختم ہوتا ہے اس لیے ان الفاظ کا آخری مصمتہ بھی ساکن ہوگا۔

۴۔ بعض مونث الفاظ علامتِ تانیث 'ن' پر ختم ہوتے ہیں۔ ہندی میں اس سے ماقبل مصوتہ زیر ہوتا ہے لیکن اردو میں فتحہ بولا جاتا ہے۔ دراصل کھڑی بولی کے علاقے میں یہ الفاظ فتحہ سے بولے جاتے ہیں اور اودھی میں کسرہ سے، اردو کھڑی بولی کے تلفظ کو ترجیح دیتی ہے۔

ہندی	اُردو
مالِن	مالَن
دھوبِن	دھوبَن
ناگِن	ناگَن
ڈائِن	ڈائَن

۵۔ لیکن بعض اوقات اہلِ اردو ہندی کے اچھے خاصے الفاظ کے آخری مصوتہ سے قبل کا کسرہ فتح سے بدل دیتے ہیں۔ ذیل کی مثالوں میں یہ نہ صرف ناجائز ہے بلکہ دیہاتی اسلوب معلوم ہوتا ہے۔

ہندی	اُردو
پنڈِت	پنڈَت
مندِر	مندَر
امرِت	امرَت

زبر کو ترجیح دینا غالباً بانگرو (ہریانی) کا اثر ہے۔

۶۔ ہندی کے بعض الفاظ یا ان کا ایک جزو 'د' ماقبل مفتوح پر ختم ہوتے ہیں۔ اردو میں اسے بالعموم اُ د میں تبدیل کر دیا جاتا ہے مثلاً

ہندی	اُردو
مادھَو	مادھُو
یادَو	یادُو
بھَوبھوتی	بھُوبھوتی
اَدکاش	اُدکاش

یہ تبدیلی مستحسن نہیں۔ اُردو داں حضرات انگریزی اور عربی الفاظ میں آخری واو کو بے تکلف ادا کرتے ہیں مثلاً عضو، ہجو، عفو، Love

۷۔ ہندی کے بہت سے الفاظ य پر ختم ہوتے ہیں۔ اُردو میں یا تو آخری 'یہ' کو ساقط کر دیا جاتا ہے یا پھر (یا، یے، ای) میں سے کسی ایک شکل میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ یہ تمام تبدیلیاں غیر مناسب ہیں۔ مثال:

ہندی	اُردو
اوشیہ	اَوش
آریہ۔ بھارتیہ	آریا۔ بھارتیا
راجیہ	راجیے
سورگیہ	سورگی

۸۔ ہندی میں لغت کے اعتبار سے بعض الفاظ کا آخری حرف مشدد ہوتا ہے حالاں کہ بول چال میں اس تشدید کو ظاہر نہیں کیا جاتا۔ اُردو بول چال کی پیروی میں ان الفاظ میں تسہیل کو ترجیح دیتی ہے:

ہندی	اُردو
بودھّ	بودھ
سکھّ	سکھ
اجڈّ	اجڈ
کھڈّ	کھڈ
دیودتّ	دیودت
شدھّ	شدھ

اُردو، عربی کے مشدد الآخر الفاظ کے ساتھ بھی یہ عمل کرتی ہے مثلاً ضِد۔ رد۔ حل۔

اُردو کو ہندی سے مستعار الفاظ کے تلفظ کو زیادہ ہمدردی سے سمجھنے اور برتنے کی ضرورت ہے۔ ایسا کرنے سے دونوں زبانوں کی مغائرت ختم ہو کر ہم آہنگی کی فضا پیدا ہو سکے گی۔ مشکل یہ ہے کہ ایک زبان کے رسم خط میں دوسری زبان کے بعض الفاظ کی صحیح آوازیں رقم نہیں کی جا سکتیں اُردو تحریر میں چوں کہ اکثر مصوتوں کی علامات حذف کر دی جاتی ہیں اس لیے ناواقفوں کو ہندی الفاظ کے تلفظ میں اور بھی غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ ایسے الفاظ بہت شاذ ہیں جو ٹکسالی اُردو اور ٹکسالی ہندی میں مختلف طور پر بولے جائیں۔ عامیانہ تلفظ زیرِ بحث نہیں۔ اختلافی تلفظ کی جو مثالیں ذہن میں

آسکیں وہ یہ ہیں:

ہندی	اُردو
یہ (واحد)	یہ
یے (جمع)	یہ
وَہ (واحد)	وُہ
وے (جمع)	وہ
بہُت	بہُت
कि	کہ
نے یا نہ	نہ
سر	سر
جاتِ	ذات
ماما	ماموں
چاچا	چچا
سُسُر	سُسَر۔ سُسُرا
سَسُرال	سُسرال
وِواہ	بیاہ
وِیَوہار	بیوہار
ویاپار	بیوپار
پشچم	پچھّم
سمُندر	سمندر
دہیج	جہیز
کارروایی	کارروائی
مناہی	(منع سے) منائی
دِکھنا	دکھائی دینا

اُردو نے ہندی الفاظ کو شاذ و نادر ہی بدلا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ اردو والے کا عمل سب

زیادہ عربی اور اس سے کم فارسی الفاظ پر ہوا ہے۔ اُردو میں جو عربی الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جن کا تلفظ اور معنی اصلاً کچھ اور تھے اور اُردو میں کیا سے کیا ہو گئے بہت سے فارسی الفاظ پر بھی یہی بیتی ہے۔ اُردو نے عربی و فارسی کو بیگانہ زبان جان کران کے سرمائے پر بے دردی سے ارد وانے کا عمل جاری کیا۔ ہندی سے اپنا خون کا رشتہ دیکھ کر اس کے الفاظ میں تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی۔[1]

اُردو رسم الخط میں عربی کی مخصوص آوازیں ث۔ ص۔ ح۔ ذ۔ ض۔ ظ۔ ط۔ ع۔ شامل ہیں۔ اُردو میں ان کا وجود محض رسم الخط کی حد تک ہے۔ صوتی اعتبار سے یہ دوسرے حروف کی دہری آوازیں ہیں اس لیے ہندی کو ان کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہندی نے اردو سے پانچ آوازیں لیں اور اپنے قریب المخرج حروف کے نیچے ایک نقطہ لگا کر ان کی علامات مقرر کیں۔ وہ آوازیں یہ ہیں۔ خ۔ ز۔ ف۔ ق۔ غ۔ صرف ژ کے لیے ہندی میں کوئی علامت نہیں۔ ڈاکٹر دھریندر ورما نے تو اس کے لیے بھی ایک علامت ज़्ह پیش کی ہے لیکن وہ مقبول نہیں[2]۔ اردو میں بھی ژ کی آواز صرف چند الفاظ میں آتی ہے۔

ہندی بعض اوقات اُردو الفاظ میں کچھ صوتی تبدیلی کر لیتی ہے۔ ان میں بعض تو ہندی میں کافی مقبول ہیں اور بعض اردو سے ناواقف حضرات کی بولی تک محدود ہیں۔ ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں:

۱۔ جو لوگ اُردو زبان سے بھی ناواقف ہیں اور اُردو دانوں کے ساتھ نشست و برخاست سے بھی مستفیض نہیں ہو سکے وہ اردو آوازوں (خ۔ ز۔ ف۔ ق۔ غ اور ش (کو ش ہندی میں بھی پایا جاتا ہے) سادہ کر کے (کھ۔ ج۔ پھ۔ ک۔ گ اور س) سے بدل دیتے ہیں۔ ہندی کے ابتدائی مصنفوں کے یہاں یہ بہت عام تھا۔ آج جس شخص کا ش قاف درست نہیں ہوتا، اسے دہقان سمجھا جاتا ہے۔ ق کو بعض اوقات ک کی بجائے گ میں اور ذ۔ ض۔ کو د میں تبدیل کر دیا جاتا ہے مثلاً

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سخندانِ فارس مؤلفہ آزاد کا نواں اور دسواں لکچر۔ قاموس الالفاظ یا رشید حسن خاں کا مضمون 'لغت اور استعمالِ عام'، اردو ادب۔ مارچ ۵۷ء

[2] ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۱۹۷

اُردو	ہندی
تقاضہ	تگادا
نقارہ	نگارا
نقد	نگد
کاغذ	کاگد۔ کاگج

۲۔ اگر کسی لفظ کے درمیان (ع یا آ۔عو۔عی) واقع ہوتے ہیں تو ان کا انفصال دور کر کے ایک رو میں بولا یا تحریر کیا جاتا ہے مثلاً

اُردو	ہندی
قرآن	قران
انعام	انام
جمعہ	جما
مسعود	مسود
جمعیت العلماء	جمیتلُ علما

۳۔ بعض الفاظ کو رواں کرنے کے لیے ان کا کوئی نیم مصوتہ حذف یا مصوتہ خفیف کر دیا جاتا ہے مثلاً

اردو	ہندی
موافق	مافق
نیّت	نیت
کیفیّت	کیفیت

۴۔ کسی لفظ کے آخر میں اگر مسلسل دو مصمتے واقع ہوتے ہیں تو عوامی بول چال کی تقلید میں ان کے درمیان ایک مصوتہ کا اضافہ کر لیا جاتا ہے مثلاً

حُکَم
تخَت

۵۔ اگر کسی اُردو لفظ میں مسلسل تین حرکات واقع ہوتی ہیں تو اس پر تسکینِ اوسط کا عمل وارد کیا جاتا ہے یعنی ان کا ایک مصوتہ گرا دیا جاتا ہے۔ اس کا دستور فارسی[1] میں بھی ہے اور اُردو بول چال میں بھی۔

[1] "صحت زبان" از جگر بریلوی ص ۵۸

اردو	ہندی
عَرَبی	عرَبی
کلمہ	کل مہ
حرَکت	حرَکت

یہ بات نہیں کہ ہندی میں تین حرکات کا دستور ہے۔ ملاحظ ہو۔ اتہاس۔ کوتا۔ مہما۔ سکمار۔ پربھوشا۔ سمُدائے۔

۶۔ بعض الفاظ کی ساکن ھ یا ح کو حذف کر کے اس سے قبل کے خفیف مصوتہ کو طویل کر دیا جاتا ہے مثلاً

اُردو	ہندی
فہرست	فیرست
کچہری	کچیری
صحت	صیحت

۷۔ غرض یہ ہے کہ ہندی میں اُردو الفاظ کو عموماً بلکہ عام عوام کے تلفظ کے مطابق لکھا اور بولا جاتا ہے مثلاً

اُردو	ہندی
حُضُور	حَضور
مُزدور	مَزدور
نعمت	نیامت

مندرجہ بالا صوتی تبدیلیوں میں جو واقعی تلفظ کی ترجمانی کرتی ہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ بقیہ صورتوں میں اُردو کے اصل تلفظ کی متابعت زیادہ مستحسن ہے۔

کھڑی بولی کی تشکیل میں اُردو کا جو ہاتھ رہا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس معاملے میں ہندی نے اُردو سے استفادہ کیا۔ اُردو نے فارسی اثر سے اپنے لسانی سرمائے میں جو اضافہ کیا تھا، ہندی نے بھی اس کے ایک جزو کو قبولا اور ظاہر ہے کہ ہندی میں یہ جزو اُردو ہی کی وساطت سے پہنچا ہے۔ اس مشترک سرمائے کی صراحت درج ذیل ہے۔

۱۔ اُردو میں کئی عربی فارسی الفاظ سے ہندوستانی قاعدے پر مصادر بنا لیے گئے ہیں۔ ہندی نے

بھی ان کو قبول کر لیا ہے مثلاً (عربی) بدلنا۔ قبولنا۔ دغنانا (فارسی) گزرنا۔ فرمانا۔ شرمانا۔ آزمانا۔ خریدنا۔ رنگنا۔

۲۔ اُردو نے چند فارسی الفاظ پر ہندی سابقے لگائے۔ ہندی میں یہ الفاظ لے لیے گئے مثلاً تراہا۔ چوراہا۔ چوپایہ۔ پچ رنگا۔

۳۔ اُردو نے متعدد فارسی (شاذونادر عربی) الفاظ پر ہندی لاحقے لگائے۔ ہندی میں بھی ان کا استعمال ہے مثلاً شرمیلا۔ جوشیلا۔ نشیلی۔ رنگیلا۔ نکیلا۔ شیرنی۔ بادشاہت۔ بازارو۔ رنگائی۔ کترواٸی بالشتیا۔ نزاہٹ۔ جلیبا۔

۴۔ اُردو نے بہت سے دیسی الفاظ پر فارسی سابقے لگائے۔ یہ ہندی کا بھی مال ہیں مثلاً بےبس۔ بےکل۔ بےچین۔ بیدھڑک۔ سرتوڑ۔ سرچڑھا۔ بدچلن۔ نیک چلن۔ ناسمجھ۔ نوچندی۔ نوسکھیا لاپتہ (عربی سابقہ)

۵۔ اُردو نے متعدد ہندی[1] الفاظ پر فارسی لاحقے لگائے۔ ان میں سے بیشتر ہندی میں بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً بھتات۔ دھوکے باز۔ گاڑی بان۔ بھیج بند۔ ناکابندی۔ ہاتھی خانہ۔ پاگل خانہ۔ تاڑی خانہ۔ گھوس خور۔ بھڑکدار۔ چمکدار۔ جالی دار۔ پہریدار۔ چوہے دان۔ چٹھی رساں۔ سنسنی خیز۔ بانگی۔ گھڑی ساز غنڈہ گردی۔ مٹرگشت۔ اٹھائی گیرا۔ رہائش۔ ڈھنڈورچی (ترکی لاحقہ)

۶۔ اُردو اور ہندی میں متعدد ایسے مرکبات ہیں جن کا ایک جزو فارسی یا عربی ہے اور دوسرا جزو ہندی۔ مثلاً (فارسی ہندی) گلاب جامن۔ باغ باڑی۔ گھڑسوار۔ نگرگدا۔ جگت استاد۔ راج دربار۔ سبزی منڈی۔ کوڑھ مغز۔ منھ زور۔ چور دروازہ۔ سیاہی چوس۔

عربی ہندی: بال صفا صابن۔ عجائب گھر۔ دودھ شریک۔ عمر پڑ۔ کفن چور۔ کفن کھسوٹ۔

۷۔ اُردو میں فارسی کی یائے نسبتی بہت عام ہے۔ ہندی نے بھی بہت سے الفاظ میں اس کو برتا مثلاً پنچایتی۔ مینملی۔ اُدھی۔ پچھمی۔ گپتی نسبتی۔

۸۔ اُردو میں فارسی لاحقہ ی سے اہمیت کا کام لیا جاتا ہے۔ ہندی کو بھی اس سے احتراز نہیں مثلاً چوری۔ ٹھگی۔ ناسمجھی۔ پیراکی۔ ڈاکٹری۔ ٹھیکیداری۔

۹۔ اُردو نے متعدد فارسی محاوروں کا ترجمہ کیا۔ بہ صورت موجودہ یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہ اصلاً

---

[1] ملاحظہ ہو وحید الدین سلیم کی "وضع اصطلاحات"

فارسی تھے۔ ہندی میں بھی انھیں بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے۔

۱۰۔ غم کھانا۔ بات پکڑنا (حرف گرفتن) زبان پکڑنا۔ خون کھانا۔ کان دھرنا۔ آنکھ آنا۔ دانتوں تلے انگلی دبانا۔ سر آنکھوں پر (بہ سر و چشم)

۱۰۔ اردو میں عربی فارسی کے بہت سے متعلقات فعل لیے گئے ہیں۔ ہندی میں بھی ان کا استعمال ہوتا ہے مثلاً فوراً۔ بالکل۔ شاید۔ اگر۔ مگر۔ ہرگز۔ قریب قریب۔

۱۱۔ ہندوستانی میں پہلے مضاف الیہ ہوتا ہے پھر مضاف۔ فارسی میں اس کے برعکس ہے۔ ہندی نے فارسی علامتِ اضافت کو قبول نہیں کیا لیکن ہندی میں بعض ایسی ترکیبیں ملتی ہیں جو اُردو فارسی انداز پر یعنی ان میں پہلے مضاف ہے اور پھر مضاف الیہ لیکن حرفِ اضافت نہیں ہے مثلاً

صوبہ دِتی۔ مہاراجہ جے پور۔ سمپادک سرسوتی۔ ادھیکش کاریالیہ

۱۲۔ ہندی میں بعض سنسکرت الاصل الفاظ کی جنس سنسکرت سے مختلف ہے۔ خیال یہ ہے کہ یہ اُردو اور فارسی کا اثر ہے۔ مثلاً آتما سنسکرت میں مذکر ہے لیکن ہندی میں روح کی مماثلت سے مونث ہے۔ چرچا اور گھنٹا سنسکرت میں مونث ہیں اور ہندی میں مذکر

نحوی حیثیت سے اُردو اور ہندی میں کوئی خاص فرق نہیں۔ قدیم اُردو میں جملے کی ساخت بعض اوقات ایسے ڈھنگ سے ہوتی تھی جو عام ہندی ترتیب کی خلاف ورزی ہے۔ گریرسن[1] نے ہندی اور اُردو قواعد کا فرق یہ بتایا ہے کہ اُردو میں اکثر عربی کے انداز پر فعل جملے کے وسط میں لاتے ہیں جب کہ ہندی میں ہمیشہ آخر میں آتا ہے۔ شمالی ہند میں فورٹ ولیم کالج سے پہلے جو نثری نمونے ملتے ہیں ان میں بعض جگہ یہ انداز ہے اور یہ عربی تراجم کا اثر ہے مثلاً شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن میں جملے کی ترتیب یوں ہے۔

" اے ہمارے رب مت پکڑ ہم کو اگر بھول گئے ہم یا خطا کی ہم نے "۔ اس اسلوب میں عربی فارسی کی تقلید سے مضاف۔ مضاف الیہ اور جار مجرور کی ہندوستانی ترتیب بھی الٹ جاتی تھی مثلاً تحسین کی نوطرزِ مرصّع میں " جب طائرِ زرّیں بال آفتاب کے، نے رُخ بیچ آشیانۂ مغرب کے کیا۔" لیکن یہ اردو کا قدیم ترین یا مستقل انداز نہیں۔ دکنی اُردو نثر میں فعل جملے کے آخر میں آتا ہے۔ قدیم شمالی اُردو میں بھی قرآن کے تراجم کے علاوہ دوسری تصانیف میں عربی ترتیب سے کہیں زیادہ اردو انداز کے جملے

---

[1] لسانیاتی جائزہ ہند جلد نہم حصہ اوّل ص ۵۲

ہیں جن میں فعل جملے کے آخر میں آتا ہے۔ یہ رنگ محض اٹھارویں صدی کی نثر میں تھا۔ حیرت ہے کہ گریرسن نے اسے اُردو قواعد کی امتیازی خصوصیت کیوں قرار دیا۔ جملوں کی ترتیب کے اس پہلو کو دیکھ کر رام چندر شکل[1] انشا کی رانی کیتکی کی کہانی سے بھی بدظن ہیں۔ لکھتے ہیں کہ

"انشا نے بھاکا پن اور معلّی پن دونوں کو دور رکھنے کی کوشش کی پر دوسری بلا کسی نہ کسی صورت میں لگی رہی جیسے

"سر جھکا کر ناک رگڑتا ہوں اپنے بنانے والے کے سامنے جس نے ہم سب کو بنایا۔"

یہ شکل تو قدیم اُردو میں تھی اور وہ بھی کہیں کہیں۔ بعض اوقات موجودہ اُردو اور ہندی نحو میں بھی خفیف سا اختلاف دیکھنے میں آتا ہے مثلاً ہندوستانی کی فطری ترتیب کے مطابق صفت کے بعد موصوف مضاف الیہ کے بعد مضاف، مجرور کے بعد جار آتا ہے۔ اُردو میں جب عربی فارسی مرکبات آتے ہیں تو یہ ترتیب بدل جاتی ہے مثلاً مردِ نیک۔ شیرِ پنجاب۔ شعرالہند۔ از سرِ نو۔ منجملہ۔

اُردو نے زبان کے معاملے میں بڑے ستھرے ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات نوک پلک کی خاطر فعل کے مروجہ صیغوں کے ساتھ کچھ قدیم شکلیں بھی برقرار رکھی ہیں یا بعض نئی شکلوں کا اضافہ کیا ہے۔ ان سے مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ذیل کا روزمرہ قابلِ توجہ ہے۔ ان مثالوں میں جہاں یہ تبدیلی فقروں کو متاثر کرتی ہے وہ نحو کی ذیل میں آئے گی۔ جہاں محض ایک لفظ کو بدلتی ہے اُسے صرف کے احاطے میں رکھیں گے۔

۱۔ کرنا چاہیے۔ کرنا چاہتا ہوں وغیرہ کے مصدر کو ماضی مطلق میں بدل کر کیا چاہیے، کیا چاہتا ہوں لکھا جاتا ہے۔

میرؔ نہیں پیر تم کاہلی اللہ رے
نام خدا ہو جواں کچھ تو کیا چاہیے

جدید اُردو میں اس اسلوب کی قدر کی جاتی ہے۔ ہندی کے ایک مضمون نگار ڈاکٹر پریم[2] پرکاش گوتم سدل مسر کی کتاب ناسکیتو پاکھیان کے ایک فقرے "جایا چاہتی ہوں" پر جز بز ہیں کہ یہ غلط اور عجیب انداز ہے۔

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۳۶۲

[2] پراچین کھڑی بولی گدّ میں بھاشا کا سوروپ۔ از ڈاکٹر پرکاش گوتم۔ راج رشی ابھی نندن گرنتھ ص ۷۶۴ (ہندی)

۲۔ دیکھتے رہے، کھاتے رہے کی جگہ دیکھا کیے کھایا کیے۔ ع

آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کیے

ہندی کے مندرجہ بالا مضمون[1] نگار ہندی اُردو کی مشترک داستان 'بیتال پچیسی' کے ایک فقرے 'چٹایا کی'، کو بھی غلط اور عجیب و غریب سمجھ بیٹھے ہیں۔

۳۔ مستقبل کا صیغہ بنانے کے لیے مصدر کے الف کو 'ے' سے بدل دیا جاتا ہے اور امدادی جزو گا، گی، گے، کی جگہ کا، کی، کے استعمال کیے جاتے ہیں۔ فعل کی یہ شکل محض نفی کے صیغے میں آسکتی ہے۔

میں نہیں آنے کا۔ ع مستی پابند ل نہیں ہونے کی (رواں اناوی)

۴۔ مرکب فعل کی شکلوں میں علامتِ مصدر کو حذف کردینا مثلاً

ع ورنہ کیا بات کر نہیں آتی (غالب)

ع کل کی ہے بات[2] تجھے بات نہ کر آتی تھی (جرأت)

ع خرمنِ دل میں[3] نہ یوں آگ لگا آتی تھی (امیر)

۵۔ اُردو کے بعض اہلِ زبان مصر ہیں کہ جمع یا تانیث کی صورت میں بھی مصدر میں کوئی تبدیلی نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً ہم کو اس سلسلے میں جلسے کرنا ہیں۔ مجھ کو دوا پینا ہے۔ ہندی میں ان موقعوں پر 'کرنے ہیں'، 'پینی ہے'، آتا ہے۔ اُردو میں دونوں صورتیں رائج ہیں۔

۶۔ نفی کا مفہوم ظاہر کرنے کے لیے 'معلوم'، کا استعمال مثلاً

ع جنابِ شیخ کا دعوائے اتقا معلوم

اس کا آنا معلوم تم کب تک راہ دیکھو گے

فعل کے مندرجہ بالا اسالیب اردو میں نہ صرف جائز ہیں بلکہ انشا میں بانکپن پیدا کردیتے ہیں۔ ہندی میں ان میں سے کسی کا رواج نہیں۔

اُردو نے تمام ضمائر ہندی سے لیے ہیں۔ بہت خفیف سا فرق جو ہے وہ دیا جاتا ہے۔

---

[1] پراچین کھڑی بولی گدمیں بھاشا کا سوروپ از ڈاکٹر پرکاش گوتم۔ راج رشی ابھی نندن گرنتھ ص ۴۷۶ (ہندی)

[2] شعلہ، جوّالہ جلد اول (مجموعۂ واسوخت۔ نول کشور پریس) ص ۳۰۲

[3] شعلہ، جوالہ جلد اول ص ۱۴۲

الف۔ جیسا کہ پہلے لکھا گیا اُردو اور ہندی میں ضمیر اشارہ قریب و ضمیر اشارہ بعید میں خفیف سا صوتی اختلاف ہے۔ ضمیر اشارہ بعید اور ضمیر شخصی غائب کے لیے ہندوستانی میں ایک ہی لفظ ہے

	اُردو	ہندی
ضمیر اشارہ قریب واحد	یہ	یَہ
ضمیر اشارہ بعید واحد	وُہ	وَہ
ضمیر اشارہ قریب جمع	یہ	یے
ضمیر اشارہ بعید جمع	وُہ	وے

ب۔ ہندی میں کسی کی جمع کنھیں ہے اُردو میں واحد اور جمع دونوں کے لیے کسی کا استعمال ہوتا ہے مثلاً

ہندی۔ کنھیں دو سوالوں کا جواب لکھیے

اُردو۔ کسی دو سوالوں کا جواب لکھیے۔

ج۔ ڈاکٹر دھریندر ورما نے تیُں[1] کی جمع تِن لکھی ہے۔ یہ اُردو میں کبھی استعمال نہیں ہوئی اور جدید ہندی میں بھی یہ لفظ سننے میں نہیں آیا۔

د۔ کیفیتی ضمیر ایسا سے ضمیر مقداری اتنا۔ کیسا سے کتنا بنایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر دھریندر ورما لکھتے ہیں کہ ہندی میں ویسا سے اُتنا اور تیسا سے تتنا (तितना) کا استخراج کیا گیا ہے۔ اُردو میں اتنا کی جگہ اتنا ہی استعمال ہوتا ہے۔ 'تتنا' نہ اُردو میں ہے اور نہ کبھی ہندی میں سُنا۔

مندرجہ بالا تفصیلی جائزے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

۱۔ اُردو کے لسانی سرمائے کا کثیر حصہ دیسی الفاظ پر مشتمل ہے جو بدیسی عنصر ہے اس کا ایک جزو ہندی میں بھی قبول کر لیا گیا ہے۔

۲۔ اُردو اور ہندی نحو میں عام طور سے کوئی فرق نہیں۔

۳۔ چند آوازوں کے علاوہ اُردو اور ہندی کے ثقات ایک دوسرے کے الفاظ و اصوات کا

---

[1] ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۲۵۸

[2] ایضاً ص ۲۸۷

صیح تلفظ کرتے ہیں۔ عوام کا ذکر نہیں وہ تو اپنی زبان کو بھی مسخ کر کے بولتے ہیں۔

اس سے ہندی اور اُردو کے اشتراک کا اندازہ ہوتا ہے اور لسانی حیثیت سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اُردو اور ہندی ایک ہی ہیں لیکن ساتھ ہی ہم ان حقائق کی طرف سے بھی منہ نہیں موڑ سکتے کہ

۱۔ اُردو کے سرمائے میں جو ۲۵ فی صدی عربی اور فارسی الفاظ ہیں ان کا استعمال بہت کثرت سے ہوتا ہے اور جو دیسی الفاظ ہیں وہ باستثنائے فعل ضمیر و حرف کم استعمال ہوتے ہیں اس لیے اُردو کی ادبی نثر میں ادائے مطلب عربی و فارسی الفاظ کے ذریعے ہوتا ہے، دیسی الفاظ محض امدادی حیثیت سے آتے ہیں۔

۲۔ ہندی فرہنگ میں اگرچہ کئی ہزار عربی و فارسی الفاظ لے لیے گئے ہیں لیکن ان کا استعمال کم سے کم ہے۔

۳۔ جدید ہندی میں سنسکرت الاصل الفاظ کو ان کی قدیم ترین صورت میں لکھنے اور بولنے کا رجحان زوروں پر ہے جب کہ اُردو ان کے اس روپ کو ترجیح دیتی ہے جو صدیوں کے چلن اور تراش اور خراش کے بعد نکھر کر آیا ہے۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ اختلافاتِ نکاتِ اشتراک سے زیادہ زوردار اور جاندار ہیں چنانچہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ اُردو والے ہندی تحریر و تقریر کو نہیں سمجھ پاتے اور ہندی والوں کے لیے اُردو کی بعض عبارتیں ناقابلِ فہم ہو جاتی ہیں۔

لسانی پہلو کے علاوہ دونوں زبانوں کے ادب کی روایات اور تہذیبی رچاؤ میں بعدِ مشرقین ہے زبانوں کے بارے میں لسانیات کی رو سے نظریاتی جائزہ لے کر کوئی فیصلہ صادر کر لینا خلا میں ہاتھ پاؤں مارنا ہے۔ ہم زبان کو اس کے سماجی چوکھٹے میں رکھ کر ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اُردو اور ہندی دو مختلف ادب ہیں اور افسوسناک سہی لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اب اُردو اور ہندی دو مختلف زبانیں ہو گئی ہیں۔ سید احتشام حسینؒ صحیح فرماتے ہیں

"اگرچہ اُردو اور ہندی لسانیاتی مفہوم میں دو زبانیں نہیں ہیں لیکن عملی حیثیت سے اس وقت تک انھیں دو الگ الگ زبانوں کا مرتبہ حاصل ہے۔"[۱]

ہندی کے حامیوں کا یہ اصرار کہ "اُردو کوئی علیحدہ زبان نہیں یہ ہندی کی ایک شیلی ہے۔" ان کے لسانیاتی رجحان کا آئنہ دار نہیں بلکہ ان کی اقتدار پسندانہ ذہنیت کا غماز ہے۔ ایک زمانے میں ہندی پر بھی یہی کٹھن گھڑی آئی تھی چنانچہ مہابیر پرشاد دویدی نے اپنے اخبار سرسوتی میں ایک مضمون اس عنوان سے

۱۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۷۰

لکھا تھا

'کیا ہندی نام کی کوئی بھاشا ہی نہیں'

اگر اُردو ہندی کا ایک اسلوبِ محض ہے تو ہندی ادب کی تاریخیں جو اودھی، برج، راجستھانی وغیرہ کے ادیبوں اور ادبی تخلیقات کے ذکر سے لبریز ہیں اردو ادیبوں اور ادب پاروں کی طرف سے کیوں چشم پوشی کرتی ہیں۔

صحیح صورتِ حال یہ ہے کہ اُردو اور ہندی کھڑی بولی کے دو روپ ہیں۔ کھڑی بولی کا جنم ہندی روایات اور ناگری رسم خط میں ہوا لیکن آج اس کا جو روپ ہے وہ اردو کا سنوارا اور نکھارا ہوا ہے۔ کھڑی بولی کے ان دونوں روپوں کا ادب اور لسانی سرمایہ اتنا مختلف ہوگیا ہے کہ انھیں دو زبانیں نہ ماننا حقیقت کی جانب سے آنکھیں موند لینا ہے۔

اُردو سے غیر اُردو والوں کی بھڑک دور کرنے کے لیے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ اردو کے غیر ملکی عناصر کو کم کیا جائے اور اسے ہندوستان کے دوسرے ادبوں کے دھارے سے ہم آہنگ بنایا جائے لیکن اس کی انفرادیت باقی رکھنے کی ضرورت ہے، کیوں کہ ہندوستانی کلچر کے تمول اسی میں ہے کہ اس میں مختلف کلچرل دھاروں کا سنگم رہے۔ یہاں کی تہذیبی وحدت کثرت میں موجِ تہ نشین کی طرح جاری وساری ہے۔ کثرت کو فنا کر کے مکمّل وحدت کی کوشش کی جائے تو وہ سب کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتی۔

اُردو ہندی

اُردو اور ہندی سے کون سی زبانیں اور بولیاں مراد ہیں اور ان کا آپس میں کیا تعلق ہے
یہ سوال بادی النظر میں آسان معلوم ہوتا ہے، گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو لاینحل ہو جاتا ہے۔
ہندوستان کے آئین میں اُردو اور ہندی کو دو علیحدہ علیحدہ زبانیں مانا گیا ہے۔ یہی نہیں، بنیادی حقوق کی
ایک دفعہ کے تحت ہر زبان کے رسم الخط کے تحفظ کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں۔

Section 29 (i)

Any section of the citizen residing in the territory of India or any part thereof having a distinct Language, script or culture of its own shall have the right to conserve the same.

لیکن اس کے باوجود ہندی پریمیوں کی زبان سے اکثر یہ سننے میں آتا ہے کہ اُردو ہندی
کی ایک شیلی (اسلوب) ہے یعنی وہ آئین کی ان دفعات کو قبول نہیں کرتے اور اس کے مجرم صرف
اہلِ ہندی نہیں۔ اہلِ اُردو بھی گاہ گاہ یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ دونوں ایک ہی زبان کے
دو نام ہیں۔ سید احتشام حسین[1] لکھتے ہیں

"حقیقت یہ ہے کہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے اُردو اور ہندی کو دو زبانیں قرار دینا صحیح نہیں۔"

پاکستان کے ماہرِ لسانیات ڈاکٹر سہیل بخاری[2] کی بھی یہی رائے ہے۔

---

[1] ہندوستانی لسانیات کا خاکہ ص ۱۲

[2] اردو کا قدیم ترین ادب مشمولہ نقوش شمارہ ۱۰۲ ص ۸۳

"دراصل اُردو اور ہندی ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں جسے ماہرینِ علمِ زبان نے کھڑی بولی کا نام دیا ہے۔"

ایسا مان لینا اُردو کے لیے خودکشی کے مترادف ہے لیکن کیا کیا جائے۔ سچ سچ ہے! آئیے ذرا دیکھیں کہ لسانیات کا فیصلہ کیا ہے۔

ہندوستانی زبانوں کے سب سے بڑے عارف جارج گریرسن مولفِ لسانی جائزۂ ہند تھے جسے آج ہندی علاقہ کہا جاتا ہے اس میں انھوں نے ذیل کی زبانوں کو علیحدہ حیثیت دی ہے۔

۱۔ مغربی ہندی: ہریانی۔ کھڑی۔ برج۔ قنوجی۔ بندیلی۔ کھڑی کے دو روپ جدید ہندی اور جدید اُردو ہیں۔

۲۔ مشرقی ہندی: بولیاں اودھی۔ باگھیلی۔ چھتیس گڑھی۔

۳۔ بہاری: بولیاں میتھلی۔ مگھئی۔ بھوجپوری۔

۴۔ راجستھانی: اس میں پہاڑی بھی شامل ہے۔

یہ قابلِ توجہ ہے کہ گریرسن نے مشرقی ہندی کو مغربی ہندی سے الگ زبان مانا ہے۔ مشرقی ہندی کا ذکر چھٹی اور نویں جلد میں ہے۔ نویں جلد کے پہلے ہی صفحے پر لکھتے ہیں

"مغربی ہندی کے مشرق میں ایک اور زبان مشرقی ہندی ہے .... زبانوں کے ان دونوں گروہوں میں شدّت سے متضاد خصوصیات ہیں۔"

ہندوستانیوں میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی تاریخی و تقابلی لسانیات کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ انھوں نے بھی اس تقسیم پر صاد کیا ہے۔ ان کے نزدیک اودھی، بہاری اور راجستھانی وغیرہ کو ہندی میں داخل نہیں صرف مغربی ہندی کو ہندی کہا جا سکتا ہے۔ چٹرجی پہلے آفیشیل لینگویج کمیشن کے ممبر بھی تھے۔ اس کے اختلافی نوٹ میں انھوں نے پھر اس خیال کا ادعا کیا ہے کہ راجستھانی، اودھی بھوجپوری اور میتھلی بجائے خود زبانیں ہیں جو ہندی میں ڈال دی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں ہندی کے ماہر لسانیات میں بڑا تضاد ہے۔ کبھی وہ ہندی کا دائرہ بہت بڑھا دیتے ہیں اور کبھی گھٹ کر مغربی ہندی یا کھڑی بولی پر آجاتے ہیں۔ اوّل الذکر کی مثال یہ ہیں۔

۱۔ "شمالی ہند کی ہر زبان جس میں سنسکرت سے آئے ہوئے الفاظ ہیں ہندی ہے بشرطیکہ وہ اپنے جدید ادب کی وجہ سے اپنی علیحدہ حیثیت کی مدعی نہ ہو۔[۵] ایودھیا سنگھ

۵۔ ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا اتہاس ص ۱۱۷

۲۔ ڈاکٹر دھریندر ورما اپنے کتاب[1] "گرامین ہندی" میں نہ صرف مغربی ہندی، مشرقی ہندی، بہاری، راجستھانی اور پہاڑی (نیپالی سمیت) کو بلکہ پنجابی کو بھی ہندی کے زیر دامن لے آتے ہیں لیکن اپنی ایک اور کتاب[1] میں وہ پنجابی کو ہندی میں شامل نہیں کرتے۔

۳۔ ڈاکٹر سوریہ[2] پرشاد اگروال ہندی کے چار ذیلی گروہ قرار دیتے ہیں۔

۱۔ پنجابی اُپ بھاشا کھنڈ ۲۔ راجستھانی اُپ بھاشا کھنڈ ۳۔ بہاری اُپ بھاشا کھنڈ۔ ۴۔ ہندی اُپ بھاشا کھنڈ جس سے مراد مغربی اور مشرقی ہندی ہے۔

لیکن یہی ہندی والے جب غیر جانب دار ماہرِ لسانیات کی حیثیت سے لکھتے ہیں تو ہندی کو محض مغربی ہندی تک محدود کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

(۱) ڈاکٹر شیام سندر[3] داس کے ایک اقتباس کا ایک اُردو ترجمہ درج ذیل ہے:

"بھاشا شاستر کے نقطۂ نظر سے اس بڑے علاقے یعنی ہندی کھنڈ میں تین چار بھاشائیں مانی جاتی ہیں۔ راجستھان کی راجستھانی، بہار اور بنارس و گورکھپور کمشنری کی بہاری، شمال میں پہاڑوں کی پہاڑی اور اودھ اور چھتیس گڑھ کی پوربی ہندی وغیرہ علیحدہ بھاشائیں مانی جاتی ہیں۔ اس طرح ہندی صرف اس کھنڈ کی بھاشا کو کہہ سکتے ہیں جسے پُرانے زمانے میں مدھیہ دیش یعنی انتر وید کہتے تھے۔ اس طرح اگر آگرہ کو ہندی کا مرکز مانیں تو شمال میں ہمالیہ کی ترائی تک اور دکن میں نربدا کی وادی تک، پورب میں کانپور تک اور پچھم میں دلّی کے آگے آگے تک ہندی کا علاقہ مانا جاتا ہے۔ پچھم میں پنجابی اور راجستھانی بولی جاتی ہیں اور پورب میں پوربی ہندی۔

"کچھ لوگ ہندی کے دو بھید مانتے ہیں، مغربی ہندی اور مشرقی ہندی لیکن جدید علما مغربی ہندی کو ہی ہندی کہنا سائنٹفک سمجھتے ہیں اس لیے لسانیات کی رو سے پوربی ہندی بھی ہندی سے الگ بھاشا مانی جاتی ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے بھی

---

[1] ہندی بھاشا کا اتہاس ص ۱۶۸

[2] بھاشا وگیان اور ہندی ص ۱۵۶ و ص ۱۷۷

[3] بھاشا وگیان پانچواں ایڈیشن ص ۱۰۵

دیکھیں تو ہندی شورسینی کی وارث اور مشرقی ہندی اردھ ماگدھی کی۔ اسی سے گریرسن چٹرجی وغیرہ نے ہندی لفظ کا مغربی ہندی ہی کے معنی میں استعمال کیا ہے اور برج، قنوجی، بانگرو (ہریانی) اور کھڑی بولی کو ہندی کی بولیاں مانا ہے، اودھی چھتیس گڑھی وغیرہ کو نہیں۔ ابھی ہندی کے لیکھکوں کے علاوہ انگریزی لیکھک بھی ہندی لفظ کا من مانا مطلب لیا کرتے ہیں۔"

۲۔ اوپر ڈاکٹر دھیرندر ورما کے ایسے قول نقل کیے گئے تھے جن میں وہ ہندی کے علاقے کو بہت بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے برعکس اپنی ایک اور کتاب میں وہ نہ صرف راجستھانی کو بلکہ مشرقی ہندی کو بھی علیحدہ زبان مانتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"پوربی ہندی[1]: یہ کچھ باتوں میں پچھمی ہندی سے ملتی ہے اور کچھ میں بہاری بھاشا سے۔ پوربی ہندی بھاشا ہے۔ پوربی ہندی بھاشا میں دو مکھیہ بولیاں ہیں۔"

"بہاری[2]: ہندی بھاشا کی چچیری بہن کہی جا سکتی ہے۔"

۳۔ ڈاکٹر اودے نرائن تواری نے اپنی کتاب "ہندی بھاشا کا ادگم اور وکاس" میں مغربی ہندی، مشرقی ہندی اور بہاری کو ہندی میں لیا ہے لیکن راجستھانی کو نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ معتبر بھوجپوری پران کا تحقیقی مقالہ ہے، اس میں لکھتے ہیں کہ جب یہ بی۔ اے میں پڑھتے تھے تو گریرسن کی بات کہ بھوجپوری ہندی سے الگ ہے غدر معلوم ہوتی تھی۔ اب چوبیس برس تک بھوجپوری کے مطالعے کے بعد گریرسن کی محنت، علم اور غیر جانبداری پر فخر اور عقیدت ہوتی ہے . . . . اس حقیقت میں کسی بحث کی گنجائش نہیں کہ بہاری، پوربی ہندی سے الگ بھاشا ہے نیز اس کا تعلق بنگلہ، اڑیہ اور اسامی سے ہی ہے۔

۴۔ ڈاکٹر جے کانت مشر نے "میتھلی ساہتیہ کا اتہاس" میں میتھلی کو ہندی سے علیحدہ زبان کہا اور بھوجپوری اور مگھئی کو میتھلی کی بولیاں قرار دیا۔

۵۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما[3] ہندی کا دائرہ بڑھانے میں کسی سے پیچھے نہیں لیکن انھوں نے بھی

---

[1] ہندی بھاشا اور لپی ص ۲۳

[2] ایضاً ص ۳۶

[3] بھاشا اور سماج ص ۴۱۲

تسلیم کیا کہ راجستھانی اور پنجابی ہندی کی بولیاں نہیں۔

۶۔ جے۔ نرائن۔ ویاس[1] نے ایک مضمون میں راجستھانی اور ہندی کے مختلف ذخیرۂ الفاظ پر زور دے کر راجستھانی کو علیحدہ زبان قرار دیا۔

ان بیانات سے یہ صاف ہو جاتا ہے کہ لسانیات کے نقطۂ نظر سے اُردو اور ہندی ایک زبان ہیں لیکن مشرقی ہندی، بہاری اور راجستھانی یہ تینوں ہندی کی بولیاں نہیں۔ تاریخی لسانیات نے یہ فیصلہ خون کے رشتے کی بنا پر کیا ہے۔ مغربی ہندی، مشرقی ہندی، بہاری اور راجستھانی مختلف اپ بھرنشوں کی پیداوار ہیں۔ مختلف کنبوں کی زبانوں کو ایک زبان کی بولیاں قرار نہیں دیا جاسکتا۔

زبان اور بولیوں کا تعین بڑا الجھا ہوا مسئلہ ہے۔ دقت یہ ہے کہ علاقائی حیثیت سے زبانوں کی تبدیلی بڑی غیر محسوس طریقے پر ہوتی ہے۔ یکایک لسانی سرحد کہیں قرار نہیں دی جا سکتی۔ پشاور سے بنگال تک سفر کیجیے کسی ایک مقام پر زبان بدلتی نہ معلوم ہوگی۔ پشتو کے بعد لہندا، پنجابی، ہریانی، کھڑی، برج، اودھی، بہاری، بنگالی، آسامی یکے بعد دیگرے اس طرح آتی اور گزرتی جائیں گی جیسے ایک زبان کی دو بولیاں ہوں۔ لسانیات میں زبان اور بولی کے درمیان تمیز کرنے کے دو اصول ملتے ہیں جو بعض اوقات متضاد نتیجوں تک لے جاتے ہیں۔

۱۔ سب سے مشہور اصول ہے کہ دو مختلف زبانوں کے بولنے والے ایک دوسرے کا تمام یا بیشتر مفہوم نہیں سمجھ سکتے جب کہ ایک زبان کی مختلف بولیاں بولنے والے ایک دوسرے کا بیشتر مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔ اس معیار کے مطابق مغربی ہندی کی تمام بولیاں بولنے والے ایک دوسرے کو تو سمجھ ہی لیتے ہیں اودھی کو بھی زیادہ تر سمجھ سکتے ہیں لیکن مشرقی ہندی کی دوسری بولیوں باگھیلی اور چھتیس گڑھی اور بہاری کی بولیوں کو سمجھنے میں دقت ہوتی ہے۔ ان بولیوں کے بولنے والے جب آپس میں روانی سے گفتگو کرتے ہیں اس وقت ہمارے لیے سمجھنا کافی مشکل ہو جاتا ہے۔

جہاں تک راجستھانی کا تعلق ہے یہ بالکل سمجھ میں نہیں آتی۔ مارواڑی دکانداروں کو باتیں کرتے سنیے ایک جملہ سمجھ میں نہیں آتا۔ راجستھانی کے بارے میں مردم شماری کی رپورٹ بھی دُبدھا میں مبتلا نظر آتی ہے۔ راجستھانی اور چھتیس گڑھی بولنے والوں کی تعداد علیحدہ دے کر لکھ دیا گیا ہے کہ اگر انھیں ہندی میں شامل کیا جائے تو ہندی بولنے والوں کی تعداد ۱۶ کروڑ ہوگی اگر شامل نہ کیا

---

[1] راجستھانی بھاشا اور بولیاں۔ رسالہ कल्पना جون ۱۹۵۴ء

جائے تو ۱۲ کروڑ۔ مدھیہ پردیش کے بارے میں لکھا ہے کہ یہاں کی زبانوں میں ہندی اول نمبر پر ہے اور دوم پر راجستھانی سوم پر مراٹھی اور چہارم پر اُردو اس طرح مردم شماری کا رجحان بھی راجستھانی کو ہندی سے علیحدہ ماننے پر ہے۔

ہندی اور اُردو بول چال کی سطح پر بالکل ایک ہیں لیکن علمی اور ادبی سطح پر کبھی ایک دوسرے کے لیے قابلِ فہم رہتی ہیں کبھی نہیں۔ پاکستان ریڈیو کی اُردو خبریں ہندی جاننے والوں کے لیے اور آل انڈیا ریڈیو کی ہندی خبریں پاکستان کے اردو دانوں کے لیے کافی حد تک قابلِ فہم ہوتی ہیں لیکن ذرا مشکل۔ اُردو شاعری ہندی والوں کو اور ہندی شاعری اردو والوں کو بہت کم سمجھ میں آتی ہے۔ اس معیار پر انھیں ایک زبان تو مانا جائے گا لیکن دو بولیاں کہا جائے گا۔

۲۔ زبانوں اور بولیوں کے تعین میں لسانیات کا دوسرا اصول یہ ہے کہ اس ضمن میں ذخیرۂ الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں کیوں کہ وہ مستعار بھی لیا جا سکتا ہے یا ایک مشترک مورثِ اعلیٰ کی یادگار ہو سکتا ہے۔ اصلی اہمیت قواعدِ زبان اور بنیادی الفاظ کی ہے یعنی بنیادی افعال کے مادے، بنیادی اسماء، ضمائر نیز فعل کی گردان کے قاعدے، اسم و ضمیر کی تعریف کے اصول، حروفِ جار کا استعمال، جنس اور تعداد کے قواعد وغیرہ فیصلہ کن ہیں۔ اس اعتبار سے مغربی ہندی کی مختلف بولیوں میں اتنا فرق نہیں کہ انھیں علیحدہ زبان قرار دیا جائے۔ ہاں مشرقی ہندی، بہاری اور راجستھانی یقیناً الگ ہیں۔ اودھی میں فعل کی جنس اور گردان کے طریقے ہندی سے مختلف ہیں۔ قواعد کے لحاظ سے بہاری کی مماثلت بنگالی سے ہے نہ کہ ہندی سے۔

بول چال کی ہندی اور اردو کے قواعد ایک ہونے کے باوجود تحریری روپوں میں بڑے بڑے اختلافات ملتے ہیں۔ اُردو نے عربی فارسی کے متعدد قواعد اپنا لیے ہیں مثلاً

(۱) اُردو میں صفت موصوف اور مضاف مضاف الیہ کی ترکیب ہندی ترتیب کے برعکس بھی آتی ہے مثلاً مردِ بے باک، شیرِ پنجاب۔

(۲) عربی فارسی کے جمع کے قواعد کا عام استعمال ہے مثلاً افکار، دوستاں، طلبہ۔ ہندی میں جمع کے بعض ایسے خالص سنسکرتی قواعد ہیں جو اُردو نے قبول نہیں کیے مثلاً پاٹھک، گنڑ۔

(۳) اُردو اور ہندی میں حروفِ جار و حروفِ شرط وغیرہ میں بھی فرق دکھائی دیتا ہے مثلاً اُردو میں اگرچہ، حالاں کہ، بشرطیکہ، چناں چہ اور ہندی میں یدی، تتھا، اتئے۔

(۴) اُردو میں جہاں یائے نسبتی لگائی جاتی ہے وہاں ہندی میں لاحقہ ک لگایا جاتا ہے

مثلاً اُردو میں تاریخ اور وید سے تاریخی اور ویدی - ہندی میں اتہاس اور وید سے اَیتہاسِک اور وَیدِک ۔

(۵) اُردو جملوں کی بعض نحوی شکلیں ہندی سے مختلف ہیں مثلاً

۱۔ ع مستی پابندِ مُل نہیں ہونے کی

۲۔ ع سراغِ یک نگہِ قہرآشنا معلوم

۳۔ ع ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

۴۔ ع آشیاں جلتا رہا ہم ناتواں دیکھا کیے

۵۔ تھوڑی دیر میں آٹھ بجا چاہتے ہیں

اُردو اور ہندی صوتیات میں بھی کچھ فرق ہے۔ یعنی اُردو کی ذیل کی آوازیں ہندی میں نہیں ملتیں۔

خ ۔ ز ۔ ژ ۔ غ ۔ ف ۔ ق ۔ نیز ایک مصوتہ مختصر اُو جو معتیٰ ۔ شعرا ۔ محرم وغیرہ میں پہلا مصوتہ ہے ۔ یہ واو مجہول کی خفیف آواز سے مختلف ہے ۔

ہندی کا ण اُردو میں نہیں ہوتا کیوں کہ کھڑی بولی کی بول چال میں بھی اس کا وجود نہیں ۔

اصوات کا فرق دو زبانوں میں ہوتا ہے ، ایک زبان کی دو بولیوں میں ہوسکتا ہے لیکن ایک بولی کے بیچ اصوات یا قواعد کا فرق ممکن نہیں ۔ اس طرح اُردو اور ہندی اگر ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں تو انھیں ایک زبان کی دو بولیاں قرار دینا ہوگا۔

اس بحث سے کوئی دو ٹوک نتیجہ نکالنا تو مشکل ہے لیکن موٹے طور پر ہم مختلف اصولوں کو اس طرح لاگو کرسکتے ہیں:

۱۔ خاندان کے اعتبار سے مغربی ہندی کی تمام بولیاں جن میں اُردو اور کھڑی بولی ہندی بھی شامل ہے ، ایک زبان ہیں ۔ مشرقی ہندی ، بہاری اور راجستھانی علیحدہ زبانیں ہیں ۔

۲۔ سمجھے جانے کے اعتبار سے ہریانی ، اُردو ، کھڑی بولی ہندی ، برج ، قنوجی بندیلی نیز اودھی تک کو ایک زبان کی مختلف بولیاں کہا جاسکتا ہے ۔ باگھیلی اور چھتیس گڑھی کو اس حصار میں سمانا مشکل ہے ۔ بہاری اور راجستھانی بہرحال ہندی سے علیحدہ زبانیں ہیں۔

۳۔ قواعد کے اعتبار سے مغربی ہندی کی بولیوں ہریانی ، اُردو ، کھڑی بولی ہندی ، برج ،

قنوجی اور بندیلی کو ایک زبان کی مختلف بولیاں مانا جائے گا۔ مشرقی ہندی، بہاری اور راجستھانی مختلف زبانیں ہیں۔

مندرجہ بالا نتائج میں قطعیت کا کوئی دعویٰ نہیں۔ ممکن ہے سمجھ میں آنے کے اعتبار سے باگھیلی کو اودھی کے ساتھ ہندی کے زمرے میں لیا جا سکے۔

ایودھیا سنگھ نے قاعدہ بنایا تھا کہ سنسکرت الفاظ استعمال کرنے والی شمالی ہند کی ہر زبان ہندی ہے اگر وہ علیحدہ ادب کی بنا پر علیحدہ حیثیت کی مدعی نہ ہو۔ اس اصول کے مطابق اُردو ہندی سے علیحدہ زبان ہے۔

علم لسانیات کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہ زبان کا مطالعہ سماجی چوکھٹے میں نہیں کرتی بلکہ مجرد علمی حیثیت سے دنیا سے الگ تھلگ ایک مینارے میں بیٹھ کر۔ سماج کو قطعاً نظر انداز کرنے سے یہ واقعیت سے بیگانہ ہو جاتی ہے۔ ہم ذیل کی حقیقتوں سے کیوں کر چشم پوشی کر سکتے ہیں:

۱۔ ہندوستان کے آئین میں مشرقی ہندی، بہاری اور راجستھانی علیحدہ زبانیں نہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں ہندی کی بولیاں فرض کیا گیا ہے۔ مجلس آئین ساز میں بہار یا راجستھان کے کسی بھی ممبر نے یہ مانگ نہیں کی تھی کہ بہاری یا راجستھانی کو آٹھویں گوشوارے میں جگہ دی جائے۔

۲۔ ان زبانوں کے بولنے والوں کی بہت بڑی اکثریت ان کو ہندی کی بولی قرار دیتی ہے اور اپنی تہذیبی اور مجلسی اغراض کے لیے ہندی کا استعمال کرتی ہے۔ چنانچہ یوپی کے ساتھ بہار، مدھیہ پردیش اور راجستھان کی اسمبلیوں نے اپنی علاقائی زبان ہندی تسلیم کی ہے۔

۳۔ مشرقی ہندی، بہاری اور راجستھانی کا ادبی ارتقا ہندی ادب سے یوں لب و دنداں ہے کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ تلسی داس کی اودھی اور سور داس کی برج تخلیقات ایک ہی ادب کے حصے ہیں۔ اس کے برخلاف اُردو ادب ان سے ہر طرح مختلف ہے۔

جذباتی اعتبار سے مغربی ہندی کی تمام بولیوں (سوائے اردو) مشرقی ہندی، بہاری اور راجستھانی کے بولنے والے ایک رشتۂ اتحاد میں منسلک ہیں۔ ہمیں ان کو تقسیم کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اردو جذباتی اعتبار سے ان سے علیحدہ حیثیت رکھتی ہے۔

۱۹۴۷ء یا ۱۹۴۸ء میں سردار جعفری اُردو کے ترقی پسند مصنّفین کی طرف سے ہندی کے ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں ایک تحریری پیش کش لے کر گئے تھے کہ ہم اُردو کے لیے دیوناگری رسم الخط اختیار کرنے کو اور اسے ہندی نام دینے کو تیار ہیں بشرطیکہ ہندی والے پورے

اُردو ادب کو ہندی میں شامل کر کے قبول کر لیں۔ اس پیش کش پر جوش تک نے دستخط کر دیے تھے لیکن ہندی ساہتیہ سمیلن کے دو سابق صدروں نے امرناتھ جھا اور راہل سانکرتاین نے اس پیش کش کو رد کر دیا۔ شاید انھیں اندیشہ ہو کہ اُردو ادب کے ہندی ادب میں شامل ہو جانے کے بعد اُردو اسلوب کی مقبولیت ہندی اسلوب پر غالب آ جائے گی۔

آیئے اودھی، بہاری اور راجستھانی کو پسِ پشت ڈال کر کھڑی بولی ہندی اور اُردو کے تعلق پر غور کریں کہ کون کس کی شیلی ہے۔

اس ضمن میں دکنی کا کھڑی بولی اردو اور ہندی سے رشتہ دریافت کرنا بڑا ضروری ہے۔ اُردو میں دکنی کو قدیم اُردو مانا جاتا ہے لیکن دکنی اور اُردو کا رشتہ کچھ اس قسم کا ہے جیسے جدید ہندی اور برج کا۔ ایک ایشیائی روسی اسکالر[1] کے مطابق دکنی نے کھڑی بولی ہندی اور اُردو دونوں کو جنم دیا۔ لکھتے ہیں۔

"ادبی دکنی میں جس نے شمالی ہند کی بولی کھڑی بولی کا ابتدائی اسلوب ادب ہو کر جدید اُردو اور ہندی کو جنم دیا ہے۔۔۔"

پاکستان کے ماہرِ لسانیات ڈاکٹر سہیل بخاری 'انوکھے'، غیر سنجیدہ اور ایجادِ بندہ قسم کے لسانیاتی نظریات گھڑنے کے ماہر ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون[2] میں دکنی اور شمالی اردو کے اختلافات کی تفصیل پیش کر کے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ دکنی اور اُردو قطعاً مختلف زبانیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ زبان اور بولی میں خلط ملط کر گئے ہیں۔ ان کے مشاہدات سے یہ نتیجہ نکالنا چاہیے کہ دکنی کھڑی بولی سے جدا بولی ہے، جدا زبان نہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دکنی کا کھڑی بولی سے اتنے نزدیک کا تعلق ہے کہ بعض اوقات دونوں یکساں معلوم ہوتی ہیں۔

کیا وجہ ہے کہ اورنگ زیب سے پہلے شمالی ہند میں اُردو ادب کا کوئی مستند نمونہ نہیں ملتا۔ لیکن ولیؔ دکنی کا کلام دلی پہنچنے سے قبل بہر حال شمال میں اُردو شاعری کی تخلیق ضرور شروع ہو جاتی ہے۔ افضل کی مثنوی بکٹ کہانی اور جعفر زٹلی اور فائز دہلوی کی شاعری ولی کی تقلید کا نتیجہ نہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ شمالی ہند کی اُردو دکنی سے پیدا نہیں ہوئی۔ ہندی میں گیارھویں

---

[1] "سترھویں صدی کے ادبی دکنی کے مخلوط الصرف الفاظ" از آزاد نصیر الدین شماتوف۔ مشمولہ سب رس۔ حیدر آباد مارچ ۶۵ء

[2] قدیم دکنی۔ اور اردو زبان کا تقابلی مطالعہ مشمولہ اُردو نامہ کراچی اکتوبر تا دسمبر ۶۴ء

صدی سے اٹھارویں صدی تک جستہ جستہ کھڑی بولی کے اجزا مل جاتے ہیں لیکن وہ ایسے نہیں جن سے کوئی مسلسل لسانی یا ادبی روایت بن سکے۔ شمالی ہند کے اردو ادب کے پاس تو اتنی متاع بھی نہیں۔ پندرھویں صدی سے سترھویں صدی تک اُردو ادب کی شاندار تاریخ محض دکنی کے طفیل ہے۔ اٹھارویں صدی سے شمالی ہند میں بھی یہ سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اُردو ادب کو دکنی سے محروم کر دیا جائے تو اُردو کی تاریخ اٹھارویں صدی سے شروع ہوگی۔ شروع شروع میں ہندی کے علمار بھی دکنی کو اُردو تسلیم کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو:

"اس اُردو[1] کے بھی دو روپ دیکھے جاتے ہیں ایک دتی لکھنؤ وغیرہ کی بہت کٹھن اُردو اور دوسری حیدر آباد کی سہل دکنی اُردو۔"

"دکشنی[2] مسلمانوں کی بھاشا دکنی اُردو کہلائی۔ یہ سب اُردو کے روپ روپانتر ہیں۔"

لیکن اُردو ہندی نزاع کے تیز ہونے پر ہندی علمار نے اپنی رائے بدل دی اور قدیم دکنی کے ہندی زدہ نمونوں کو لے کر دعویٰ کیا کہ دکنی ادب اُردو نہیں، ہندی ہے۔ حیدر آباد کے ڈاکٹر شری رام شرما اور ہندی کے مشہور ماہر لسانیات ڈاکٹر بابو رام سکسینہ اس سلسلے میں ممتاز ہیں اہلِ اُردو کو یہ دعویٰ تسلیم کرنا مشکل ہے، وجوہ ظاہر ہیں۔

الف۔ چند مستثنیات کے سوا اس ادب کی تمام روایات اردو ادب کی ہیں

ب۔ یہ تمام کا تمام اُردو رسم الخط میں ہے۔

ج۔ اس کی زبان عام طور سے اُردو ہے۔ مشکل ہندی الفاظ شاذ ہیں لیکن عربی فارسی کے مشکل الفاظ سے اجتناب نہیں۔ جس ادب کی کتابوں کے نام معراج العاشقین، احکام الصلوٰۃ، گلشنِ عشق۔ شمائل الاتقیا جیسے ہوں وہ ہندی ادب کیسے ہو سکتا ہے۔

د۔ ایک اتفاق یہ بھی ہے کہ تین چار صدیوں کے اس ادب کے تمام خالق مسلمان ہیں۔ ادب اور مذہب کا لاینفک تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی اس نکتے کو بالکل نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس مجموعے کے ایک اور مضمون " اُردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ " میں میں نے گریرسن،

---

[1] شیام سندر داس : بھاشا وگیان ص ۱۰۷

[2] ڈاکٹر دھریندر ورما : گرامین ہندی ص ۱۴

سنیتی کمار چٹرجی، رام چندر شکل اور ڈاکٹر دھریندر ورما کے اقوال درج کرکے ثابت کیا ہے کہ کھڑی بولی اُردو کا فروغ اور مقبولیت دیکھ کر اس کی تقلید میں بھاشا والوں نے کھڑی بولی ہندی میں لکھنا شروع کیا لیکن للّو لال برج بھاشا بولنے والے تھے اور سدل مسر بہاری۔ یہ حضرات میرامن کی سی پاکیزہ کھڑی بولی نہ لکھ سکتے تھے۔ سرکاری زبان کمیشن کے اختلافی نوٹ میں ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے لکھا ہے کہ شمالی ہند میں برج، اودھی، بھوجپوری، راجستھانی اور گڑھوالی بولنے والوں نے پہلے اُردو اور پھر کھڑی بولی ہندی اختیار کی۔ لکھتے ہیں[1]

When the sentiments for the Nagri script and the vocubalary Sanskrit developed as the immediat result of a Hindu and Indian nationalism, and the Nagri script also become admitted by the British Government in Uttar Pradesh and Bihar and could think of passing on from Urdu to this rising young speech, Hindi, Khari Boli met the emotional and cultural needs of North Indian Hindi revivalism.

اُردو کی ابتدا کے بارے میں اہلِ اردو کا کہنا ہے کہ اُردو مسلمانوں اور ہندوؤں کے اتحاد کی پیداوار ہے۔ ہندی کے مشہور ادیب ڈاکٹر رام بلاس شرما اپنی کتاب "بھاشا اور سماج" میں اس کی پُرزور تردید کرتے ہیں کہ مسلمان تو دلّی میں بارھویں صدی میں آگئے تھے لیکن اُردو کی ابتدا شاہجہاں کے عہد میں ہوتی ہے۔ کیا دونوں ملتوں کا ملنا جلنا اس سے قبل نہ تھا۔ پھر وہ دکنی کے ابتدائی روپ کے نمونے پیش کرکے کہتے ہیں کہ شروع میں اردو ہندی میں کوئی فرق نہ تھا۔ اُردو کا ارتقا ہندی سے روز افزوں مغائرت اور ایرانی تہذیب سے بڑھتے ہوئے اتحاد کی کہانی ہے۔ ابتدائی اُردو میں اگر ۱۵ فی صدی عربی فارسی الفاظ اور ۸۵ فی صدی ہندی الفاظ تھے تو انیسویں صدی کی اُردو میں ۸۵ فی صدی عربی فارسی الفاظ اور ۱۵ فی صدی ہندی الفاظ رہ گئے یعنی اُردو مسلمانوں کے ہندوؤں سے میل کی نہیں افتراق کی نشانی ہے۔ ڈاکٹر رام بلاس نے اپنی

---

[1] آفیشل لینگویج کمیشن رپورٹ ص ۲۸۷

تائید میں منشی پریم چند کا ایک چبھتا ہوا قول درج کیا ہے۔ میری طرح اُردو کے سب قارئین کو اس پر حیرت ہوگی کیوں کہ اُردو میں یہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ پریم چند[1] کے الفاظ ہیں:

"ہندوستان کے ہر ایک صوبے میں مسلمانوں کی بہت بڑی سنکھیا موجود ہے سنکیت پرانت کے سوا اور صوبوں میں مسلمانوں نے اپنے اپنے صوبے کی بھاشا اپنالی ہے بنگال کا مسلمان بنگلہ بولتا اور لکھتا ہے۔ گجرات کا گجراتی، میسور کا کنڑی، مدراس کا تامل اور پنجاب کا پنجابی آدمی یہاں تک کہ اس نے اپنے صوبے کی لپی بھی گرہن کرلی ہے اُردو لپی اور بھاشا سے یدپی اس کا دھارمک اور سنسکرت انوراگ ہو سکتا ہے لیکن نتہ پرتی کے جیون میں اسے اُردو کی بالکل آوشیکتا نہیں پڑتی۔ یدی دوسرے صوبوں کے مسلمان اپنے صوبے کی بھاشا سنکوچ روپ سے سیکھ سکتے ہیں اور اسے یہاں تک اپنا بھی سکتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بھاشا میں نام کو بھی کوئی بھید نہیں رہ جاتا تو پھر سنکیت پرانت اور پنجاب کے مسلمان کیوں ہندی سے اتنی گھرنا کرتے ہیں۔ ہمارے صوبے میں دیہاتوں میں رہنے والے مسلمان اپنے پرائے دیہاتوں کی بھاشا ہی بولتے ہیں .... بول چال کی ہندی اور اُردو پرائے ایک سی ہی ہیں۔"

مجھے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا ہے کیوں کہ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر ہر شخص کچھ نہ کچھ رائے قائم کر سکتا ہے۔ میں صرف اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ صرف یوپی کا مسلمان اُردو اختیار کرنے کا مجرم نہیں۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کے مطابق چند دوسرے صوبوں میں مسلمانوں اور اردو بولنے والوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔

صوبہ	مسلمان	اُردو بولنے والے
آندھرا	۲۷،۱۵،۰۲۱	۲۵،۵۳،۷۵۳
بہار	۵۷،۸۵،۶۲۱	۴۱،۴۹،۲۴۵
مہاراشٹر	۳۰،۳۴،۳۳۲	۲۷،۲۵،۷۳۷
میسور	۲۳،۲۸،۳۷۶	۲۰،۳۴،۴۸۲
دہلی	۱،۵۵،۴۵۳	۱،۵۲،۲۴۷

---

[1] "پریم چند، کچھ وچار" بنارس ۱۹۳۶ء ص ۱۶۸ بحوالہ بھاشا اور سماج ص ۲۳۵

کم ازکم ان صوبوں کی حد تک پریم چند کا یہ قول صحیح نہیں کہ مسلمان صوبائی زبانیں ہی بولتے ہیں۔ یوں کل ملاکر ۱۹۶۱ء میں مسلمانوں کی آبادی ۴،۶۹،۳۹،۳۵۷ تھی جب کہ اُردو بولنے والے ۲،۳۲،۲۳،۰۴۷ تھے یعنی بالکل نصف۔ لیکن اہلِ اُردو اُردو کی حد تک مردم شماری کے اعداد و شمار میں شبہ رکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ماضی کے واقعات ہمارے لیے کتنے ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں ہم تاریخ کو از سرِ نو نہیں لکھ سکتے اس لیے ماضی میں کیا ہوا کیا نہیں اس کے بارے میں اعتراض بے سود ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آج اُردو کس کی زبان ہے۔ اس کا فیصلہ کون کرے؟

۱۔ کسی علاقے میں کیا زبان یا بولی بولی جاتی ہے اس کا صحیح ترین فیصلہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ لسانیات کی تعلیم پائے ہوئے والنٹیر ملک کا لسانی جائزہ لیں۔

۲۔ جب تک ایسا جائزہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک سب سے محفوظ راستہ یہ ہے کہ ہر شخص سے پوچھا جائے کہ وہ کون سی زبان بولتا ہے۔ وہ جو جواب دے لکھ لیا جائے۔ مردم شماری اسی اصول پر کی گئی ہے لیکن اس میں دو قباحتیں ہیں:

(ا) اوّل تو بعض اغراض کے تحت بعض لوگ اپنی زبان کچھ اور لکھا دیتے ہیں شلاً پنجابی بولنے والے ہندوؤں نے اپنی زبان ہندی لکھادی۔ بعض سر پھرے لوگوں نے اپنی مادری زبان سنسکرت لکھادی حالاں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کے بچے سنسکرت نہ بولتے ہوں گے۔ لسانی جائزہ ہو تو ماہرین یہ طے کریں کہ پنجاب کے ہندو پنجابی بولتے ہیں یا ہندی۔

(ب) دوسری قباحت یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام بے پڑھے لکھے ہیں کسی لٹھ گنوار سے پوچھا جائے کہ تم کون سی بھاشا یا بولی بولتے ہو تو وہ پوچھنے والے کا مُنہ تاکے گا۔ یہ سوال اور اس کا جواب اس کی فہم سے بالاتر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مردم شماری کرنے والوں کو آزادی ہے کہ زبان کے خانے میں جو جی چاہے لکھ دیں۔ اگر انھیں اُردو سے پرخاش ہے تو وہ اس کی جگہ ہندی لکھ دیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ مردم شماری میں دی ہوئی اُردو، ہندی اور پنجابی کی تعداد معتبر نہیں۔

اُردو اور ہندی میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ اردو میں عربی فارسی الفاظ اور ہندی میں سنسکرت الفاظ نسبتاً زیادہ ہوتے ہیں۔ ظاہرا کھڑی بولی علاقے کی زبان ہندی کے مقابلے میں اردو کی طرف زیادہ مائل ہے۔ کھڑی بولی مغربی اتر پردیش میں عام بول چال اور ہندوستان کے اکثر شہروں میں تہذیبی زبان کے طور پر بولی جاتی ہے۔ کچھ مروّجہ اردو الفاظ اور اُن کے آسان ہندی مترادفات لیجیے۔

عمر یا آیو - زندگی یا جیون - آدمی یا منش - غصہ یا کرودھ - مشکل یا کٹھن - نفع یا لابھ نقصان یا ہانی -

مغربی یوپی کے کسی شہر یا گاؤں کے بے پڑھے ہندو کی زبان کا مشاہدہ کیجیے۔ وہ مندرجہ بالا جوڑوں میں سے اُردو الفاظ بولے گا، گو تلفظ بگاڑ کر۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی بھی ان الفاظ کو قبول کرتی ہے لیکن ریڈیو کی یا شستہ ہندی میں تو ایسا دکھائی نہیں دیتا۔ تو ذخیرۂ الفاظ کا جہاں تک سوال ہے جس علاقے میں کھڑی بولی دن رات کی بول چال کی واحد زبان ہے وہاں کیا ہندو، کیا مسلمان کھڑی بولی کے اُردو اسلوب کی طرف مائل ہیں۔ دوسری زبانوں کے شہروں میں بھی ملک گیر زبان کے طور پر کم و بیش یہی بولی جاتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ دور دراز کے مقامات میں مقامی زبان کا رنگ آجاتا ہے۔ فلموں کی زبان، بالخصوص ان کے گانے اس بات کا ثبوت ہیں کہ عوام کھڑی بولی کا اُردو روپ پسند کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی پر کسی طرح اُردو کی ہمدردی کا اتہام نہیں رکھا جا سکتا ان کے دو اقوال[1] ملاحظہ ہوں۔

"A peculiar thing about Khari Boli is that those who speak or use it as an inheritance having this language as the language of the home, haive for the last 250 years shown a decided preference for Perso-Arabic words and now do not feel happy over the highly sanskritized Hindi which is being proposed as the pan-Indian official language.

"Urdu which inspite of its high percentage of Persian and Perso-Arabic words is admittedly racier of the soil so for as western Uttar Pradesh, its native home is concerned."

۱۴ر اپریل ۶۵ء کے انگریزی روزنامے ہندوستان ٹائمس (ڈاک ایڈیشن) نے بھی اپنے

---

[1] آفیشیل لینگویج کمیشن رپورٹ ص ۲۸۹

ادارے میں اس حقیقت کا اعتراف کیا۔

"In many of these areas it is also true that the language commonly used by the people is Urdu in prefrence to the offical brand of Hindi."

جدید ہندی کھڑی بولی ہے لیکن اب تک وہ اس کے خون میں جذب نہ ہو سکی۔ ہندی کا مرکز بنارس یا الہ آباد ہے۔ اُردو اور کھڑی بولی پر پنجابی کا اثر ہے تو تحریری ہندی پر اودھی کا۔ مالن۔ ناگن۔ دھوبن ان الفاظ کو کھڑی بولی اور اُردو میں بہ فتحۂ ثانی بولتے ہیں لیکن ہندی اور اودھی میں زیر کی جگہ زیر سے لکھتے ہیں۔ اُردو میں سُسرا اور سُسرال بہ ضمۂ اوّل و سکونِ ثانی لکھتے ہیں جب کہ ہندی میں بہ فتحۂ اوّل و ضمۂ ثانی لکھتے ہیں۔ اُردو کا تلفظ کھڑی بولی کے علاقے کا تابع ہے اور ہندی کا تلفظ اودھی کی آئینہ داری کرتا ہے۔

کھڑی بولی علاقے نے میراثن، میر، غالب اور محمد حسین آزاد جیسے متعدد اُردو اساتذہ پیدا کیے لیکن یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس علاقے سے ہندی کا ایک بھی بڑا ادیب نہیں ابھرا۔ ہندی کے سب عظیم قلم کار اودھی، بہاری، برج اور راجستھانی وغیرہ کی سرزمین سے اٹھے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے کھڑی بولی گھر کی بولی نہیں، اکتسابی تہذیبی زبان ہے۔ ان میں سے زیادہ تر نے اپنی ماؤں سے اودھی یا برج وغیرہ سُنی ہے۔ انھیں اندازہ نہیں کہ جس علاقے میں کھڑی بولی دن رات کی بولی ہے وہاں اس کا روزمرّہ کیا ہے۔ اس کے برعکس اُردو کے وہ ادیب جو کھڑی بولی علاقے کے باہر بھی پیدا ہوئے ہیں اکثر مادری زبان کے طور پر کھڑی بولی کا استعمال کرتے ہیں۔ انھیں اس کا ماحول میسّر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں کھڑی بولی کے پاکیزہ ترین نمونے اُردو میں ملتے ہیں۔

آخر میں مجھے یہ اعتراف کرنے میں باک نہیں کہ اہلِ اُردو لاکھ واویلا کریں کہ جدید ہندی اُردو کی نقل کرکے بنی ہے، جدید ہندی کسی علاقے کی بول چال کی زبان نہیں لیکن اس سب کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کروڑوں لوگوں نے (اُردو سے بدرجہا زیادہ نے) ہندی کو اپنا لیا ہے۔ اسے اپنی تہذیبی، ادبی اور علمی زبان مان لیا ہے۔ اس میں علم و ادب کی تخلیق اُردو سے کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ یہ مرکز اور کئی ریاستوں کی سرکاری زبان ہے۔ ہمیں اسے سیکھنا ہے، ہم اس سے اغماض نہیں کر سکتے۔

زبان کا مسئلہ

ہندوستان اور پاکستان کو ملا کر بجا طور پر ایک برصغیر کہا گیا ہے۔ روس کو چھوڑ کر یورپ کا رقبہ تقریباً اتنا ہی ہے۔ وہاں جس قدر زبانیں بولی جاتی ہیں اس برصغیر میں اس سے کم نہ ہوں گی۔ ہماری ریاستیں رقبے اور آبادی میں یورپ کے ممالک کی ہمسری کرتی ہیں۔

زمانہ ماقبلِ تاریخ میں جہاں تک ہم جھانک سکتے ہیں اس برصغیر میں سب سے پہلے بسنے والی نسل نیگرٹو (Negritto) تھی۔ اس نسل کی کچھ نشانیاں انڈمان کے غیر متمدن قبائل میں ملتی ہے۔ ان کے بعد آسٹرک نسل نے اس برِ صغیر کو آباد کیا۔ چھوٹا ناگپور کے آدی واسی اسی نسل کے ہیں۔ اس خاندان کی زبانوں میں منڈا گروہ سب سے اہم ہے۔ 'گنگا' اسی آسٹرک خاندان کی زبان کا لفظ ہے۔ آسٹرکوں کے بعد دراوڑ اس برِ عظیم میں داخل ہوئے۔ یہ ایک بڑی تہذیب کے مالک تھے۔ بعد میں آریوں نے انھیں جنوب کی طرف دھکیل دیا۔ آریہ ہندوستان میں اس طرح داخل ہوئے کہ یہاں کے مالک بن بیٹھے۔ ہندوستان کی اکثر زبانیں ہند آریائی ہیں۔ آریوں کے بعد عرب، افغان اور مغل حملہ آور ہوئے۔ ان کی تہذیب اور زبان نے ہندوستان کی بوقلمونی میں اضافہ کیا۔ انھوں نے ہندوستان کو قندِ پارسی سے آشنا کیا۔ آخری قابلِ ذکر بیرونی فاتح انگریز تھے جنھوں نے ملک کو انگریزی زبان دی۔

جس قدیم زمانے میں ہندوستان میں سنسکرت کا دور دورہ تھا اس وقت مفتوحین یعنی دراوڑ تو اپنی زبانیں بولتے ہی تھے۔ تمام آریہ ایک ہی زبان کا استعمال کرتے ہوں یہ قرینِ قیاس نہیں۔ پشاور سے بنگال تک ہزاروں میل کا فاصلہ ہے۔ اس زمانے میں رسل و رسائل کے وسیلے آج کل کے سے تو تھے نہیں اس لیے یہ ممکن نہیں کہ کئی صدیوں کی مدت میں اتنے بڑے علاقے میں بول چال کی بولیاں مختلف نہ ہو گئی ہوں۔ علما کا خیال ہے کہ آج کی طرح اس دور میں بھی کئی دیسی بولیاں تھیں۔ سنسکرت ایک مرصع ادبی زبان تھی جو اس زمانے کی بول چال کی زبان کی

نمائندگی نہیں کرتی۔ سرکاری[1] زبان کمیشن کی رائے ہے کہ "کلاسکل سنسکرت کبھی جمہور کی زبان نہ تھی۔"

نیچی ذات والوں کو سنسکرت سیکھنے کی اجازت نہ تھی۔ یہ جو مشہور ہے کہ شودروں کے لیے سنسکرت سننے پر بھی قدغن تھی، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ یہ قابلِ عمل نہیں کیوں کہ راجاؤں کے محل میں داسں داسیاں تو ہوتے ہی تھے۔ کیا ان کے سامنے ان کے آقا آپس میں بولتے چالتے نہ ہوں گے۔ اس زمانے کی دیسی بولیوں کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ کئی صدیوں کے بعد جب پراکرتوں کی تشکیل ہوئی تو سنسکرت ڈراموں میں طبقۂ بالا کے افراد سنسکرت میں گفتگو کرتے ہیں اور عوام پراکرتوں میں۔ اکثریت سے مغائرت برتنے، زیادہ مرصع ہونے اور قواعد میں جکڑ بند ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۵۰۰ ق۔م۔ کے لگ بھگ سنسکرت بول چال کی زبان کے طور پر ترک ہو گئی اور اس کی جگہ پہلے پالی نے لی پھر پراکرت نے اور پھر اپ بھرنش نے لیکن اس زمانے میں بھی سنسکرت حکومت، تہذیب اور ادب کی زبان کی حیثیت سے چھائی رہی۔ پانچسو قبل مسیح سے بارھویں صدی تک ہندوؤں کے راج میں سرکاری زبان کے طور پر سنسکرت استعمال ہوا کی۔ ملک کے مختلف حصوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں لیکن سنسکرت ہر ایک کو قبول تھی۔ حد تو یہ ہے کہ دراوڑوں نے بھی سنسکرت کو اسی طرح پڑھنا لکھنا شروع کیا جس طرح شمال کے آریوں نے۔ اسلامی دورِ حکومت میں جب سرکاری زبان فارسی ہو گئی تو شمال میں سنسکرت کا چراغ گل ہو گیا۔ لیکن اہلِ دکن نے اس کی لَو کو ویسے ہی فروزاں رکھا۔ چنانچہ بیسویں صدی میں بھی شمال کی نسبت دکن میں سنسکرت کا زیادہ رواج ہے۔ اس علاقے میں سنسکرت کے بڑے بڑے علماء ہوئے ہیں۔

اسلامی دورِ حکومت میں دربار اور امرا کی مجلسوں پر فارسی کا عمل دخل رہا۔ چند بیرونی علماء کے علاوہ یہ بھی عوام کی زبان نہ تھی لیکن یہ بھی ملک کی تہذیبی اور ادبی زبان بن گئی۔ انیسویں صدی کی چوتھی دھائی میں کمپنی نے فارسی کو ترک کر کے عدالتوں اور دفتروں کی نچلی سطح پر اُردو کا چلن کر دیا اور اوپری سطح پر انگریزی رائج کی۔ ہندوستان اور پاکستان کی مرکزی حکومتوں کا کام آج بھی زیادہ تر انگریزی میں ہو رہا ہے۔ اس طرح یہ صاف نظر آتا ہے کہ ۵۰۰ ق۔م سے آج تک یعنی

---

[1] آفیشیل لینگویج کمیشن رپورٹ (انگریزی میں) ص ۲۱

پچھلے دو ہزار سال میں اس برصغیر کی مرکزی حکومت کا کام کبھی جنتا کی بھاشا میں نہیں ہوا۔

ہندوستان مختلف نسلوں، مختلف زبانوں کا دیس ہے۔ یہ اختلافات ہی کیا کم تھے کہ مذاہب اپنی جنگی نعروں کے ساتھ میدان میں کود پڑے۔ جس ملک میں اتنے سارے اختلافات ہوں اس کا ایک قوم کے شیرازے میں منسلک ہونا آسان کام نہ تھا۔ پھوٹ ڈالنے والی طاقتوں میں مذہب سب سے زیادہ مہلک ثابت ہوا اور اس کے نام پر ملک تقسیم ہو گیا۔ آزادی سے قبل زبان کا مسئلہ بھی اسی سیاست میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس وقت نہ ہندی تامل کا جھگڑا تھا، نہ ہندی پنجابی کا بلکہ تمام اختلافات ہندی اردو پر مرکوز ہو کر رہ گئے تھے۔

آزادی سے پہلے کے ہندی اُردو نزاع کی داستان اتنی تلخ ہے کہ اس کے سننے کی تاب کم ہی لوگ لا سکتے ہیں۔ ذیل میں اختلافی امور سے قطع نظر کر کے چند اشاروں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

ہندی نے برج، بندیلی۔ اودھی۔ بھوجپوری۔ میتھلی۔ چھتیس گڑھی اور راجستھانی وغیرہ کو اپنے دامن میں لے لیا۔ اُردو نے محض کھڑی بولی سے سروکار رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندی کی پشت پر افراد کی جتنی بڑی تعداد ہے اُردو کے پیچھے نہیں۔ مغربی یوپی کے علاوہ بقیہ علاقوں میں کھڑی بولی کا چلن محض شہروں میں تھا۔ گیارھویں صدی سے انیسویں صدی تک ہندی کھڑی بولی میں کہیں کہیں اکا دکا کوئی تحریر مل جاتی ہے لیکن یہ ایک مضبوط روایت نہ بنی تھی۔ اُردو میں کھڑی بولی کی مقبولیت دیکھ کر ہندی نے بھی کھڑی بولی کی طرف توجہ کی اور اس میں تیزی سے ادب کی تخلیق ہونے لگی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی میں نئی ہندی کی دکان میں ایک وسیع سرمایہ جمع ہو گیا۔ کچھ ہی سال بعد یہ ہوا کہ ہندی نے اُردو کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ ملک میں ہندی کی کتابیں اُردو سے دُگنی چھپتی تھیں اور یوپی میں تو یہ اُردو کے مقابلے میں سات آٹھ گنی ہوتی تھیں۔ مولوی عبدالحق نے[1] ایک خطبے میں یوپی کی ہندی اُردو مطبوعات کی تقابلی تعداد دی ہے۔

سنہ	ہندی مطبوعات	اُردو مطبوعات
سنہ ۱۹۳۱ء	۱۷۵۹	۳۸۷
سنہ ۱۹۳۲ء	۲۰۹۰	۴۰۱

---

[1] خطباتِ عبدالحق حصہ دوم طبع اوّل ص ۱۰۹

سنہ ۱۹۳۴ء	۲۲۳۲	۲۷۵
سنہ ۱۹۳۵ء	۲۰۹۶	۳۰۶
سنہ ۱۹۳۶ء	۲۰۹۸	۲۵۴
سنہ ۱۹۳۸ء	۱۷۸۵	۱۸۲
سنہ ۱۹۴۰ء کے نو مہینے	۱۰۷۷	۱۵۹
سنہ ۱۹۴۱ء	۱۲۹۰	۱۹۸

ان حالات میں دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ اُردو ہندی سے مفاہمت کرکے ساتھ جینے کی کوشش کرتی لیکن ہندی کی طرح اُردو تحریک بھی بلاشرکت غیرے اس ملک کی واحد قومی زبان بننا چاہتی تھی۔ مولوی عبدالحق[1] کا دعویٰ تھا

"اس ملک میں جہاں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں یہی ایک ایسی زبان ہے جو سارے ملک کی مشترکہ اور عام زبان ہونے کا حق رکھتی ہے۔"

"تمام ملک[2] ہندوستان میں اُردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو اکثر صوبوں میں بلکہ تقریباً ملک کے ہر علاقے میں بولی یا سمجھی جاتی ہے اور ملکی یا قومی زبان ہونے کا حق رکھتی ہے۔"

ملک کی تقسیم نے اُردو۔ ہندی۔ ہندوستانی کا قضیہ طے کر دیا۔ اُردو پاکستان کی قومی زبان بنی، ہندی ہندوستان کی۔ روایت کی جاتی ہے کہ مجلسِ آئین ساز کی کانگریس اسمبلی پارٹی میں بحث اٹھی تھی کہ ملک کی زبان ہندی ہو کہ ہندوستانی برائے نام اکثریت سے ہندی کے حق میں فیصلہ ہوا۔ تقسیمِ ملک سے پہلے کی فرقہ وارانہ سیاست اور تقسیم کے بعد پاکستان کے جارحانہ رویّے کی ہیبت اس طرح دلوں پر طاری تھی کہ آئین ساز اسمبلی نے اتفاق رائے سے ہندی کو ملک کی سرکاری زبان تسلیم کر لیا۔ ریاستوں کے حصّے میں علاقائی زبانیں آئیں۔ دستور میں یہ بھی طے کیا گیا کہ ۱۵ سال تک مرکز اور ریاستوں میں انگریزی کا چلن رہے گا لیکن ساتھ ہی ہندی اور علاقائی زبانیں آہستہ آہستہ کام کاج میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے لگیں گی یہاں تک کہ

---

[1] خطباتِ عبدالحق حصہ دوم طبع اوّل ص ۱۴۳

[2] ایضاً ص ۱۸۷

۱۹۶۵ء میں انگریزی کو بالکل ہٹا دیا جائے گا۔ اگر اس میں کوئی دقت ہو تو پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیاں قانون بنا کر انگریزی کے استعمال کی مدت میں توسیع کر سکتی ہیں۔ پانچ سال بعد ایک سرکاری زبان کمیشن مقرر ہوگا جو یہ دیکھے گا کہ انگریزی کی جگہ ہندی کو استعمال میں لانے کی رفتار کیسی ہے اور اس کے لیے مزید کیا کرنا چاہیے۔

دستور کے آٹھویں گوشوارے میں ملک کی ۱۴ زبانوں کی فہرست دی گئی ہے۔ وہاں ایک عجیب بات یہ ہے کہ سنسکرت کو بھی ان میں شامل کر لیا گیا ہے۔ سنسکرت کی عظمت مسلم لیکن سنسکرت اب تو کسی کی زبان نہیں۔ میں اپنے مرحوم پردادا کا لاکھ احترام کروں لیکن مردم شماری کے وقت اپنے اہلِ خانہ کے سلسلے میں ان کا نام تو نہیں لکھا سکتا۔ اگر ہندوستان کی تمام زندہ مردہ زبانوں کا شمار کرنا تھا تو سنسکرت اور نئی زبانوں کی درمیانی کڑیوں کو کیوں نظر انداز کر دیا۔ پالی، اہم پراکرتوں اور خاص خاص اپ بھرنشوں کے نام بھی کیوں نہ ٹانک دیے گئے۔ بول چال کی زبان کی حیثیت سے تو کوئی سنسکرت کا بولنے والا نہیں لیکن چند پُر جوش پنڈتوں نے مردم شماری میں اسی کو اپنی مادری زبان لکھا دیا ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد ۵۵۵ تھی، ۱۹۶۱ء میں ۲۵۴۴ ہوگئی۔ یہ اضافہ پانسو فی صدی ہے۔ ان بزرگوں میں ضبط تولید کا پرچار ہونا چاہیے۔

سنسکرت میں اخبار اور رسالے نہیں نکلتے، ادبی تخلیق نہیں ہوتی لیکن علاقائی زبانوں کے دوش بدوش جگہ پانے کا نتیجہ یہ ہے کہ ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ہر سال اس کی کتاب کو بھی پانچ ہزار کا انعام دیا جاتا ہے حالاں کہ اس میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد ہی کتنی ہوتی ہے۔ سہ لسانی فارمولے کے تحت یوپی سرکار نے اسے بھی شامل کر لیا ہے۔ غرض زندہ زبانوں کو جو حقوق ملتے ہیں ان میں سنسکرت بھی برابر کی شریک ہے۔ اگر ملک کی تہذیب میں اس کی اہمیت کے پیش نظر اس کو لیا گیا ہے تو انگریزی کو بھی لینا چاہیے۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہماری روزانہ زندگی اور ہماری نئی تہذیب میں انگریزی سنسکرت سے کہیں زیادہ رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ تو ہندوستانیوں کے ایک طبقے کی مادری زبان بھی ہے۔ اینگلو انڈین اسکولوں کے مقدمے میں فیصلہ دیتے ہوئے بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس محمد علی کریم چھاگلا نے اعلان کیا:

"آئینی اعتبار سے آج انگریزی بھی اسی طرح دستور میں مسلمہ ہندوستانی زبان ہے اور اسی طرح تحفظ کی مستحق ہے جس طرح اس ملک کے اور کسی گروہ یا طبقہ کی زبان۔"

جب ملک کی تقسیم سے پیدا شدہ چکا چوندھ اور بوکھلاہٹ دور ہوئی اور حواس ٹھکانے آئے تو علاقائی زبان بولنے والوں کو احساس ہوا کہ ہندی کے سرکاری زبان ہونے کے کیا معنی ہیں۔ تمام بڑی سرکاری ملازمتوں میں جہاں دکن اور بنگال کے باشندوں کا غلبہ تھا۔ ہندی کے آنے کے بعد نقشہ ہی بدل جائے گا۔ اب کیا کیا جائے۔ کوئی یہ کہنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا کہ تامل یا بنگلہ وغیرہ کو مرکزی زبان بنادو۔ ڈوبتے کو انگریزی کے تنکے کا سہارا ملا۔ مطالبہ یہ کیا گیا کہ ہندی بہت پچھڑی ہوئی زبان ہے ابھی انگریزی کو چلنے دو۔ اِدھر ہندی والے سمجھ بیٹھے تھے کہ ہندی کو راج مل گیا۔ انھیں جلدی تھی کہ انگریزی کو دیس نکالا دے کر ہندی کو سنگھاسن پر براجمان کردیا جائے۔ اس طرح نئے ہندوستان میں زبان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دنیا میں اور بھی ملک ہیں جہاں ایک سے زیادہ زبانوں کے بولنے والے کافی تعداد میں ہیں سوئٹزرلینڈ۔ کناڈا، بلجیم وغیرہ۔ لیکن ان میں دو تین زبانوں کا مسئلہ ہے اور عام طور سے ہر باشندہ دونوں تینوں اہم زبانوں کو جانتا ہے۔ ہندوستان کی سی لسانی کثرت کہیں ہے تو روس میں۔ یہاں دو سو زبانیں اور بولیاں ہیں جن میں سے ۱۶ اہم ہیں۔ ۱۸ کروڑ کی کل آبادی میں سے دس کروڑ کی مادری زبان روسی ہے۔ ۳ کروڑ ۶۵ لاکھ کی یوکرینی، بقیہ میں بائیلو روسی، ازبک اور تاتار وغیرہ ہیں۔ مرکزی حکومت کا کام روسی میں ہوتا ہے لیکن سب قوانین اور گزٹ سولہ زبانوں میں چھپتے ہیں۔ روس کئی جمہوریتوں کا وفاق ہے۔ وہاں ہر ریاست نے اپنی مادری زبان کے لیے روسی رسم الخط اختیار کرلیا ہے۔ روسی زبان پڑھنا اگرچہ لازمی نہیں لیکن ہر ریاست میں ہر شخص "اپنی مرضی" سے روسی زبان پڑھتا ہے اس لیے مشترکہ زبان کے لیے کوئی دقت نہیں۔ روس کے نظام میں تو ہر شخص کی مرضی ایک ہی جہت میں چل سکتی ہے۔ مشکل ہے تو ہندوستان میں جہاں ہر فرد کو بہت کچھ آزادی دی گئی ہے۔ لیکن ہم روس کی اس بات کی تعریف کریں گے کہ وہاں ہر چھوٹی سے چھوٹی علاقائی زبان کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس میں تخلیق ادب کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں کم از کم اُردو کی حد تک معاملہ اس کے برعکس ہے۔

ہندی کو ملک کی سرکاری زبان اس لیے بنایا گیا کہ اس کے بولنے والے دوسری کسی بھی زبان کے بولنے والوں سے کہیں زیادہ ہیں لیکن بڑی کمی یہ ہے کہ ادبی اعتبار سے یہ کم از کم دو زبانوں، بنگلہ اور تامل سے پیچھے بھی رہتی ہے اور عمر میں بھی کم ہے۔ مراٹھی کا ادب بھی ہندی سے کم نہیں۔ بنگال اور مدراس وہ علاقے ہیں جن کا سب سے پہلے انگریزوں سے ملنا جلنا ہوا اور جس کی وجہ

سے انھوں نے سب سے پہلے انگریزی پڑھنی شروع کی۔ ایک صدی کی پہل کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدید علوم میں وہ بقیہ صوبوں سے آگے بڑھ گئے۔ ان کی زبانیں زیادہ ترقی کر گئیں۔ انگریز مستشرقین کلکتہ میں سنسکرت کالج کے قیام پر زور دیتے تھے لیکن راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۳ء میں حکومت سے احتجاج کیا کہ سنسکرت کی بجائے انگریزی تعلیم دیں۔ انھوں[۱] نے کہا۔

"اگر برطانوی پارلیمنٹ کا منشا ہندوستان کو جہالت میں مبتلا رکھنا ہو تو سنسکرتی نظامِ تعلیم اس مقصد کی تکمیل کے لیے بہترین آلہ تھا لیکن چوں کہ مقصد ہندوستانی آبادی کی اصلاح ہے اس لیے جدید اور ترقی یافتہ نظامِ تعلیم جاری کرنا چاہیے۔"

مجلسِ تعلیماتِ[۲] عامہ دسمبر ۱۸۳۱ء کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو قدیم مشرقی تعلیم رائج کرنے میں کتنی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ہر طرف انگریزی تعلیم کی مانگ تھی۔

ہندی علاقے سب سے بعد میں انگریزی عمل داری میں آئے اس لیے وہ جدید تعلیم کے باب میں سب سے پچھڑے رہے۔ ہندی اُردو بولنے والے دوسری زبانوں کے مقابلے میں اس وجہ سے بھی انگریزی میں کم مہارت رکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں مختلف زبانیں بولنے والوں کو دو مشترک زبانیں مہیا ہیں۔ انگریزی اور ہندوستانی۔ دوسری زبان والے اپنی ضرورت اکثر انگریزی سے پوری کرتے ہیں لیکن ہندوستانی بولنے والا ہر جگہ ہندوستانی سے کام چلا لیتا ہے۔

ہندی صوبوں کے بعد ہندی کے معاملے میں صوبۂ بمبئی (جو اس وقت مہاراشٹر اور گجرات میں تقسیم نہ ہوا تھا) نے سب سے زیادہ جوش دکھایا لیکن اس صوبے کے اربابِ حکومت کے ذہن میں ہندی کا نقشہ کچھ اور ہی ہے۔ بمبئی گورنمنٹ نے ۴۹ء میں گاندھی جی کی ہندی ہندوستانی کو اپنی زبان قرار دے لیا تھا لیکن جب دستور ساز اسمبلی میں زبان کے مسئلے پر غور کیا گیا تو بمبئی گورنمنٹ نے اپنا پہلا فیصلہ معطل کر دیا۔ ۱۹۵۱ء میں بمبئی گورنمنٹ کی ہندی ٹیچنگ کمیٹی نے اپنی رپورٹ دی جس میں ایک وسیع ہندی کی سفارش کی گئی۔ اس ضمن میں آئین کی دفعہ ۳۵۱ کی طرف دھیان دلایا گیا

It shall be the duty of the union to promote the speed of the Hindi language to develope it so that it may serve as a medium of expression for

---

۱ و ۲ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ ص ۱۵۴ از عبداللہ یوسفی

all the elements of composite culture of India and to secure its enrichment by assimilating without interfering with its genius the form, style and expressions used in Hindustani and in the other languages of Indian specified in the eighth shedule.

آٹھویں گوشوارے میں علاقائی زبانیں گنائی گئی ہیں ان میں ہندی بھی ہے۔ دلیل کی گئی کہ دفعہ ۳۵۱ میں مذکور مرکزی ہندی کو منجملہ اور زبانوں کے ہندوستانی اور خود علاقائی ہندی سے سے بھی استفادہ کرنا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مرکزی ہندی علاقائی ہندی سے مختلف ہوگی۔ ماولنکر جی نے (جو بعد میں لوک سبھا کے اسپیکر ہوئے) پشچم بھارت راشٹر بھاشا سمیلن میں سنہ ۱۹۵۰ء میں کہا۔

"حالاں کہ قومی زبان کا نام ہندی رکھا گیا ہے تو بھی یہ یوپی یا راجستھان میں جیسے بولی جاتی ہے ویسا ماننا بڑی بھول ہوگی۔ اس پر مختلف صوبوں کی زبانوں کا اثر ہوگا اور شاید مختلف صوبوں میں اس کا رنگ مختلف ہوگا۔"

سنہ ۱۹۵۱ء میں بی۔ جی۔ کھیر نے (جو بعد میں سرکاری زبان کمیشن کے صدر ہوئے) کہا کہ دستور میں جو ہندی ہے وہ آہستہ آہستہ پیدا ہوگی اور یہ یوپی یا بہار یا مدھیہ پردیش کی ہندی نہیں بلکہ گاندھی جی کی ہندی ہندوستانی ہوگی۔ سی۔ پی۔ اسمبلی کے اسپیکر گھنشیام داس گپتا نے بھی یہی کہا کہ قومی زبان کے طور پر ہندی، دلّی، لکھنؤ، الہ آباد یا رائے پور کی ہندی نہ ہوگی۔ کاکا کالیکر، مہا مہو پادھیائے پوندار، ہریجن کے ایڈیٹر مگن بھائی دیسائی سب کے ذہن میں ملکی ہندی کا یہی تصور تھا۔ خود کانگریس ورکنگ کمیٹی[۵] نے اپریل ۱۹۵۴ء میں علاقائی ہندی اور قومی ہندی کا ذکر کیا۔ اس کے بعد پنڈت نہرو[۵] نے کانگریس پارلیمانی کمیٹی کے بند اجلاس میں یہی کہا کہ علاقائی اور ملکی ہندی دو طرح کی ہوں گی۔ سرکاری زبان کمیشن کے ممبر مگن بھائی دیسائی نے ایک اختلافی نوٹ میں اسی وسیع ہندی کی مانگ

---

[۵] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۲۹۲

[۵] ایضاً ص ۳۹۴

کی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں این۔ وی۔ گیڈگل اور مہاراشٹر کے سابق وزیرِ صنعت ایس۔ جی۔ باروے نے اسی ہندی کا تذکرہ کیا۔

بمبئی گورنمنٹ نے ۵۴ء میں طے کیا کہ ۵۵ء سے ہندی کو ذریعہ تعلیم بنا دیا جائے۔ مدراس کے اخبار 'ہندو' نے ۵ مارچ ۵۴ء کے اداریہ میں اس فیصلے کی سخت نکتہ چینی کی۔ اپریل ۵۴ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے طے کیا کہ شروع سے آخر تک پوری تعلیم علاقائی زبان میں ہوگی۔ ادھر لسانی صوبوں کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو بمبئی نے ہندی کو ذریعہ تعلیم بنانے کا فیصلہ تعطل میں رکھا۔

علاقائی زبانوں کے بجائے ہندی میں کام کاج ہو تو غیر ہندی عوام کو تقریباً وہی دشواری رہے گی جو انگریزی کے ہوتے ہے۔ اس لیے مہاتما گاندھی نے ہمیشہ اس بات کی وکالت کی کہ صوبوں کی سطح پر وہاں کی علاقائی زبان سرکاری زبان ہوگی۔ دفتروں میں جو زبان استعمال ہوتی ہے تعلیم یافتہ جوانوں کو اسی میں مہارت لے کر نکلنا چاہیے۔ اس لیے یہ بھی لازم ہوا کہ مختلف صوبوں میں شروع سے آخر تک تعلیم علاقائی زبان میں ہو۔ سیکنڈری ایجوکیشن کمیشن اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی صدارت میں پہلے یونیورسٹی تعلیمی کمیشن دونوں نے علاقائی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی۔

اردو نے دیکھا کہ نئے ہندوستان میں اس کے لیے تو کوئی جگہ ہی نہیں چناں چہ یوپی میں اردو کے لیے دستخطی مہم جاری کی گئی۔ ۳۰ مئی ۱۹۵۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی گشتی چٹھی جاری ہوئی کہ علاقائی زبانوں کو بڑھاوا دینا چاہیے اور اس سلسلے میں اردو کو بھی اس کا مناسب مقام ملنا چاہیے۔[1] یوپی کانگریس کی مجلسِ عاملہ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ یوپی میں اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ دستخطی مہم کی حیرت انگیز کامیابی پر جھنجھلا کر لوک سبھا میں پرشوتم داس ٹنڈن اور سیٹھ گووند داس یہاں تک کہہ گئے: "اردو بیرونی زبان ہے۔ اگر اس کی ہمت افزائی کی گئی تو یہ ہندوستانی کلچر کو مجروح کرے گی۔"[2]

اس پر تبصرہ کرنا تضیع اوقات ہے۔ ٹنڈن جی کی یہ خواہش تھی کہ انگریزی کی جگہ علاقائی زبانیں نہیں بلکہ ہندی لے لیعنی دوسری زبانوں کے علاقے میں بھی ہندی حاکم اور وہ زبانیں محکوم رہیں۔ ۲۹ جنوری ۱۹۶۲ء کو گورکھپور جن پد ساہتیہ سمیلن سے خطاب کرتے ہوئے کہا

"ملک کے بعض خطوں میں علاقائی زبانوں یا انگریزی کے لیے آوازیں اٹھائی گئی ہیں۔

---

[1] Our Language Problem. از ایم۔ پی۔ ڈیسائی۔ ص ۱۸۳

[2] ایضاً ص ۲۱

ہندی ہماری لازمی زبان ہونی چاہیے اور مراٹھی، بنگالی، گجراتی اور دوسری زبانیں ثانوی زبان کے طور پر پڑھائی جائیں۔ کسی صورت میں انگریزی کو ہماری لازمی زبان نہ ہونا چاہیے۔"

تو ہندی کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ سارے دیس کی پٹ رانی بن جائے۔ اس پر علاقائی زبانوں میں احتجاج کیا گیا۔ آج کوئی یہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا کہ مختلف صوبوں میں ہندی کو اوّل اور علاقائی زبانوں کو ثانوی حیثیت دی جائے۔

انگریز ہمارے ملک کو بہت نقصان پہنچا کر گئے لیکن وہ ہمیں کچھ نہ کچھ دے کر بھی گئے۔ پارلیمانی طرزِ حکومت۔ قانون کا راج اور نظامِ عدل۔ اور انگریزی زبان۔ انگریزی ملک کے تمام پڑھے لکھوں کی واحد مشترکہ زبان ہے۔ ملک ہی کیا، اب تو یہ دنیا بھر کی رابطے کی زبان ہو گئی ہے۔ ثانوی زبان کے طور پر یہ دنیا کے اکثر ملکوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ سرکاری زبان کمیشن کی رپورٹ سے ذیل کی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

روس میں تقریباً چالیس فی صدی اسکولوں میں انگریزی زبان کا انتظام ہے جن میں ایک کروڑ بچّے انگریزی پڑھ رہے ہیں۔ مشرقی یورپ کے ملکوں میں روس کے بعد انگریزی کا سب سے زیادہ مطالعہ ہو رہا ہے۔ فرانس میں پچھلی جنگِ عظیم کے بعد سے اور اسکینڈینویا کے ملکوں میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے انگریزی دوسری خاص زبان ہو گئی ہے۔ اٹلی۔ اسپین اور پرتگال میں گو فرنچ بہت مقبول ہے لیکن اب انگریزی بھی کافی بڑھتی جا رہی ہے۔ بحیرۂ روم کے کنارے کے دوسرے ملکوں مثلاً یونان، ترکی، مصر، لیبیا اور دوسرے ملکوں میں اب فرنچ کی جگہ انگریزی کا چلن ہوتا جا رہا ہے۔ انڈونیشیا میں ڈچ زبان کی جگہ ہائی اسکول میں انگریزی لازمی کر دی گئی ہے۔ جاپان میں اب یونیورسٹی کے پہلے دو سالوں میں انگریزی لازمی ہے۔

دنیا کے دوسرے ملک انگریزی کو خاص بیرونی زبان کی حیثیت سے اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ کیا ہم اپنے قبضے میں آئی ہوئی دولت کو ٹھکرا دیں۔ ہندوستان کے حصّے میں جدید مغربی علوم سے جو کچھ آیا وہ محض انگریزی کے ذریعے سے۔ زبان کا ارتقا سماجی ضرورتوں کے مطابق ہوتا ہے جو تہذیب جتنی ترقی یافتہ ہوگی اس کی زبان بھی ویسی ہی ہوگی۔ ہندوستان جب تک معاشی اعتبار سے پچھڑا رہے گا اس کی زبانیں بھی پس ماندہ رہیں گی۔ انگلستان اور امریکہ کی مادّی ترقی کے باعث انگریزی زبان بھی دنیا کی سب سے متموّل زبان ہو گئی۔ ہم انگریزی زبان کے ذریعے دنیا کی کسی زبان

کے ادب کا مطالعہ کر سکتے ہیں خصوصاً سائنس اور دوسرے تکنیکی علوم کی ترقی کی ایک جھلک ہم انگریزی کی کھڑکی ہی سے دیکھ سکتے ہیں۔ روسی اور جرمن زبان جاننے والے تو ہمارے دیس میں نہ قابلِ لحاظ ہیں، نہ ہونے کا امکان ہے۔ سرکاری زبان کمیشن کو مدراس سرکار نے جو یادداشت دی تھی اس میں ہندی کو انگریزی پر ترجیح دینے کی وجہ لکھی تھی

English provides and Hindi can not provide direct access to creative modern thoughts.

اہلِ ہندی انگریزی پر دو اعتراض کرتے ہیں (۱) ہندوستان میں انگریزی جاننے والے ایک مغرور قوم بن گئے ہیں جو عوام کے سامنے احساسِ برتری کا مظاہرہ کرتی ہے۔ (۲) ڈیڑھ سو سال کے بعد بھی انگریزی صرف دو فی صدی لوگوں کو آتی ہے اس لیے اس کا چلن فوراً بند کر دینا چاہیے۔

جہاں تک احساسِ برتری کا سوال ہے ہندی میں اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے حضرات بھی اس نشے میں انگریزی والوں سے کم چور نہیں۔ اس کا تجربہ کسی اور کو ہو کہ نہ ہو ہندی علاقوں کے اردو والوں کو دن رات ہوتا رہتا ہے۔ جہاں تک تعداد کا سوال ہے دو فی صدی انگریزی جاننے والوں میں صرف انھیں کو شمار کیا گیا ہے جو ہائی اسکول پاس ہیں جب کہ ہندی کے پڑھے لکھوں میں ہر طفلِ مکتب کو گن لیا گیا ہے۔ یہ جو دو فی صدی انگریزی داں ہیں یہی ہندوستان کے فکر و فن کے امین ہیں پروفیسر۔ ڈاکٹر۔ انجینئر۔ سائنس داں۔ ماہرِ معاشیات۔ وکیل۔ جج۔ سرکاری ملازم۔ سیاسی رہنما۔ صحافی بڑے ادیب۔ مصور وغیرہ انھیں دو فی صدی میں ہیں۔ یہ قوم کے ذہنی قائد اور تہذیبی عمائد ہیں۔

یہی نہیں ہندوستانی زبانوں کے جتنے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں وہ سب انگریزی کالجوں اور یونیورسٹیوں کی پیداوار ہیں وہ اسی دو فی صدی نمشک کا حصّہ ہیں۔ انگریزی اداروں کے باہر جدید ہندوستانی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم ہوتی ہی کہاں ہے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کا تقریباً تمام جدید ادب انگریزی دانوں ہی کی دین ہے۔ ہر ہندوستانی ادب پر مغرب کی گہری چھاپ ہے۔ آج اردو کے شعرا، نقادوں، صحافیوں، افسانہ نگاروں پر نظر ڈالیے۔ دو چار کے سوا سب انگریزی میں اچھا دخل رکھتے ہیں مشرق کی کلاسکی زبانوں سے ہمیں جو ملنا تھا وہ مل چکا۔ اب مغرب کے بحرِ بے پایاں سے ہمیں اپنی جھولی بھرنی ہے۔ اگر ہم انگریزی سے کھنچے کھنچے رہنے لگیں تو بسم اللہ کے گنبد میں بند ہو کر رہ جائیں گے۔

اہلِ ہندی کی ہمیشہ یہ مانگ رہی ہے کہ فوراً ہر جگہ ہندی کا نفاذ کر دینا چاہیے۔ سرکاری زبان کمیشن رپورٹ پر غور کرنے کے لیے جو پارلیمانی کمیٹی بنی اس کی رپورٹ میں ڈاکٹر رگھویر، پرشوتم داس ٹنڈن

سیٹھ گووند داس وغیرہ نے اختلافی نوٹ لگائے۔ ان بزرگوں کی مانگ تھی کہ فوراً آج ہی سے ہائی کورٹ۔ سپریم کورٹ۔ مرکزی ملازمتوں کے مقابلے کے امتحانوں، ہندی ریاستوں کے دفتروں وغیرہ میں ہندی میں کام کرنا شروع کردو۔ ان حضرات کے لیے زبان ایک مقصد کے حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں خود مقصود بن کر رہ گئی ہے۔ کے۔ ایم۔ منشی جو ہندی ساہتیہ سمیلن کے صدر رہ چکے ہیں انھوں نے سرکاری زبان کمیشن کو ایک یادداشت دی۔ اس میں ایسے ہی لوگوں کو نظر میں رکھ کر جو کچھ کہا وہ انھیں[۱] کے الفاظ میں سنیے۔

"Movements are afoot to eliminate English rapidly from several spheres of life; Hindi can not take its place with equal speed. By an over enthusiastic effort at removing English from its place, Hindi has not gained; it has lost. Thoughts to the ordinary mind the elemination of English appears to be a highly patriotic performance. Our greatest danger today is militant regionl linguism."

"If India has to stand competition with the world in intellectual equipment, it can not do with only a second class linguistic instrument which is yet in the process of making."

سرکاری زبان کمیشن رپورٹ میں دو ممبروں ڈاکٹر سینتی کمار چٹرجی اور پی۔ سبّا زین نے اختلافی نوٹ دیے ہیں۔ کمیشن کی رپورٹ پر غور کرنے کے لیے ممبرانِ پارلیمنٹ کی جو کمیٹی مقرر کی گئی اس کی رپورٹ میں فرینک اینٹونی کا اختلافی نوٹ قابلِ ذکر ہے۔ ان تینوں رپورٹوں کو پڑھیے تو غیر ہندی لوگوں کے دلوں کی دھڑکن، اپنی زبان سے والہانہ عشق اور ہندی سے ان کے خدشات کا اندازہ ہوگا۔ کمیشن اور پارلیمنٹری کمیٹی دونوں میں اُردو کا ایک ایک نمائندہ تھا۔ انھوں نے کوئی اختلافی رپورٹ دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ان کے رویّے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ملک میں سب

---

[۱] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۳۲۱

سے زیادہ آسودہ اور مطمئن زبان ہے۔ ان سے بہتر تو اغیار ہیں جنھوں نے اُردو کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے۔ اُردو کے نمائندے اہلِ اُردو کے جذبات کی نمائندگی نہ کر سکے۔ انھیں لب کشائی کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ گورنمنٹ کے صرفے پر اُردو کے کیس کی کتنی اچھی اشاعت ہو جاتی۔

ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے یہ کہنے کی جرأت کی ہے کہ ہندی[۱] انیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے ربع میں اُردو سے عربی فارسی الفاظ نکال کر بنی ہے۔ نیز یہ کہ مغربی اتر پردیش کی زبان اُردو[۲] ہے، ہندی نہیں۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ ڈاکٹر چٹرجی کے یہ جذبات حُبِّ معاویہ کی وجہ سے نہیں بلکہ بغضِ علی کا نتیجہ ہیں۔ آزادی سے پہلے لکھی ہوئی اپنی مشہور کتاب انڈو آرین اور ہندی میں ڈاکٹر چٹرجی نے اُردو کے خلاف بہت کچھ زہر اُگلا ہے۔ فرینک اینٹونی نے اپنے نوٹ میں جے پال سنگھ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"آدی واسیوں کی منڈاری زبان کے بولنے والے کشمیری، آسامی اور اُڑیہ سے زیادہ ہیں لیکن اسے دستور میں جگہ نہیں دی گئی۔ سو سال سے یہ رومن میں لکھی جاتی ہے لیکن حکومتِ بہار نے حکم دیا ہے کہ ناگری میں لکھی جائے۔"

اینٹونی نے اندیشہ ظاہر کیا ہے[۳] کہ ابھی ہندی اینگلو انڈینوں، مسلمانوں، سکھوں اور آدی واسیوں کی زبانوں (انگریزی، اُردو، پنجابی اور منڈا) کے خلاف ہے۔ جب اس میں توانائی آجائے گی تو دوسروں کی زبان کے بھی خلاف ہو جائے گی۔

۱۹۵۶ء میں لسانی صوبے بنائے گئے، لیکن مراٹھی، گجراتی اور پنجابی کو علیحدہ صوبے نہیں دیے گئے۔ ان زبانوں نے لڑ بھڑ کر بڑی مشکل سے اپنے صوبے حاصل کیے۔ لسانی صوبے اس لیے بنائے گئے کہ ان میں دفتری کام اور تعلیم اپنی علاقائی زبان میں ہو سکے۔ اس سے لسانی اقلیتوں کا مسئلہ سامنے آگیا۔ صوبائی تنظیم کمیشن[۴] نے طے کیا کہ اگر کسی ریاست میں ۳۰ فی صدی یا اس سے زیادہ دوسری زبان کے بولنے والے ہوں گے تو وہ لسانی ریاست قرار دی جائے گی۔ نیز یہ کہ

۱؎ سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۲۸۷

۲؎ ایضاً ص ۲۷۹

۳؎ سرکاری زبان پر پارلیمنٹری کمیٹی کی رپورٹ (انگریزی میں) ص ۹۴

۴؎ سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۵۴

اگر کسی ضلعے میں ستر فی صدی یا اس سے زیادہ اشخاص ریاستی زبان سے مختلف زبان کے ہوں گے تو ان کی زبان کو ضلع کی سرکاری زبان مانا جائے گا۔

یوپی میں اُردو بولنے والے محض دس فی صدی ہیں اس لیے حکومت اور ہندی والے اُردو کو وہاں کی ثانوی زبان ماننے سے انکار کر رہے ہیں۔ ملک میں کوئی بھی ایسا ضلع نہیں جہاں کی ستر فی صدی آبادی اُردو بولنے والی ہو۔ اس طرح اُردو کی حد تک یہ سفارشیں بے سود ہیں۔ کمیشن کی رپورٹ کے بعد دستور میں ایک نئی دفعہ 350A شامل کی گئی جس میں ہر ریاست اور میونسپلٹی وغیرہ کو ہدایت دی گئی ہے کہ لسانی اقلیتوں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ اُردو کے معاملے میں اس پر کہاں تک عمل ہو رہا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔

زبان کا مسئلہ واشگاف ہو کر دو میدانوں میں سامنے آتا ہے۔ تعلیمی اداروں کی زبان اور سرکاری دفتروں کی زبان۔ سرکاری زبان کمیشن نے جو ہندی کے شیدائیوں سے لبریز تھا ہندی اور علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی سفارش کی لیکن ساتھ ہی انگریزی کی اہمیت کا انکشاف یوں کیا

"ہمارے[1] ذہن میں یہ بات صاف ہے کہ جب ہماری یونیورسٹیوں میں انگریزی ذریعۂ تعلیم نہ رہے گی تب بھی ایک عرصۂ دراز تک ہمارے لیے ضروری ہوگا کہ یونیورسٹیوں سے نکلنے والے گریجویٹ بالخصوص سائنس کے مضامین والے انگریزی پر عبور لے کر نکلیں تاکہ ان کی رسائی علم کے اس مخزن تک ہو سکے جو ابھی ہندوستانی زبانوں میں میسّر نہیں۔ ہمیں اس پر خاص دھیان رکھنا چاہیے کہ تعلیمی معیار گرنے نہ پائے۔"

"یونیورسٹی[2] گریجویٹ کو انگریزی کی اچھی معلومات لے کر نکلنا ہے تو سیکنڈری اسکول اسٹیج میں اچھی انگریزی سیکھ کر یونیورسٹی میں آئے۔"

آزادی کے بعد اٹھارہ سالوں میں تعلیم کا معیار یقیناً گرا ہے اور اس کی وجہ خاص ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں میں تعلیم دینا ہے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم رکھنے پر یہ ایک بجا اعتراض تھا کہ ہمارے دس بارہ برس انگریزی سیکھنے میں صرف ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے ہم دوسرے

---

[1] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۵۴

[2] ایضاً ص ۷۹

مضامین کو خاطر خواہ وقت نہیں دے سکتے۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے ہٹا دیا گیا لیکن انگریزی زبان بی۔اے تک پہلے کی طرح لازمی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ طلبہ کو انگریزی نہیں آتی۔ بی۔اے کا طالب علم انگریزی میں کلاس کا لکچر نہیں سمجھ سکتا۔ انگریزی کی کتابیں نہیں پڑھ سکتا۔ کم از کم ہندی علاقوں کا تو یہی حال ہے۔ لسانیات کے موسم گرما اسکولوں میں دیکھنے میں آتا ہے کہ تمام ہندوستانی زبانوں کے گروہ میں ہندی والے طلبہ علمی حیثیت سے سب سے پچھڑے ہوئے ہوتے ہیں جب کہ اہلِ دکن، مہاراشٹری اور بنگالی ان سے کہیں آگے ہوتے ہیں۔ یہ فرق صرف انگریزی کی بدولت ہے۔

ہماری لائبریری کی زبان انگریزی ہے۔ ہندی میں اعلیٰ درجے کی کتابیں میسّر نہیں، کچھ گھٹیا سے بازاری ترجمے ہیں جنھیں پڑھ کر امتحان پاس کر لیا جاتا ہے۔ یہی حال دوسری علاقائی زبانوں کا ہے اس لیے معیار گرتا جا رہا ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟ جب تک علاقائی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم نہ بنایا جائے گا ان میں اچھی کتابیں وجود میں نہیں آئیں گی۔ دس پندرہ سال کے عرصے میں ان کتابوں کا کسی قدر ذخیرہ بن سکے گا۔ ریاستی حکومتیں اپنی اپنی زبان پر توجہ دے رہی ہیں اور اس مقصد کے لیے مرکز کی معتد بہ امداد حاصل ہے۔ اُردو میں کتابیں تیار کرانے کا کام مرکزی وزارت تعلیم نے اپنے ذمّے لے لیا ہے۔ چوں کہ علاقائی زبانوں میں اچھی کتابیں تیار کرانے میں دس پندرہ سال لگیں گے اس لیے اس دور میں نکلنے والے طلبہ کا معیار پست ہو گا۔ کتنی بڑی قربانی دینی پڑ رہی ہے لیکن اس سے مفر نہیں۔

سائنس کے معاملے میں اور بھی مشکل ہے۔ ۱۹۵۰ء میں گورنمنٹ نے سائنسی اصطلاحوں کا بورڈ آف سائنٹیفک ٹرمنالوجی مقرر کیا تھا۔ اس کی سفارش[1] یہ تھی۔

"بورڈ یونیورسٹی کمیشن اور سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کی رائے سے متفق ہے کہ ہندی اور خاص ہندوستانی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں میں حتی الامکان بین الاقوامی سائنسی اور تکنکی اصطلاحیں استعمال کی جائیں۔ تکنکی لغات میں بین الاقوامی اصطلاحوں کو دیوناگری رسم الخط میں بھی رقم کر دیا جائے۔"

۱۹۵۳ء میں پونا میں ہونے والی کل ہند زبان ترقیاتی کانفرنس نے اس فیصلے میں ترمیم کر کے

---

[1] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۶۲

کہا کہ بین الاقوامی اصطلاحوں، فارمولوں اور سائنسی بیانات کو عام طور سے سنسکرت کی مدد سے ترجمہ کیا جائے۔ لیکن اگر وہ مناسب طریقے پر ترجمہ نہ ہو سکیں تو انھیں برقرار رکھا جائے۔ سرکاری زبان کمیشن بھی ترجمے کے حق میں ہے۔ دہرہ دون میں اس وقت کے مرکزی نائب وزیر تعلیم بھگت درشن نے بتایا کہ ہم ۲ سے ۲۵ فی صدی تک بین الاقوامی اصطلاحیں لیتے ہیں۔ ۲۰ فی صدی ہندوستانی زبانوں کی چالو اصطلاحوں کو لیا گیا ہے اور ۵۰ فی صدی سنسکرت کی مدد سے ترجمہ کی جا رہی ہیں۔

مرکزی سائنسی اصطلاحات کمیشن نے ڈھائی تین لاکھ ہندی اصطلاحیں تیار کر دی ہیں۔ یہ انگریزی اصطلاحوں کے مقابلے میں بالکل ناقابلِ فہم ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی اردو اصطلاحیں بھی اسی طرح ناقابلِ فہم تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء تک اردو کے ذریعے دی ہوئی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری کو انڈین میڈیکل کونسل نے تسلیم نہیں کیا کیوں کہ وہ ان کی رو سے ساقط المعیار تھی۔ آج ہندی علاقے کے کسی سائنس، ڈاکٹری یا انجینیری کے پروفیسر سے پوچھیے وہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کو کسی بھاؤ پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں۔ انڈین سائنس کانگریس ایسوسی ایشن کے مطابق ۱۹۵۵ء سے ہم باہر سے ہر مہینے چھ سو سائنسی اور تکنکی ماہنامے اور ہر سال ۱۲ سے ۱۴ ہزار تک کتابیں منگاتے تھے۔ ان کا ہندی میں کہاں تک ترجمہ کیا جائے گا۔ یہ مترجموں کی قوم بن کر رہ جائیں گی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سائنس کی تعلیم کے لیے کتابیں اگر ہندی اور دوسری علاقائی زبانیں آسان صوتیاتی رسم الخط یعنی اصلاح شدہ رومن خط میں لکھی جائیں تو بآسانی بین الاقوامی اصطلاحیں برقرار رکھی جا سکتی ہیں۔ ہندی کے ساتھ تو وہ میل کھاتی نہیں۔

ڈاکٹر کوٹھاری کی صدارت والے تعلیمی کمیشن کی رپورٹ کے بعد یہ طے پایا کہ ڈگری جماعتوں تک، علاقائی زبانوں میں تعلیم ہو اور پوسٹ گریجویٹ جماعتوں میں انگریزی میں۔ اس میں بھی قباحت ہے۔ جس منزل پر بھی ذریعۂ تعلیم بدلا جائے گا وہیں مشکل اٹھ کھڑی ہوگی۔

دفتروں کا کام کاج اپنے علاقے کی زبانوں میں کیا جانا چاہیے۔ ہندی علاقے ہی کو لیجیے اگر ہندی میں بولنا انگریزی کی نسبت سہل ہے تو لکھنا بھی سہل ہونا چاہیے لیکن ہندی کون سی؟ اردو اور انگریزی الفاظ سے دامن بچانے والی نہیں بلکہ اردو اور انگریزی کے تمام مروجہ الفاظ کو برقرار رکھنے والی۔ زبان کا واحد مقصد ترسیل ہے۔ مشہور ماہر لسانیات یسپرسن نے کہا ہے

"وہ زبان بہترین ہے جو ہر منزل پر زیادہ سے زیادہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ

سہولت کے ساتھ سمجھ میں آسکے۔"

لیکن سرکاری سطح پر بجلی کو ودیوت، دودھ کو ڈگدھ اور پولیس کو آرکشا کہا جارہا ہے سینٹرل ریلوے کے ہندی ٹائم ٹیبل میں तीन शायका वाले शयनयान کا عنوان ہے اسے تو عام ہندی والے بھی نہیں سمجھ سکتے۔ معلوم ہوا کہ یہ تین تختوں والے سونے کے ڈبے سے مُراد ہے۔ بنیادی انگریزی کے ساڑھے آٹھ سو الفاظ میں صرف ۳۵۲ الفاظ اینگلوسیکسن اصل کے ہیں۔ بقیہ نصف سے زیادہ دوسری زبانوں سے لیے گئے ہیں۔ ہندی کو بھی انگریزی الفاظ سے نہ جھجکنا چاہیے۔

مشکل ہندی کے وکیل کہتے ہیں کہ ہندی کو اس لیے سنسکرت زدہ ہونا چاہیے کہ جنوبی ہند والے مشترک الفاظ کی بنا پر اسے سمجھ سکیں۔ لیکن شمالی ہند میں جہاں اسے دن رات استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر وہاں ہی کوئی نہ سمجھ سکا تو دکنیوں کے سمجھنے سے کیا تشفی ہوگی اور اب تو یہ بھرم بھی جاتا رہا ہے۔ اہلِ دکن ہندی کے اس لیے خلاف ہیں کہ یہ شمالی ہند کے غلبے اور آریہ تہذیب کی نشانی ہے اسی وجہ سے وہ اب سنسکرت سے بھی دور ہٹنے لگے ہیں۔ تامل علاقے میں ۶۴ء میں سہ لسانی فارمولے کے تحت ۵۰ ہزار طلبہ نے ہندی لی، دو ہزار نے سنسکرت اور دو سو نے تیلگو لیکن بعد میں تامل ناڈ نے سہ لسانی فارمولے اور ہندی تعلیم دونوں پر اعتراض کردیا۔ ان کو یہ شکایت ہے کہ ہندی کے پردے میں ہم پر ویدک کلچر لادی جارہی ہے۔ ہندی ساہتیہ سمیلن کے سابق صدر کے۔ ایم۔ منشی نے سرکاری زبان کمیشن کو دیے گئے میمورنڈم میں کہا ہے

What I wish to struggle in the fashion of putting culture at the service of politics, no matter what politics. Probably the most glaring illustration of the reactionary process is the incredible and tragic story of Hindi in the making. Only the most childish argument against the use of the spoken word-arguments which the most elementary text books on linguistics would refute are solemnly trotted out. How can any one be free

if his language is tied?

آج سے بہت پہلے گریرسن کو بھی ہندی کی سنسکرت زدگی کھٹکتی تھی۔ انھوں نے لکھا ہے۔

"ہندی سنسکرت کے مہلک سایے میں آگئی ہے۔ ہندی کے پاس اپنا ذخیرۂ الفاظ اتنا وافر ہے کہ سنسکرت سے لیے جانے والے الفاظ بے ضرورت اور ناقابلِ فہم ہیں۔"

"ایسا ذخیرۂ الفاظ ہونے کے باوجود سنسکرت الفاظ استعمال کرنا فیشن ہو گیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ لاکھوں آدمی انھیں سمجھ سکیں، بلکہ چند لوگوں پر مصنّف کے علم کی دھاک بیٹھ سکے۔"

آئین کی دفعہ (3) 344 میں سرکاری زبان کمیشن سے کہا گیا ہے کہ ہندی کے روپ رنگ در روز افزوں استعمال کے بارے میں سفارش کرتے ہوئے کمیشن ملک کی تہذیبی، صنعتی اور سائنسی ترقی کی طرف مناسب دھیان دے گا۔

صنعتی اور سائنسی ترقی کے لیے ایک خاص قسم کے ذہن اور مزاج کی ضرورت ہے۔ یہ روشن ذہن انگریزی کے لگاؤ سے پیدا ہو سکتا ہے، سنسکرت سے نہیں۔

ریاستوں کی حد تک زبان کا مسئلہ صاف ہے۔ گتھی پڑتی ہے مرکز میں آکر۔ مرکز کی زبان اگر ہندی ہوتی ہے تو ہندی والوں کو دوسروں کی نسبت یقیناً بہت بڑا فائدہ ہوگا لیکن پالیسی یہ کہی جاتی ہے کہ زبان کی تبدیلی اس طرح ہونی چاہیے کہ کسی کو خلافِ معمول فائدہ یا نقصان نہ ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں۔ اہلِ ہندی نفع میں رہیں گے ہی۔ غیر ہندی والے چاہتے ہیں کہ

(۱) جب تک ہندی کافی ترقی نہ کرے اُسے انگریزی کی جگہ نہیں دینی چاہیے۔

(۲) جب تک غیر ہندی والے ہندی پر عبور نہ کریں اس وقت تک مرکز کا کام انگریزی میں چلتے رہنا چاہیے۔

جب دوسرے علاقوں میں ہندی کے خلاف تحریک چلائی گئی تو پنڈت نہرو نے یقین دہانی کی کہ جب تک تمام ہندی والے علاقے آمادہ نہ ہوں گے، ہندی کو ملک کی واحد سرکاری زبان نہ

ا؎ لسانی جائزۂ ہند جلد ۹ ص ۵۵

بنایا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر کوئی چھوٹی سی ریاست مثلاً ناگالینڈ بھی آمادہ نہ ہو تو ہندی کو غیر معینہ عرصے کے لیے ٹالا جا سکتا ہے۔

آئین میں کہا گیا تھا کہ پندرہ سال بعد انگریزی کی جگہ ہندی مرکز کی زبان ہو جائے گی۔ ۶۵ء کے اوائل میں ہندی کو کاغذ پر انگریزی کے ساتھ مرکزی زبان کر دینے پر صوبۂ مدراس میں کتنی بڑی تحریک ہوئی۔ چند سال بعد حکومتِ ہند نے پارلیمنٹ میں لسانی پالیسی ریزولوشن رکھا جس میں ہندی کو مرکز کی اصلی زبان اور انگریزی کو اس کی ہمراہ زبان قرار دیا۔ اس پر شمال و جنوب دونوں میں بڑی ہل چل ہوئی۔ اہلِ ہندی کو شکایت تھی کہ انگریزی کو کیوں برقرار رکھا گیا ہے۔ لکھنؤ، دلی، اندور وغیرہ میں طلباء نے قیامت مچا دی۔ دکانوں اور مکانوں کے انگریزی سائن بورڈ اور موٹروں کی انگریزی نمبر پلیٹیں توڑ پھوڑ دیں۔ ریل کے ڈبے اور ڈاکخانے جلا دیے۔ دکن والوں پر اس کا ردِّ عمل اس سے بھی شدید ہوا۔ وہ چراغ پا ہوئے کہ جب تک غیر ہندی علاقے رضامند نہ ہوں مرکز میں ہندی کو ذرا سا بھی بار کیوں دیا جائے۔ اگر شمال میں ریل کے ڈبے جلائے گئے تھے تو حیدرآباد میں پوری مسافر گاڑی جلا دی گئی۔ اس طرح حکومت چکی کے دو پاٹوں کے بیچ میں پسی جا رہی ہے اور معاملہ تعطّل میں پڑ گیا ہے۔

فی الحال مرکز کی زبان کے مسئلے کا حل یہ تجویز کیا جا رہا ہے کہ انگریزی اور ہندی بیک وقت مرکز میں استعمال ہوں۔ اس دوزبانیت کے کیا معنی ہیں؟ کیا سارا کام دو زبانوں میں ہوگا یا سرکاری ملازم کو اختیار ہوگا کہ وہ کوئی سی زبان استعمال کرے۔ گزٹ، قانون، اعلان، رپورٹیں وغیرہ تو دو زبانوں میں ہو سکتی ہیں لیکن دفتر میں فائل پر ایک ہی زبان میں لکھا جائے گا۔ کیا ہر ملازم کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنا نوٹنگ حسبِ منشا انگریزی یا ہندی میں کر سکے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر ملازم انگریزی اور ہندی دونوں میں ماہر ہو۔ اگر یہی ہونا ہے تو انگریزی اور ہندی میں سے ایک زبان کا علم اور استعمال خواہ مخواہ کا اضافہ ہی ہوا۔

ریاستوں سے کس زبان میں مراسلت ہوگی؟ ہندی، مراٹھی، گجراتی کی ریاستوں سے ہندی میں اور بقیہ سے انگریزی میں۔ لیکن مرکز کے ہر محکمے کو ریاستوں سے مراسلت کرنی پڑتی ہے اس کے معنی بھی یہی ہوئے کہ ہر مرکزی ملازم کو انگریزی اور ہندی دونوں جاننی ہوں گی لیکن گارنٹی تو یہ دی جاتی ہے کہ کسی کو ہندی نہ جاننے کی وجہ سے ملازمت سے محروم نہ کیا جائے گا۔ اگر محض انگریزی مرکزی ملازمت کے لیے کافی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مرکز کا کام محض انگریزی میں ہوگا، دونوں زبانوں میں نہیں۔ ہندی کا استعمال صرف ہندی ریاستوں سے مراسلت کے

لیے ہوگا ۔ اس میں بھی مشکل ہے۔

مثال کے لیے ایک منصوبہ بندی کمیشن کو لیجیے ۔ اسے ریاستوں سے بہت سابقہ پڑتا ہے۔ یا تو اس کے ہر ملازم کو ہندی بھی جاننی چاہیے یا ہندی ریاستوں کے متعلقہ دفتروں میں مرکز سے انگریزی میں کاغذات جائیں اور ریاست سے انگریزی ہی میں جواب اور رپورٹیں بھیجی جائیں۔ یہاں یہ حال ہے کہ مرکز سے انگریزی میں کوئی رپورٹ آتی ہے تو صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں اسے چاک کیا جاتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی مرکزی دفتروں کی زبان انگریزی رہے گی دو زبانوں کی بات خود فریبی ہے ۔

ایک اہم مسئلہ ہے مرکزی ملازمتوں کے ذریعۂ امتحان کا ۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کیوں کہ اس کا تعلق نہ صرف روٹی سے ہے بلکہ اقتدار سے بھی ۔ ظاہرا انگریزی کی جگہ ہندی کو دینے کے لیے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندی کو بھی ذریعۂ تعلیم بنا دیا جائے لیکن اس طرح ہندی والوں کو بے جا سہولت مل جائے گی۔ ہار کر یہ تجویز کیا گیا کہ سب زبانوں کو ذریعۂ امتحان بنا دیا جائے ۔ آج یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ شگوفہ اہلِ دکن نے چھوڑا ہے لیکن دراصل بھُس میں آگ لگانے والی جمالو کانگریس ورکنگ کمیٹی ہے ۔ ۴، ۵ اپریل ۱۹۵۴ء کو ورکنگ کمیٹی[1] نے طے کیا کہ یہ امتحان ہندی، انگریزی اور دوسری خاص خاص زبانوں میں ہوں گے ۔

یہاں سے اشارہ پاکر مدراس قانون ساز کونسل نے ستمبر ۱۹۵۵ء[2] میں قرارداد منظور کی:

"یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں انصاف برقرار رکھنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ دستور میں درج کی ہوئی تمام زبانوں میں امتحان ہوں اور ہر زبان کے بولنے والوں کی تعداد کے لحاظ سے اسامیوں کی تعداد (کوٹا) مقرر کر دی جائے ۔"

چوں کہ ۱۴ (اب سندھی سمیت ۱۵) مختلف زبانوں میں لکھے ہوئے پرچوں کو ایک معیار سے پرکھنے کا کوئی طریقہ نہیں اس لیے یہ ضروری ہوا کہ زبان وار یا ریاست وار حصہ مقرر کر دیا جائے ۔ اندازہ یہ ہے کہ ملازمتوں میں حصہ مقرر کر دینے کے بعد فوج میں بھی کوٹا کی بات کی جا سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کے حصے بکھرے ہو جائیں گے ۔ حکومت نے دو تین سال پہلے یہ

---

[1] Our Language Problem از ایم ۔ پی ۔ دیسائی ص ۱۰۹

[2] مرکاری زبان کمیشن کی رپورٹ ص ۲۶۲

اعلان کر دیا ہے کہ یہ امتحانات تمام زبانوں میں ہوں گے لیکن سب کا یکساں معیار رکھنے کا مسئلہ اتنا ٹیڑھا ہے کہ سال بہ سال اس پر عمل در آمد ملتوی ہوتا جارہا ہے۔ کوٹا کی اب کوئی بات نہیں کرتا لیکن مختلف زبانوں میں امتحان کا نتیجہ آنے دیجیے۔ پھر واویلا و غوغا مچے گا۔ ظاہر ہے کہ تامل میں لکھی کاپیوں کو تامل بولنے والا ممتحن دیکھے گا اور کشمیری میں لکھی کاپیوں کو کشمیری یہ اپنی علاقائی قومیت کے زیر اثر اپنے ہم زبانوں کو اتنے نمبر دیں گے کہ اگر ہو سکے تو اس سال کی تمام کی خالی اسامیوں پر انھیں کے ہم زبان قبضہ کر لیں۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔

رفتہ رفتہ مختلف ہائی کورٹوں کا کام بھی علاقائی زبانوں میں ہوگا۔ یوپی ہائی کورٹ کو قانونی طور پر ہندی میں کام کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے لیکن ابھی عملاً ایسا نہیں ہوا۔ اگر ہائی کورٹوں کا کام بھی مقامی زبانوں میں ہونے لگا تو ہمارے بیش بہا نظامِ عدل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔

یہ علاقائیت ملک کو پاش پاش کر کے چھوڑے گی۔ پندرہ بیس سال بعد ہندوستان کا کیا نقشہ ہو جائے گا۔ ہر ریاست کی درسگاہوں، دفتروں، عدالتوں میں علاقائی زبان میں کام ہوگا۔ ملک بارہ تیرہ آب خانوں میں بٹ جائے گا۔ مینارِ بابل کی طرح ایک کی بات دوسرا نہ سمجھے گا۔ ابھی یہ حال ہے کہ گرانڈ ٹرنک روڈ پر پنجاب سے گزر جائیے۔ بعض قصبوں کے بیچ سے سڑک گزرتی ہے، ہر جگہ گرمکھی میں نام لکھے ہوتے ہیں۔ یہ معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ یہ کون سا قصبہ ہے میل کے پتھروں پر مقامی زبان میں لکھا ہوتا ہے جو باہر والے کے لیے ناقابلِ فہم رہتا ہے۔ علاقائی زبانوں میں تعلیم کا رواج ہونے کے بعد ایک ریاست سے دوسری ریاست میں پروفیسر یا ریسرچ اسکالر نہ جا سکیں گے۔ ہر شخص کی تعلیم، تصنیف اور تحقیق اپنی زبان کی حدود میں بند ہو کر رہ جائے گی۔ ملک گیر اخبار ختم ہو جائیں گے۔ وکیل بحث کے دوران دوسرے ہائی کورٹوں کے فیصلوں کی نظیر پیش نہ کر سکیں گے۔ ابھی ایک قاعدہ ہے کہ ہر ریاست میں آئی۔ اے۔ ایس۔ افسروں اور ہائی کورٹ ججوں کی ایک مقررہ تعداد باہر کی ریاستوں سے لی جاتی ہے۔ دس پندرہ سال بعد یہ کیونکر ممکن ہوگا۔

ملک کی وحدت اور سالمیت کے لیے ضروری ہے کہ ایک منسلک کرنے والی زبان (Link Language) ہو۔ دوسری زبان والوں کو اس مشترک زبان کا معمولی

کام چلاؤ علم کافی نہیں بلکہ اس پر اتنا عبور ضروری ہے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات ادا کر سکیں۔ ابھی ایسی زبان انگریزی ہے۔ بعد میں ہندی کو اس کی جگہ لینی چاہیے۔ انگریزی ابدالآباد تک تو ہندوستان کی مشترک زبان رہ نہیں سکتی۔ ہندی کے لیے ملک کے بہت سے حصّے تیار ہیں۔

سنہ ۱۹۶۵ء میں ہندی کے برائے نام مرکزی زبان کر دینے پر تامل علاقے میں کتنا شدید ردِّ عمل ہوا۔ کئی سال پہلے آسام میں بنگالیوں کے خلاف بڑا فساد ہوا تھا۔ تامل علاقے میں سات جوانوں نے ہندی بیزاری ظاہر کرنے کے لیے اپنی جان کی قربانی دے دی۔ پولیس کی گولیوں سے مرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہمیں خودکشی کرنے والوں سے ہمدردی ہے لیکن ہم اس لسانی جنون کی تائید نہیں کر سکتے۔ مدراسیوں کی دیکھا دیکھی کیرالا، میسور، آندھرا، بنگال اور آسام سب نے واضح کر دیا کہ وہ عرصے تک انگریزی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

تامل ناڈ میں ہندی کی اتنی مخالفت ہے کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت کبھی بھی ہندی کو لازمی نہیں کیا جا سکا۔ اب تو تامل ناڈ سہ لسانی فارمولے ہی کو نہیں مانتا۔ ہمیں شکر کرنا چاہیے کہ غیر ہندی علاقوں کے لوگ تامل یا بنگالی کو ہندی کے ساتھ مرکز کی زبان بنانے کی مانگ نہیں کر رہے۔ صرف انگریزی کا چلن ہی چاہتے ہیں۔ انگریزی ہمیں بھی درکار ہے۔ ملک کی سالمیت کے لیے یہ کتنی تھوڑی قیمت ہے۔ جو اہل ہندی اس مطالبے کو نہ مان کر جوابی کارروائی کرتے ہیں وہ ہندی کو کتنا نقصان پہنچا رہے ہیں۔ کیا وہ بھول گئے کہ تقریباً چوتھائی صدی پہلے مذہب کے نام پر ملک تقسیم ہوا تھا۔ ایسی نوبت نہ آنی چاہیے کہ کوئی زبان کے نام پر یہی مطالبہ کرے۔ دراوڑ منیتر کڑاگم نے یہ مطالبہ تو کر دیا ہے کہ آئین میں سے سرکاری زبان سے متعلق فصل ہی نکال دی جائے تاکہ مرکز میں ہندی کی جڑ ہی کٹ جائے۔ ہندی کے شاعر اور سرکاری زبان کمیشن کے ممبر رام دھاری سنگھ دنکر[۱] نے کیا خوب کہا تھا۔

"جمہوری نظام میں عموماً اکثریت حکومت کرتی ہے لیکن زبان، مذہب

---

[۱] سرکاری زبان کمیشن رپورٹ ص ۳۹۵

اور کلچر جیسے بنیادی سوالوں پر اکثریت نہ صرف اقلیتوں سے سمجھوتہ کرتی ہے
بلکہ ان کو اپنی ترقی کا پورا موقع دیتی ہے۔"

پڑھنا ہو یا دفتروں میں کام کرنا، مادری زبان میں سہل ترین ہوتا ہے۔ اس اصول کا تقاضا ہے کہ ہر لسانی ریاست میں تدریس اور نظم ونسق علاقائی زبان میں ہونے چاہئیں۔ دوسری طرف قوم کی وحدت اور سالمیت کی مانگ ہے کہ سب ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکیں، رہ سکیں، روزگار کر سکیں۔ مادری زبان اور قومی وحدت کے متضاد تقاضوں نے ایسی گتھی پیدا کر دی ہے جو سلجھائے نہیں سلجھتی۔ کیا ہم ایک قوم ہیں؟

مہاتما گاندھی اور بھاشا کا سوال

نوٹ۔ اس لیکھ کی زبان ہندوستانی ہے جسے ہر ہندی والا پوری طرح سمجھ سکتا ہے۔ اس میں باپو کے سارے بول انجمن ترقیِ اُردو ہند کی کتاب مشترکہ زبان کے پہلے ایڈیشن سے لیے گئے ہیں۔

ہمارے نیتاؤں میں صرف مہاتما گاندھی ایسے تھے جنھوں نے زندگی کے ہر پہلو کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ایک بڑی گتھی بھاشا کی ہے اور اس پر باپو نے بار بار بڑے خوب صورت ڈھنگ سے اپنے وچار ظاہر کیے ہیں۔ اگر ہم نے ان پر دھیان نہیں دیا تو گھاٹا ہمارا ہوا مہاتما جی جنتا کے آدمی تھے، جنتا کی نبض پر ہاتھ رکھتے تھے اس لیے وہ اسی بھاشا کو قومی بھاشا مانتے تھے جو جنتا بول چال کے کام میں لاتی ہو۔ بھاشا کے سائنس کے لحاظ سے بھی بھاشا کا بول چال کا روپ ہی اصلی روپ ہے۔ لکھاوی روپ جھوٹا اور نقلی ہے۔ بھاشا کے سوال پر مہاتما جی کا سب سے پرانا لیکھ ۱۹۰۹ء کے ہند سوراج میں ملتا ہے۔

”سارے ہندوستان کے لیے تو ہندی ہی ہونی چاہیے۔ اسے اُردو میں لکھا جائے یا ناگری میں۔ ہندو مسلمانوں کے وچاروں کو ٹھیک رکھنے کے لیے بہت سے ہندوستانیوں کے لیے دونوں لکھاوٹوں کا جاننا ضروری ہے۔ ایسا ہونے پر ہم آپس کے بیوہار میں سے انگریزی کو نکال کر باہر کر سکیں گے۔“

کئی سال بعد انھوں نے ہندی کی یہ تعریف پھر دُہرائی۔

”ہندی بھاشا میں اسے کہتا ہوں جسے اُتّر میں ہندو اور مسلمان بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا اُردو لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے۔“

جو اُردو اور ہندی کو دو الگ بھاشائیں کہتے ہیں ان کے لیے مہاتما جی کا جواب یہ تھا کہ اتری بھارت میں مسلمان اور ہندو دونوں ایک ہی بھاشا بولتے ہیں۔ فرق صرف پڑھے لکھوں نے پیدا

کیا ہے۔ ۱۹۱۸ء میں مہاتما جی پہلی بار ہندی ساہتیہ سمیلن کے سبھاپتی ہوئی۔ اپنے بھاشن میں آپ نے پھر ہندی کی وہی تعریف کی۔ ۱۹۳۵ء میں آپ دوسری بار سمیلن کے سبھاپتی ہوئے اور اس بار سمیلن سے ہندی کی اپنی تعریف منوالی۔

آپ نے اپنے لیکھوں اور بولوں میں نہ صرف اُردو اور ہندی بلکہ ہندوستانی کو بھی ایک بھاشا مانا ہے۔

"ہندی، ہندوستانی اور اُردو شبد ایک ہی زبان کو ظاہر کرتے ہیں جسے اُتر بھارت میں ہندو مسلمان دونوں بولتے ہیں اور جو دیوناگری یا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جاتی ہے[1]۔"

"ہندی، ہندوستانی اور اُردو یہ تینوں شبد ایک ہی بھاشا کی طرف[2] اشارہ کرتے ہیں۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی مہاتما جی کے ایسے بول بھی بہت کافی ہیں جن میں اُردو اور ہندی اور ہندوستانی کو بھی الگ بھاشا کہا گیا ہے۔ مثال کے طور پر

"اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو انھیں اُردو پڑھنی ہی چاہیے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمان کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیے[3]۔"

"ہندوستانی کو اصلی شکل دینے کے لیے ہندی اور اُردو کو اس کی پالنے والی بھاشائیں سمجھنا چاہیے۔ اس لیے کانگریس کو ان دونوں کی طرف اچھے وچار رکھنے چاہئیں۔"

"کانگریس سے آزاد رہ کر ہندی اور اُردو برابر ترقی کرتی رہیں گی۔ ہندی زیادہ تر ہندوؤں میں اور اُردو مسلمانوں میں محدود رہے گی۔"

"ایسے بھی کچھ لوگ ہیں جو اس بات کا سپنا دیکھتے ہیں کہ یہاں خالی اُردو یا خالی ہندی ہی رہے گی لیکن میرا خیال ہے کہ یہ ناپاک سپنا ہے اور ہمیشہ سپنا ہی رہے[4] گا۔"

۲۷ جنوری ۱۹۴۶ء کو دکشن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس میں بولتے ہوئے کہا "ہندی اور اُردو دو ندیاں ہیں اور ہندوستانی ساگر ہے۔ ان دونوں میں سے ہمیں

---

[1] ہریجن سیوک ۳ر جولائی ۱۹۳۷ء

[2] ہریجن۔ ۵ر جولائی ۱۹۴۶ء

[3] نوجیون۔ ۲۱ر جولائی ۱۹۲۷ء

[4] ہریجن سیوک ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۸ء

کسی سے نفرت نہیں ہونی چاہیے۔ ہمیں تو دونوں کو اپنانا ہے۔ ہندوستانی کا پیٹ اتنا بڑا ہے کہ وہ دونوں کو اپنا لے گی۔"

آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ یہ دونوں باتیں سچ ہیں۔ اگر بول چال کے روپ کو سامنے رکھیں تو اُردو، ہندی اور ہندوستانی ایک بھاشا ہیں۔ اگر ان کا لکھا ہوا روپ اور ساہتیہ دیکھیں تو اُردو اور ہندی الگ الگ زبانیں ہیں۔

اسی طرح ان کے لیکھوں میں ایک طرف بہت سے ایسے ٹکڑے مل جائیں گے جہاں انھوں نے زور دیا ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی اور ہندی صرف ہندوؤں کی بھاشا نہیں مثلاً

"ہندی بولنے والے حصّوں میں پیدا ہونے والے مسلمانوں کی مادری زبان ہندی ہی ہے اسی طرح ایسے ہزاروں ہندو ہیں جن کی ماتر بھاشا اُردو[1] ہے۔"

دوسری طرف کئی بار وہ اُردو بھاشا اور لپی کو مسلمانوں سے اور ہندی بھاشا اور دیوناگری کو ہندوؤں سے جوڑ دیتے ہیں۔ نمونے کے طور پر:

"اگر ہندو اپنے بھائیوں کے نزدیک آنا چاہتے ہیں تو انھیں اُردو پڑھنی ہی چاہیے اور ہندو بھائیوں کے نزدیک آنے کی خواہش رکھنے والے مسلمان کو بھی ہندی ضرور سیکھ لینی چاہیے[2]۔"

یہ دونوں باتیں انمیل ہیں لیکن گہرائی میں جاکر دیکھا جائے تو دونوں اپنی اپنی جگہ سچ ہیں۔ اُردو پڑھنے والے زیادہ تر مسلمان اور ہندی پڑھنے والے ہندو ہوتے ہیں لیکن سب مسلمانوں کی بھاشا اُردو ہی نہیں ہوتی اور کچھ ہندو ہندی نہ پڑھ کر اُردو پڑھتے ہیں۔

مہاتما جی سچ مچ ہندی اور ہندوستانی میں کوئی فرق نہ کرتے تھے۔ ۱۹۲۱ء سے انھوں نے عام طور پر قومی زبان کو ہندوستانی کہنا شروع کیا۔ چناں چہ ان کے اشارے پر ۱۹۲۵ء میں کانپور کانگریس نے اپنے ودھان کی دفعہ ۳۳ یہ کردی کہ آئندہ سے کانگریس کی شاخوں اور ورکنگ کمیٹی کا کام ہندوستانی میں کیا جائے گا۔ جو بولنے والے ہندوستانی نہیں بول سکتے وہ انگریزی یا کسی صوبائی بھاشا کا استعمال کرسکتے ہیں۔

مہاتما جی نے بھاشا کی پوری اسکیم ۱۹۲۴ء کے ایک لیکھ میں یوں دی ہے۔

۱۔ ہریجن سیوک ۲۹ راکتوبر ۱۹۳۹ء

۲۔ نوجون ۲۱ رجولائی ۱۹۲۷ء

"ایک خاص میعاد کے اندر ہر صوبے کی عدالتوں اور اسمبلیوں کا کام کاج اسی صوبے کی بھاشا میں جاری ہو جانا چاہیے۔ اپیل کی آخری عدالت کی زبان ہندوستانی قرار دی جائے لکھاوٹ چاہے دیوناگری ہو چاہے فارسی۔ مرکزی سرکار اور بڑی اسمبلیوں کی بھاشا بھی ہندوستانی ہی ہو انتر راشٹری راج بیوہار کی زبان انگریزی رہے۔"[۱]

مہاتما جی نے آدرش وادی کی طرح یہ سب لکھ دیا ہے۔ ان باتوں پر عمل کرنے میں جو مشکلیں ہیں ۱۹۲۴ء میں ان کا اندازہ مہاتما گاندھی کے لیے مشکل تھا۔ آج ہم سب کو معلوم ہے مثال کے طور پر ہائی کورٹوں کا کام صوبائی بھاشاؤں میں ہو اور سپریم کورٹ کا ہندوستانی میں تو قانون اور انصاف کے ڈھانچے کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ پھر ہندوستانی میں یہ جان کہاں کہ وہ سپریم کورٹ، پارلیمنٹ اور دلی سرکار کی بھاشا بن سکے۔ اس ذمہ داری کو اٹھاتے تو خالص ہندی یا خالص اردو بھی لنگڑانے لگتی ہیں۔ بہر حال ۱۹۲۴ء میں ایک موٹے اصول بلکہ آدرش کے روپ میں یہ مانگیں سراہنے کے لائق تھیں۔

ہندوستانی اور دکھنی ہند والے۔ ہندی یا ہندوستانی کو قومی زبان بنانے سے اصل دقت دراوڑ صوبوں کے رہنے والوں کو ہوتی۔ ان سے مہاتما جی نے بار بار اپیل کی کہ باقی دیش واسیوں کی خاطر ہندی سیکھ لیں۔ لکھتے ہیں۔

"ساڑھے اکتیس کروڑ کی آبادی میں صرف ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ سے کچھ اوپر مدراسی لوگ ہندوستانی بولنے والوں کی بات تو سمجھ نہیں سکتے۔ اس علاقے کے ۳۸۰ لاکھ لوگوں کا دھرم کیا ہے کیا ان کے لیے ہندوستان انگریزی سیکھے یا پھر باقی ۲۷۷ لاکھ ہندوستانیوں کے لیے انھیں ہندوستانی سیکھنی چاہیے۔"[۲]

بنگلور میں ۱۹۳۵ء میں ہندی پرچار سبھا کے کنووکیشن میں کہا۔

"بھارت کے بیس کروڑ آدمیوں سے تعلق پیدا کرنے کے لیے کرناٹک کے ایک کروڑ دس لاکھ نر ناریوں کو ان کی بھاشا ہندی سیکھنی چاہیے۔"

۵ر جولائی ۱۹۴۶ء کے ہریجن میں مہاتما جی نے پھر کرناٹک والوں سے اپیل کی کہ بیس کروڑ

۱ے نوجیون ۲۶ر دسمبر ۱۹۲۴ء

۲ے ینگ انڈیا۔ ۲۱ر جنوری ۱۹۲۱ء

دلیش بھائیوں کے ساتھ سمبندھ قائم کرنے کے لیے ہندی سیکھیں۔"

مہاتما جی کی ہندوستانی میں بڑی لچک تھی۔ وہ سنسکرت بھری ہندی اور عربی فارسی بھری اُردو کے خلاف تھے لیکن یہ مانتے تھے کہ کبھی کبھی ہندوستانی میں سنسکرت یا عربی فارسی میں سے کسی ایک کا زور ہو سکتا ہے۔ چنانچہ دکھن والوں کے لیے ہندوستانی میں سنسکرت شبد ہونے ہی چاہئیں۔ لکھتے ہیں[1]۔

"اگر سنسکرت جاننے والے ہندو سنسکرت شبدوں کا ایک حد تک استعمال کرتے ہیں تو ان کا ایسا کرنا ضروری ہے۔ صرف عربی جاننے والے مسلمان بھی یہی کرتے ہیں۔ تامل یا تیلگو کی کسی چیز کا ترجمہ آپ ہندی یا ہندوستانی میں کریں اور اس میں سنسکرت شبد نہ آئیں یہ نہیں ہو سکتا۔ ان کا آنا قریب قریب لازمی ہے کیوں کہ ان میں سنسکرت شبد بہت زیادہ ہیں۔ یہی حال عربی لفظوں کا ہے۔ عربی کی کسی چیز کا ترجمہ اگر ہم ہندی یا ہندوستانی میں کرنے بیٹھیں تو اس میں عربی شبدوں کو آنے سے ہم روک نہیں سکتے۔"

مہاتما جی نے ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں یہ رائے ظاہر کی کہ چوں کہ دکھن کی بھاشاؤں اور بنگالی میں سنسکرت شبد زیادہ ہیں اس لیے سنسکرت شبدوں سے بھری ہوئی ہندی ہی ان لوگوں کو اپیل کر سکتی ہے۔ اسی طرح جیسے پنجاب والوں کی ہندوستانی میں عربی فارسی شبدوں کی ملاوٹ ہو گی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن مہاتما جی نے یہ غضب کیا کہ صوبائی بھاشاؤں والوں کو بار بار یہ صلاح دی کہ وہ اپنی بھاشا دیوناگری میں لکھنے لگیں۔ ۱۹۳۵ء میں بنگلور کے ہندی پر چار کنووکیشن میں مہاتما جی نے کرناٹک والوں پر زور دیا کہ وہ ہندی سیکھ لیں۔ اس پر وہاں کے ایک شخص نے بگڑ کر لکھا۔

> "تامل والا تامل کی جگہ انگریزی میں سوچتا ہے۔ آپ کی یوجنا کے بعد وہ ہندی میں سوچنے لگے گا۔ اس طرح اس نیتی کا صاف نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اور ساری بھاشائیں مٹ جائیں اور صرف ہندی رہ جائے وہ بھی دونوں لکھاوٹوں میں کیونکہ سب بھاشاؤں کی لکھاوٹ تو دیوناگری ہی ہو جائے گی۔"

---

[1] ہریجن سیوک ۲۳ر جون ۱۹۳۶ء

اس پر مہاتما جی نے جواب[1] دیا۔

"اگر پورا راشٹر اپنی بھاشا کے سوا ایک کل بھارتی بھاشا جان لے تو کیا حرج ہے۔ یہ بھاشا ہندی یعنی ہندوستانی ہی ہو سکتی ہے۔ رہا ماتری بھاشا کا سوال تو آپ مجھے غلط سمجھے ہیں ماتری بھاشا کو پہلی جگہ دیتا ہوں۔ ہاں لپی کے بارے میں مجھے اپنی رائے پر پچھتاوا نہیں ہے۔ جو الگ الگ بھاشائیں سنسکرت سے نکلی ہیں یا جن کے ساتھ اس کا گہرا رشتہ رہا ہے پر جُدا جُدا لکھاوٹوں میں لکھی جاتی ہیں ان کی ایک ہی لپی ہونی چاہیے اور وہ لکھاوٹ دیوناگری ہی ہے۔"

اس کے بعد بھی مہاتما جی صوبائی بھاشاؤں کے لیے دیوناگری کی وکالت کرتے رہے، لکھتے ہیں۔[2]

"اس میں شک نہیں کہ دیوناگری لکھاوٹ کا ایک آندولن چل رہا ہے جس کا ساتھ میں دل سے دے رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ مختلف صوبوں میں خاص کر جن صوبوں میں سنسکرت شبدوں کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے بولی جانے والی تمام بھاشاؤں کے لیے دیوناگری لکھاوٹ کو مان لیا جائے۔

"رومن لکھاوٹ نہ تو ہندوستان کی زبان ہو سکتی ہے اور نہ ہونی چاہیے۔ یہ برابری تو فارسی اور دیوناگری کے بیچ ہی ہو سکتی ہے اور اس کی بنیادی خوبیوں کو الگ رکھ دیں تو بھی دیوناگری ہی سارے ہندوستان کی سب کو منظور لکھاوٹ ہونی چاہیے کیوں کہ مختلف صوبوں میں چالو زیادہ تر لکھاوٹیں بنیادی طور سے دیوناگری ہی سے نکلی ہیں . . . . لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں پر یا دوسرے ایسے لوگوں پر جو اس سے انجان ہیں اسے زبردستی لادنے کی ہمیں کسی طرح کی کوئی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔"[3]

مہاتما جی کی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ تمام صوبائی بھاشائیں تو دیوناگری میں لکھی جائیں لیکن خود ہندی، دیوناگری اور اردو دونوں میں لکھی جائے۔ ایسا کچھ شبہ کسی اُتّر بھارت والے کے دل میں اٹھا اور اس نے مہاتما جی سے کئی سوال کیے جن کا جواب ۲۶ر اپریل ۱۹۴۷ء کے

---

[1] ہریجن ۱۵ر اگست ۱۹۳۶ء

[2] ہریجن سیوک ۲۳ر جون ۱۹۳۶ء

[3] ایضاً ۳ر جولائی ۱۹۳۷ء

ہریجن سیوک میں ملتا ہے۔ سوال کرنے والے نے کہا تھا کہ

"اگر آپ ہندو مسلم ایکتا کے لیے اُردو سیکھنے کو کہتے ہیں تو بنگال، مہاراشٹر، گجرات، دکھنی بھارت وغیرہ کے مسلمان تو اُردو نہیں جانتے، صوبائی بھاشائیں بولتے ہیں۔ اتر بھارت کی تمام بھاشائیں سنسکرت سے نکلی ہیں اور دکھنی بھارت کی بھاشاؤں میں سنسکرت شبد آگئے ہیں پھر ان میں عربی فارسی جیسی اجنبی زبانوں کے شبدوں کا پرچار کیوں کیا جائے؟"

دوسرا سوال لپی کے بارے میں تھا کہ زیادہ تر صوبوں کی لپیاں دیوناگری سے نکلی ہیں۔ صرف پنجاب اور سندھ والے ناگری کیوں نہیں سیکھ لیتے۔ باقی لوگوں سے اُردو لپی سیکھنے کو کیوں کہا جاتا ہے۔

مہاتما جی نے جواب دیا آپ کی بات میں بہت سچائی ہے لیکن ہندو مسلم ایکتا کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اگر دوسرے صوبوں والے دیش پریم کے ساتھ ایک اور لپی اُردو سیکھ لیں تو ان کا فائدہ ہی ہے۔

مہاتما جی اور انگریزی: آگے بڑھنے سے پہلے ہم انگریزی کے لیے مہاتما جی کے وچار جانتے چلیں۔ وہ ۱۹۰۹ء سے کہتے چلے آئے ہیں کہ ہمیں انگریزی کو نکال باہر کرنا ہے۔ ودیشی بھاشا ہمیں آزادی نہیں دلا سکتی لیکن انگریزی کی کوئی جگہ ہونی چاہیے یا نہیں۔ اس کی طرف بھی انھوں نے اشارہ کیا ہے۔ اندور میں ۱۹۱۸ء میں کہا۔

"یہ کہنا ضروری نہیں ہے کہ میں انگریزی بھاشا سے نفرت نہیں کرتا ہوں۔ انگریزی ساہتیہ بھنڈار ہے۔ میں نے بھی بہت سے رتنوں کا استعمال کیا ہے۔ انگریزی بھاشا کے ذریعے ہم کو سائنس وغیرہ کی خوب جان کاری حاصل کرنی ہے۔ اس لیے انگریزی کی جانکاری بھارت واسیوں کے لیے ضروری ہے لیکن اس بھاشا کو اس کی ٹھیک جگہ دینا ایک بات ہے اس کی پوجا کرنا دوسری بات ہے۔"

۱۹۲۴ء میں بھاشا سے متعلق مہاتما جی نے اپنی پوری اسکیم کھُل کر بیان کی۔ اس کا ذکر پیچھے آچکا ہے۔ اس میں انگریزی کو صرف دوسرے ملکوں سے کام کاج کے لیے باقی رکھا ہے ملک کے اندر کوئی جگہ نہیں دی۔ یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ ۱۹۲۷ء میں جھریا میں کوئلے کی کانوں کے مزدوروں کی طرف سے مہاتما جی کو انگریزی میں ایک ایڈریس دیا گیا۔ آپ نے اسے سننے سے انکار کر دیا اور اسے پڑھے بغیر ہی پڑھا ہوا مان لیا گیا۔ ۲۰؍جنوری ۱۹۲۷ء کو نوجیون میں

مہاتما جی نے یہ امید ظاہر کی ہے کہ آیندہ کسی سبھا کی کارروائی کسی ایسی بھاشا میں ہو جسے زیادہ لوگ نہ جانتے ہوں تو اچھا ہوگا کہ وہ لوگ اس سبھا سے اٹھ کر چل دیں۔ ظاہر ہے کہ باپو کا اشارہ انگریزی کی طرف تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مہاتما جی پڑھے لکھوں کے لیے انگریزی جاننا ضروری نہ سمجھتے تھے۔ صرف کچھ لوگ انگریزی پڑھ لیں اسے کافی مانتے تھے۔ ہریجن میں ٹ لکھتے ہیں۔

"میں نے بار بار یہ سمجھایا ہے کہ ہماری ترقی میں انگریزی کی ایک مقرر جگہ ہے۔ ہمارے راجیوں کی اور ساری پچھمی دنیا کی بات سمجھنے کے لیے اور پچھم کی اچھی سے اچھی باتیں ہندوستانی کو سکھانے کے لیے ہمارے کچھ آدمیوں کو انگریزی ضرور سیکھنی چاہیے۔ کیوں کہ پچھمی بھاشاؤں میں اس کا سب سے زیادہ پرچار ہے۔"

اس لیکھ میں انگریزی کو راجیوں کی باتیں سمجھنے کا ذریعہ بھی قرار دیا گیا ہے۔ راجیوں سے مطلب صوبے ہی ہو سکتے ہیں۔ صرف اس لیکھ کے سوا اور کہیں یہ دیکھنے میں نہیں آیا کہ مہاتما جی نے صوبوں کے بیچ میل جول کے لیے انگریزی کو ضروری سمجھا ہو۔ سچ یہ ہے کہ مہاتما جی انگریزی کو دیس کی ترقی کے راستے میں روڑا سمجھتے تھے۔ ایک جگہ انگریزی سیکھنے کو وقت برباد کرنا کہہ گئے ہیں۔

"انگریزی زبان نے ہم پر جو جادو کر ڈالا ہے اس کے اثر سے ہم ابھی تک چھوٹے نہیں ہیں۔ اس جادو کے جال میں پھنس کر ہم لوگ ہندوستان کو اپنے مقصد کی طرف آگے بڑھنے سے روک رہے ہیں۔ جتنے سال ہم انگریزی سیکھنے میں برباد کرتے ہیں اگر اتنے مہینے بھی ہم ہندوستانی سیکھنے کی تکلیف نہ اٹھائیں تو سچ مچ ہی کہنا ہوگا کہ ہم عام لوگوں کی طرف اپنے پریم کی جو ڈینگیں ہانکا کرتے ہیں وہ نری ڈینگیں ہی ہیں۔"

(رچنانک کاریہ کرم)

آج تعلیم کے ماہر عام طور پر مانتے ہیں کہ ہندوستان میں ہر پڑھے لکھے کو انگریزی ضرور پڑھنی چاہیے۔

مہاتما جی اور اردو: مہاتما جی نے سب سے زیادہ حمایت اُردو کی کی لیکن دکھ کی بات ہے کہ ان کی سب سے زیادہ مخالفت اُردو والوں نے ہی کی۔ یہ ایک سچائی ہے کہ آزادی سے

ٹ ہریجن ۱۵ اگست ۱۹۳۵ء

پہلے کی اُردو تحریک مسلم لیگ تحریک کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ مہاتما جی اُردو کے پریمی تھے لیکن اپنی کچھ گول مال باتوں سے انھوں نے اُردو والوں کے من میں شک پیدا کر دیا۔ ۱۹۳۵ء میں اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن میں انھوں نے اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد بنانے کا سجھاؤ دیا جس کا مقصد صوبائی بھاشاؤں اور ان کے ساہتیہ کاروں میں میل جول پیدا کرنا تھا۔ اس پریشد کی بیٹھک ۲۴ اپریل ۳۶ء کو ناگپور میں ہوئی۔ پہلے ہی جلسے میں یہ پرستاؤ رکھا گیا کہ اس سبھا کا کام 'ہندی ہندوستانی' میں ہوگا۔ اس پر مولوی عبدالحق نے سخت اعتراض کیا کہ جب کانگریس نے 'ہندوستانی' کو ملک کی زبان طے کیا ہے تو یہ ہندی ہندوستانی کیا ہے۔ مہاتما جی نہ مانے۔ اسے بدل کر 'ہندی اتھوا ہندوستانی' کرنے پر تیار ہو گئے۔ مولوی عبدالحق نے تجویز کی کہ 'ہندی ہندوستانی' کی بجائے صرف 'ہندوستانی' یا پھر 'ہندی یا اردو' کر دیا جائے۔ ان کی بات نہ مانی گئی اور وہ پریشد چھوڑ کر چل دیے۔ اردو والوں میں مشہور ہے کہ اس موقع پر مہاتما جی نے کہا تھا۔

"اُردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں۔"[1]

یقین نہیں آتا کہ مہاتما جی نے ایسا کہا ہوگا۔ اُردو اور مسلمانوں کا کوئی مخالف بھی اس سے زیادہ کیا کہتا۔ باپو اُردو کے پریمی تھے لیکن جنوری ۱۹۴۲ء میں کسی اُردو والے نے مہاتما جی کو چٹھی لکھی جس میں دوسری باتوں کے سوا یہ بھی لکھا تھا۔

"آپ تو اُردو کو کھلم کھلا فارسی لکھاوٹ میں لکھی جانے والی مسلمانوں کی بھاشا کہہ چکے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر مسلمان چاہیں تو بھلے ہی اس کی حفاظت کریں۔"

مہاتما جی نے یہ چٹھی اور اس کا جواب ۸ فروری ۱۹۴۲ء کے ہریجن سیوک میں چھاپا ہے جہاں انھوں نے چٹھی کی دوسری غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ اوپر دی ہوئی بات کا کاٹ نہیں کیا، اس سے انکار نہیں کیا۔ ۸ جنوری ۱۹۶۰ء کے 'ہماری زبان' میں اس کے ایڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور نے ایک اڈیٹوریل لکھا 'کیا اُردو مسلمانوں کی زبان ہے'، اس میں اوپر لکھی ہوئی بات کو سچ مچ مہاتما گاندھی کی رائے سمجھ کر لکھا۔

"اُردو ہندو مسلم اتحاد کی یادگار اور ہماری مشترک قومی تہذیب کی نشانی ہے۔ اس کی اسس

---

[1] پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اُردو ص ۶۳

حیثیت کو لاکھ کچھ لوگ فراموش کریں یہ حیثیت برقرار رہے گی چاہے بقول گاندھی جی کے قرآن کے حروف میں لکھی جائے، چاہے مسلمانوں کا بیشتر مذہبی اور تہذیبی سرمایہ اس میں موجود ہو ہندوستان کے بیشتر مذاہب کے ماننے والوں کی زبان رہی ہے اور ہے۔"

اس پر مشہور گاندھی وادی ڈاکٹر جعفر حسین نے ۲۲ر اپریل ۱۹۶۰ء کے 'ہماری زبان' میں ایڈیٹر کو چٹھی لکھی جس میں اس بات کو لے کر اپنی اور باپو کی پوری چٹھی پتری دی ہے۔ ڈاکٹر جعفر حسین صاحب کہتے ہیں کہ ہمیشہ یہ بات کھٹکتی تھی کہ مہاتما جی جیسی ہستی ایسی جاہلوں والی اور دل دکھانے والی بات کیسے کہہ سکتی تھی۔ ڈاکٹر جعفر حسین نے ۱۵ر ستمبر ۱۹۴۱ء کو مہاتما جی کو لکھ کر پوچھا کہ آپ کے نام سے یہ بول ان گنت بار نقل کیے جاتے ہیں۔ کیا آپ نے واقعی ایسا کہا تھا اور اب آپ کی کیا رائے ہے۔

مہاتما جی نے ۲۹ر ستمبر ۱۹۴۱ء کو جواب دیا کہ میں نے وہ جملے کبھی نہیں کہے۔ تم وہ کوٹیشن بھیجو جس میں یہ بات مجھ سے جوڑی گئی ہے۔ میں نے تو خود اُردو سیکھی ہے اور مولانا شبلی کی سیرت النبی اور اُردو کی دوسری تحریریں پڑھی ہیں۔

ڈاکٹر جعفر حسین نے کچھ کوٹیشن بھیجے۔ اس کے بعد ایک مرتبہ ان کا مہاتما جی سے ملنا ہوا۔ تو باپو کو بتایا کہ یہ بات آپ نے مولوی عبدالحق کے سامنے ناگپور میں کسی بھرے جلسے میں کہی تھی۔ اس وقت مہاتما جی نے کچھ نہیں کہا لیکن بعد میں ۳ر اپریل ۱۹۴۲ء کو بردولی سے لکھا۔

"میرا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ میرے ریمارک اسی طرح کے ہو سکتے تھے جس طرح کا وہ ایڈریس تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو مولانا صاحب کے اعتراض کو ٹھیک قرار دے۔"

اوپر دی ہوئی ساری چٹھی پتری ۲۲ر اپریل ۱۹۶۰ء کے 'ہماری زبان' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد طے ہو جاتا ہے کہ مہاتما جی نے یہ بات نہیں کہی تھی۔ مولوی عبدالحق کو یا تو سمجھنے میں بھول ہوئی یا انھیں غلط یاد رہ گیا۔

یہ جھوٹ سہی۔ لیکن 'ہندی ہندوستانی' کی بات اُردو والوں کے لیے ایسی ثابت ہوئی جیسے پاگل سانڈ کے لیے لال چیتھڑا۔ مولوی عبدالحق نے اُردو کے لیے ایک زبردست آندولن شروع کیا اور کہا کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد اُردو کو ختم کرنے اور ہندی کو لادنے کی ایک زبردست سازش ہے۔

مہاتما جی نے ۱۶ر مئی ۱۹۳۶ء کے 'ہریجن' میں 'ہندی ہندوستانی' نام کے لیکھ میں لکھا

کہ بھارتیہ ساہتیہ پریشد، ہندی ساہتیہ سمیلن کی پیدا وار ہے۔ ۲۵ برس کی پرانی سنستھا سے میں نام بدلنے کو کہوں تو یہ گستاخی ہوگی۔ اگر کسی کو ہندی نام سے چڑھ ہے تو اُسے جاننا چاہیے کہ 'ہندی' مسلمانوں کا دیا ہوا نام ہے۔

مہاتما جی نے ایک اور[1] لیکھ میں اس بات پر دکھ ظاہر کیا کہ سمیلن نے ہندی کی تعریف میں اُردو لکھاوٹ کو ظاہر کرکے جو بڑا قدم اٹھایا ہے مسلمانوں نے اس کو نہیں سراہا۔

۱۹۳۷ء میں بابو راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق میں ایک سمجھوتہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ اُردو ہندی کے قابل لوگ مل کر ایک ڈکشنری بنائیں۔ ہندی کے لیکھکوں نے جو اُردو شبد اور اُردو کے لیکھکوں نے جو ہندی شبد استعمال کیے ہیں وہ سب اس ڈکشنری میں جمع کیے جائیں اور یہ ہندوستانی بھاشا کا شبد بھنڈار مانا جائے گا۔ مہاتما جی نے اس سمجھوتے کو بہت سراہا لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا کام آگے نہ بڑھا۔ آخر کار ۱۹۳۸ء تک مہاتما جی کا پکا وچار ہوگیا کہ راشٹر بھاشا کا نام صرف ہندوستانی ہو۔ انھوں نے کانگریسیوں کو رائے دی کہ راشٹر بھاشا کا ذکر کرتے وقت وہ اُردو یا ہندی نہ کہہ کر ہندوستانی ہی کہا کریں۔ عجیب بات ہے ۵ر جولائی ۱۹۴۶ء کے ہریجن میں انھوں نے دکھن والوں کو 'ہندی ہندوستانی' سیکھنے کی رائے دی۔

۲ر مئی ۱۹۴۲ء کو مہاتما جی نے واردھا میں ہندوستانی پرچار سبھا بنائی لیکن دو چار مہینے بعد ہی 'بھارت چھوڑو آندولن' کے سلسلے میں پکڑے گئے اور کام رک گیا۔ ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۵ء میں یہ کام پھر سے چالو ہوا۔ مہاتما جی ڈاکٹر تاراچند کی یہ بات مانتے تھے کہ شروع میں اتری بھارت میں ایک بھاشا تھی جسے ہندو مسلمان دونوں بولتے تھے۔ جو ایک تھی وہ دو ہوگئی۔ ہندوستانی پرچار سبھا کا کام ان دونوں کو پھر سے ایک بنانا ہے۔ ۲۷ر فروری ۱۹۴۵ء کو آپ نے مولوی عبدالحق کو واردھا بلایا اور کہا۔

"عبدالحق صاحب نے ناگپور میں جو بات کہی تھی اسے اس وقت میں نہ سمجھ سکا۔" "ہندی یعنی اردو" اسے میں نے مانا نہیں تھا۔ اس وقت ان کی بات مان لیتا تو اچھا ہوتا ..... ناگپور میں بھارتی ساہتیہ سمیلن کیا تھا لیکن وہ وہیں شروع ہوا اور وہیں ختم ہوا۔ ہم لوگ ملنے آئے تھے اور پھر الگ ہوگئے۔ ایسے سمیلن سے کیا فائدہ ہوسکتا تھا وہ ہندوستانی

---

[1] ہریجن سیوک۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۶ء

نہیں بلکہ بھارتی ساہتیہ سمیلن تھا۔"

ہمیں معلوم نہیں کہ ہندی ساہتیہ سمیلن نے ہندی کی اپنی تعریف بدل دی تھی یا کچھ اور بات تھی کہ مہاتما جی نے ساہتیہ سمیلن کی ممبری سے استعفیٰ دینے کی بات سوچی۔ سمیلن کے سبھاپتی پرشوتم داس ٹنڈن اور مہاتما جی کے بیچ چٹھی پتری ہوئی۔ ٹنڈن جی مہاتما جی کے بہت بڑے بھگت تھے لیکن انھوں نے لکھا کہ میں آپ کے وچار سے کہ ہر ایک دیش واسی ہندی اور اردو دونوں سیکھے، اتفاق نہیں کرتا۔ آخر ۱۵ر جولائی ۱۹۴۵ء کو مہاتما جی نے سمیلن چھوڑ دیا۔

جون ۱۹۴۷ء میں جب ملک کے بٹوارے کا فیصلہ ہوگیا تب بھی مہاتما جی اپنی بات پر اٹل رہے۔ اعتراض کیا گیا کہ جب پاکستان ایک حقیقت بن گیا ہے تو ہندوستانی زبان کو ہندی اور اردو لکھاوٹوں میں پھیلانے کی کوشش ریت کی رسی بٹنا ہے اور پاگل پن ہے لیکن مہاتما جی اپنے وشواس پر قائم رہے۔ جب انھیں بتایا گیا کہ قومی زبان ہندی ہوگی جو دیوناگری میں لکھی جائے گی تو انھوں نے کہا کہ میں اس پر کبھی رضامند نہیں ہو سکتا۔

ہریجن ۲ر اگست ۱۹۴۷ء

۱۵ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی ڈائری میں لکھتے ہیں

"میں نے اخباروں میں ایک پیراگراف دیکھا ہے کہ آیندہ سے یو۔پی کی سرکاری زبان ہندی، دیوناگری لپی کے ساتھ ہوگی۔ اس سے مجھے دکھ ہوا۔ ہندو مسلمان میں برابر کے سلوک کا تقاضا یہ ہے کہ اردو لپی کو بھی باقی رکھا جائے۔ ایک ایسا ملک نہ بنانا چاہیے جہاں مسلمانوں کے لیے عزت کی زندگی ناممکن ہو جائے۔"

۱۸ر اکتوبر کو لکھتے ہیں۔

"ہماری قوم پرستی اگر دونوں لپیوں کے سیکھنے سے گھبراتی ہے تو وہ بہت گھٹیا قسم کی قوم پرستی ہے۔"

بھاشا کے بارے میں ان کے آخری بول ۱۸ر دسمبر ۱۹۴۷ء کو ملتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"کیا اردو اور ہندی کو ملا کر ایک زبان بنانے کی کوشش کر کے میں کمتر درجے کا ہندو یا ہندوستانی ہو گیا۔ کیا وہ ایک اکھل بھارتی بھاشا کی سیوا کر سکتے ہیں۔ اگر اردو لپی اور بھاشا کو اس سے نکال دیا جائے۔ میں ہمیشہ تو تمھارے پاس رہوں گا نہیں، مگر تم میرے رخصت ہو جانے

کے بعد میرے شبدوں کو یاد کروگے۔"

اور اگلے مہینے ہی وہ رخصت ہو گئے۔ انھیں کے ساتھ ہندوستانی بھی مرگئی۔ یہ مانا کہ آج بھاشا کی گتھی بہت الجھ گئی ہے اور اُردو،ہندی' ہندوستانی کا سوال نہیں رہا۔ اب ہندی اور تامل، ہندی اور بنگالی، ہندی اور انگریزی کا سوال ہے۔ پھر بھی ملک کی عام آپسی بول چال کی بھاشا کے بارے میں سوچا جائے تو باپو کے وچار آج بھی سولہ آنے کھرے دکھائی دیتے ہیں۔ یو پی۔ بمبئی۔ آندھرا اور کشمیر وغیرہ کے بازاروں میں جس بھاشا سے ہم اپنا کام چلاتے ہیں اُسے ہندی کہنا بھی جھوٹ ہے اور اُردو کہنا بھی غلط۔ وہ ہندوستانی ہے۔ بھاشا شاستر کے قاعدے سے اُردو ہندی کی تقسیم بالکل جھوٹی اور بے بنیاد ہے۔ بول چال کی بھاشا ایک' اور ساہتیہ کی بھاشائیں دو۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی طرح انھیں سمو کر ایک کر دیا جائے۔

آج ہمارے دیش کی بھاشائی گتھی سلجھانے کے لیے باپو کی کتنی ضرورت ہے۔

بھوپالی اُردو

زبان اور بولی کی تعین میں بڑی مشکل ہوتی ہے۔ بالخصوص اُردو جیسی زبان کے معاملے میں جسے اہلِ لسانیات کھڑی بولی کا ایک روپ اور ہندی کو دوسرا روپ مانتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُردو ہی نے کھڑی بولی کو سنوارا اور نکھارا۔ اس نے استواری کے ساتھ اپنا دامن کھڑی بولی سے وابستہ رکھا لیکن ہندی نے ہرجائی پن کے ساتھ ہر طرف دام ڈالا۔ چنانچہ آج وہ بہاری سے لے کر راجستھانی تک کو اپنے کنبے میں شمول کی داعی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ اُردو میں بولیاں ہیں کہ نہیں۔ بولیاں نہ بھی ہوں تو ذیلی بولیاں ضرور ہیں اور یہ ذیلی بولیاں مختلف مقامات کی اُردو کے علاقائی روپ ہیں۔

معیاری زبان کسی زبان کی بولیوں میں سب سے اہم بولی ہوتی ہے۔ اس کا نام معیاری زبان کی بجائے معیاری بولی ہوتا تو صحت کا حق زیادہ ادا ہوتا۔ معیاری زبان کی ایک شرارت یہ ہے کہ یہ بولیوں کے علاقے میں بھی شہروں یا کم از کم پڑھے لکھوں کی مجلس سے بولی کو باہر دھکیل کر خود اس کی جگہ لے لیتی ہے لیکن اسے اس قبضۂ مخالفانہ کی کچھ قیمت دینی ہوتی ہے جو یہ ہے کہ اسے متعلقہ بولی سے اثر قبول کرنا ہوتا ہے۔ اسی متاثر روپ کو ہم پنجابی اُردو، بمبیا اردو کہتے ہیں۔

کھڑی بولی یا ہندوستانی یا اُردو نے اسی طرح مختلف شہروں میں اپنا ڈیرا جما لیا ہے۔ ان میں سے کچھ زیادہ اہم ہیں اور ان میں سے ایک بھوپال ہے۔ یہاں کی علاقائی زبان کو ہم اُردو کی بھوپالی ذیلی بولی یا اختصار کے ساتھ بھوپالی اُردو کہہ سکتے ہیں۔ یہ پاس پڑوس کے قصبوں مثلاً سیہور، آشٹہ، رائے سین، بیگم گنج وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ بھوپال مالوے کا جزو ہے گو بندیل کھنڈ کے ڈانڈے کو بھی چھوتا ہے۔ مالوے کا مرکزی حصّہ بکرماجیت کے اجین، راجہ بھوج کے دھار، باز بہادر کے مانڈو اور اہلیہ بائی کے اندور پر مشتمل ہے لیکن روایت کے مطابق بھوپال

بھی دھار والے راجہ بھوج کا بسایا ہوا بھوج پال ہے۔

اس علاقے کی بولی مالوی ہے جو راجستھانی کی ایک ذیلی بولی ہے۔ یہاں کے ہندو سیٹھوں کی پگڑی اور ان کی عورتوں کا لباس بھوپال اور راجستھان کی مماثلت کے شاہد ہیں۔ یہ وسیع علاقہ اُردو کا نہیں جس طرح ریگستان کے بیچ نخلستان ہوتا ہے اسی طرح مالوی کے سمندر میں بھوپال اور چند دوسرے قصبے اُردو کے جزیرے ہیں۔ شہر سے قصبات اور قصبات سے دیہات کی طرف کو جائیے، بتدریج اُردو کا اثر کم اور مالوی کا اثر زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ بھوپال میں بھی نچلے طبقے کے ہندو مثلاً دودھ والے، کہار (بھوئی) وغیرہ اُردو پر مالوی کی تہہ چڑھا کر بولتے ہیں۔

بھوپال بمبئی کی نسبت دتی سے قریب تر ہے لیکن تہذیبی اور تجارتی تعلقات بمبئی سے زیادہ ہیں اس لیے بھوپال کی زبان کسی قدر بمبیا اردو سے بھی متاثر ہے۔ یعنی بھوپال کی زبان وہ اُردو ہے جس پر تھوڑا تھوڑا مالوی، بندیلی اور بمبئی کی ہندوستانی کا اثر ہے۔ اہلِ بھوپال کو اس کا شعور نہ ہوگا لیکن یوپی سے آنے والوں کو معیاری اُردو سے اختلافات بادی النظر ہی میں دکھائی دے جاتے ہیں۔ انھیں اختلافات کا نام بھوپالی اُردو ہے۔ ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:

صوتی

۱۔ یائے لین کو یائے مجہول بولنا مثلاً ضمیر متکلم 'مَیں' اور 'پیسہ' کو فتح اوّل کی بجائے کسرۂ اوّل سے ادا کرنا جس سے ضمیر 'مِیں' کی آواز حرفِ جار 'مِیں' (اندر) جیسی ہو جاتی ہے۔ یہ نزلہ انگریزی الفاظ پر بھی پڑتا ہے مثلاً وَیسٹ (West) بمعنی مغرب کو Waste بمعنی برباد کرنا کے ہم آواز کر دیتے ہیں۔

۲۔ واؤ لین کو واؤ مجہول بنا دینا مثلاً سَو (بمعنی صد) کو فتحۂ اوّل کی بجائے پیش سے سُو بولتے ہیں۔ حرفِ عطف اَور کو پیش کے ساتھ اُور بولتے ہیں جس سے یہ ہندی لفظ بمعنی طرف کا ہم آواز ہو جاتا ہے۔

۳ کہا، رہا کی وسطی ہ کو ی سے بدل کر فتحۂ اوّل کی جگہ کسرۂ اول سے بولتے ہیں یعنی کِیا، رِیا (یائے معروف کے ساتھ) دلی کی کرخنداری اردو اور مغربی یوپی کی بولی میں بھی ان الفاظ کو مسخ کرتے وقت ہ کی جگہ ی رکھ دی جاتی ہے لیکن وہاں یہ ماقبل مفتوح ہوتی ہے جب کہ بھوپال میں ماقبل مکسور۔

۴۔ مضمتوں پر ختم ہونے والے بعض الفاظ کے آخر میں الفِ زائد کا اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً بیجا (بیج)، پیڑا (پیڑ)، دوبا (دوب)؛ آخری 'آ' کا رجحان یہاں تک ہے کہ باسی کو باسا کہتے ہیں۔

۵۔ چند دوسرے الفاظ کا مخصوص بھوپالی تلفظ ملاحظہ ہو۔

شعر میں ہمارے تلفظ میں ع یائے مجہول کی آواز دیتی ہے یعنی ہم اسے شیر (بمعنی ضیغم) کا ہم آواز کر دیتے ہیں لیکن بھوپال میں اسے یائے لین سے بہ قافیۂ خیر بولتے ہیں۔ بھوپال کے شاعر اظہر سعید خاں کا مصرع ہے ع بھلا یہ شعر تمہیں کیوں پسند آئیں گے۔ وہ اس مصرع کو پڑھتے وقت شعر کو شَیر (بہ قافیۂ خیر) ادا کرتے ہیں۔

اسی طرح محلّہ میں م پر پیش ہے لیکن بھوپال میں م اور ح دونوں کو فتحتین سے اس طرح بولتے ہیں کہ محلّہ کے ابتدائی تین حرفوں کی آواز لفظ 'محل' جیسی ہو جاتی ہے۔ پٹھا بمعنی دفتی یا گتّا کو یہاں زبر کی بجائے ضمۂ اوّل سے پٹّھا بولتے ہیں۔ پتھر کو دکنی انداز سے پھتّر کہتے ہیں۔

نحوی

یہاں تعظیمی ضمیر حاضر 'آپ' کے ساتھ فعل کے وہ صیغے استعمال کرتے ہیں جو 'تم' کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ مثلاً

آپ ایسا کرو — بجائے — آپ ایسا کیجیے۔
آپ تو کھانا کھاؤ — بجائے — آپ تو کھانا کھائیے۔

معنوی

اسے ہم تین شقوں میں دیکھیں گے۔

(الف) کچھ مقامی الفاظ ایسے ہیں جو مقامی اُردو میں بھی پائے جاتے ہیں لیکن بھوپال میں ان کے معنی قدرے مختلف ہیں مثلاً

بائی ۔ معیاری اردو میں 'بائی جی' محض طوائفوں کے لیے مخصوص ہے لیکن یہاں محض عورت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ کسی بھی عورت کو بائی یا بائی جی کہہ کر خطاب کر سکتے ہیں۔

بھوپال میں اس لفظ کی کثرتِ استعمال مہاراشٹر کا اثر ہے۔

بوا بھوپال میں خادمہ کے معنی میں آتا ہے۔ مسلمان ملازماؤں کو بوا کہا جاتا ہے۔ یو پی میں ہندوؤں میں یہ لفظ باپ کی بہن کے لیے استعمال ہوتا ہے اور مسلمان خواتین برابر والیوں کو بوا کہہ کر خطاب کرتی ہیں مثلاً

کارخانے میں ہے قدرت کے کسے دخل بوا بچہ تم پہلے جنیں، بیاہ ہوا میرے بعد

(جان صاحب)

دادا ۔ معیاری اُردو میں باپ کے باپ کے لیے مخصوص ہے۔ بنگال میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں۔ بمبئی میں اس لفظ کے معنی اس طرح زوال پذیر ہوئے کہ غنڈے بدمعاش کو کہتے ہیں۔ بھوپال میں کسی بھی بڑے کو کہہ سکتے ہیں، خواہ وہ عمر کے لحاظ سے بڑا ہو یا رتبے کے لحاظ سے۔

کھیرا اور ککڑی شمالی ہند میں جسے کھیرا کہتے ہیں اُسے بھوپال میں ککڑی اور جسے شمال میں ککڑی کہتے ہیں اُسے یہاں کھیرا بولتے ہیں۔ بھوپال کے کھیرے (مقامی زبان میں ککڑی) لوکی کی طرح بڑی جسامت کے ہوتے ہیں اور اس کے باوجود کچے اور نرم رہتے ہیں۔ لکھنؤ کی پھل والیاں ککڑی کی توصیف میں ہانک لگاتی تھیں۔

'لیلیٰ کی انگلیاں ہیں، مجنوں کی پسلیاں ہیں، کیا خوب ککڑیاں ہیں'

وہ بھوپال کی فربہ ککڑیوں (یعنی ہماری زبان میں کھیروں) کا ڈیل ڈول دیکھیں تو سر پیٹ لیں یا غش کر جائیں۔

پپیتے کو یہاں 'ارنڈ ککڑی' کہتے ہیں۔ اگلے زمانے میں یو پی میں اسے 'ارنڈ خربوزہ' کہا جاتا تھا۔

خاں ۔ نون غنہ کے ساتھ اُردو میں تنہا استعمال نہیں ہوتا۔ خاں صاحب کہتے ہیں یا نونِ اعلان کے ساتھ سرحد کے پٹھانوں کو 'خان' کہہ کر پکار لیتے ہیں۔ بھوپال چوں کہ پٹھانوں کی بستی ہے اس لیے یہاں نون غنہ کے ساتھ 'خاں'، 'ارے خاں'، اور 'دیکھو خاں'، (عجلت میں 'کوں خاں')، کہہ کر خطاب کرنے کا عام دستور ہے۔ اس میں پٹھان کی کوئی تخصیص نہیں۔ ہندو کو بھی 'ارے خاں'، کہہ کر خطاب کیا جا سکتا ہے۔

کاری گر ۔ یہاں معمار کے معنی میں مخصوص ہے۔ اس کے 'سہال'، کو بھوپال میں گولہ کہتے ہیں۔

مال۔ سیمنٹ ریت کے ملا کر بنائے ہوئے گیلے مسالے کو کہتے ہیں۔
کچرا۔ بمعنی کوڑا۔ اس معنی میں یہ لفظ مہاراشٹر میں بھی بولا جاتا ہے۔
قند۔ بمعنی چینی۔ مانا کر فارسی میں اس لفظ کے معنی شکر ہیں لیکن بھوپال میں کارخانے کی دانے دار چینی کو قند کہا جاتا ہے۔
جھاڑ۔ معیاری اُردو میں جھاڑی کا مکبّر ہے یعنی کانٹے دار یا بدنما یا سوکھی جھاڑی۔ بھوپال میں کسی بھی پودے کو کہتے ہیں مثلاً چمیلی کا جھاڑ۔
مٹکا۔ معیاری اُردو میں مٹکا اتنے بڑے گھڑے کو کہتے ہیں جس میں آدمی گھس کر بیٹھ سکتا ہے لیکن بھوپال میں ہر گھڑے کو مٹکا کہتے ہیں خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔
عمدہ۔ یہ لفظ یہاں مخصوص انداز سے 'بہت اچھے' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً

الف ۔ "یہاں کیسے بیٹھے ہو؟"
ب ۔ "عمدہ بیٹھے ہیں"

یا

الف ۔ "ٹیکسی تو ملی نہیں تانگہ لے آیا ہوں"
ب ۔ "عمدہ"

کنے۔ (پاس) مثلاً اُس کنے یا اُس کے کنے۔ قدیم اُردو میں یہ لفظ عام تھا۔ اب بھوپال کے علاوہ رام پور میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اتفاق سے دونوں پٹھانوں کی بستیاں ہیں۔
بتانا۔ معیاری اُردو میں اس کے جو معنی ہیں بھوپال میں اس معنی میں تو استعمال ہوتا ہی ہے اس کے علاوہ یہاں "دکھانا" کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے مثلاً

'فوٹو ذرا مجھے تو بتاؤ'

اس معنی میں یہ لفظ بھوپال سے بمبئی تک مستعمل ہے۔
چلے گا۔ بمعنی "کام میں آئے گا" "راس آجائے گا" مثلاً

الف ۔ "امرود ضرور کچا ہے"
ب ۔ "چلے گا" (یعنی کوئی مضائقہ نہیں اسی کو کھائیں گے۔)
الف ۔ "دیکھیے یہ مکان کرایے پر مل سکتا ہے لیکن بہت چھوٹا ہے"
ب ۔ "سب چلے گا" (یعنی اسی پر اکتفا کریں گے)

یہ بھی بمبئی کا محاورہ ہے جو بھوپال نے مستعار لیا ہے اور اب تو شمالی ہند کی طرف بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

پٹکنا۔ معیاری اُردو میں کسی چیز کو اوپر سے اٹھا کر زور سے زمین پر دے مارنے کو کہتے ہیں۔ بھوپال میں محض 'رکھنے' کو کہتے ہیں۔ شدت یا تشدد کا کوئی شائبہ نہیں مثلاً "دیگچی چولھے پر پٹک دو" کے معنی ہیں دیگچی چولھے پر رکھ دو۔

مچانا۔ سیمنٹ کے مسالے یا گارے کو بھگو کر معمار کے استعمال کے لیے تیار کرنا مثلاً "مال مچالو" یعنی سیمنٹ اور ریت کو پانی میں ملا کر مسالہ بنالو۔ معیاری اُردو میں شور اور اس کے ہم معنی الفاظ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے مثلاً شور مچانا، غل مچانا، ہُلڑ مچانا۔

دودھ کھانا۔ یہاں دودھ کے لیے پینے کے علاوہ کھانا بھی بولا جاتا ہے مثلاً "بابو جی میرا دودھ بہت گاڑھا ہے۔ ایک دن کھا کر دیکھیے۔"

(ب) کچھ مقامی الفاظ ایسے ہیں جو ہیئت اور معنی دونوں کے لحاظ سے معیاری اُردو کے الفاظ سے کافی ملتے ہیں لیکن کسی قدر مختلف بھی ہیں مثلاً

ممیا۔ عوام میں ایک تعظیمی خطابیہ لفظ ہے جو ظاہر ہے ماما یعنی ماموں سے بنا ہے

پٹیا۔ (فرش لگانے کے پتھر کے تختے) نفری۔ (ایک آدمی کا ایک دن کا کام یعنی (man-day) چنیٹی (چونہ دانی)۔ سوجا۔ (سُوا یعنی بڑی سوئی جس سے بوری سیتے ہیں) ٹلواتی۔ (چھوٹی مولی) بھٹا (بینگن) چھٹا یا چھٹے۔ (ریزگاری) کھلّے (ریزگاری)

(ج) کچھ مقامی الفاظ ایسے ہیں جو معیاری اُردو میں بالکل نہیں ملتے مثلاً

بیا۔ یہ بائی کا مصغر ہے اور لڑکی کے معنی دیتا ہے۔ لڑکی کو بیا کہہ کر خطاب بھی کر سکتے ہیں۔ نواب حمید اللہ خاں مرحوم کی دو صاحبزادیاں چھوٹی بیا اور بڑی بیا کے لقب سے مشہور تھیں۔

بندھانی (مرد مزدور)۔ ریزہ (عورت یا لڑکا مزدور جن کی مزدوری کم ہوتی ہے)، دہاڑی (ایک دن کی مزدوری)۔ یہ لفظ پنجابی سے لیا معلوم ہوتا ہے۔ پگار۔ (تنخواہ) یہ لفظ مراٹھی سے آیا ہوگا۔ پٹیل۔ (گاؤں والوں کے لیے تعظیمی خطابیہ لفظ جیسے شمالی ہند میں چودھری کہتے ہیں) بھوپال سے لے کر گجرات تک گاؤں کے مکھیا یا پردھان کو پٹیل کہتے ہیں۔ بھوپال میں لفظ گجراتی سے مستعار ہونا چاہیے۔ ڈوکرا (بوڑھا) ابتدائی اُردو میں جو صوفیائے کرام کے کچھ فقرے ملتے ہیں ان میں کسی بزرگ کی زبانی 'بڑھ ڈوکرے' کہا گیا ہے۔ انھوں نے کسی لڑکے کو مزاحاً یا دُعا کے طور پر بوڑھا کہا تھا۔

ڈوکری یا ڈکریا (بُڑھیا)۔ کمکیما (خالہ)۔ برونی (ملازمہ) خاص طور سے برتن مانجھنے والی)۔ بھوئی۔ (کہار)۔

بٹلا (مٹر)۔ گنڑیری (لوکی)۔ گلگی (توری۔ روسے کی پھلی (لوبیے کی پھلی) یہی (امرود) اس کی جمع یہیں یا بٹیں آتی ہے۔ تور یا توہر (ارہر) راج گیرا (چولائی جس کے لڈو بنتے ہیں) پیپی (گیہوں) وہاں اس کی دو قسمیں مشہور ہیں دیسی پیی یعنی سفید رنگ کا گیہوں جو گھٹیا ہوتا ہے اور شربتی پیی جو ہلکے سرخ رنگ کا اور بڑھیا ہوتا ہے۔ ہبی (چھاچھ)

بھجریے (نورتے یعنی جَو کے چھوٹے پودے) شمالی ہند میں دسہرے کی رسم میں بہنیں بھائیوں کے کانوں پر رکھتی ہیں۔ بھوپال میں برسات میں کسی تقریب میں کام آتے ہیں۔

گُٹکا (سونف الائچی کی طرح تواضع کا ایک خوش رنگ بنایا ہوا دانہ)۔ ہندی میں گُٹکا جادو کی شے کو کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو رانی کیتکی کی کہانی میں یا پھر چھوٹی کتاب کو بھی کہتے ہیں۔

چلر (ریزگاری) غلنا (پتھر کا ٹکڑا جو پھینک کر مارا جائے)۔

کویلو ۔ک مفتوح۔ یائے مجہول اور آخری واؤ معروف کے ساتھ (کھپریل)

پھدی (بیڈ منٹن کھیلنے کی پروں کی چڑیا)۔ پنجابی میں اس کے معنی شرم گاہ کے ہیں۔

سدیں۔ یائے مجہول کے ساتھ (تڑکے)

ہیٹنا۔ یائے معروف سے (دیکھنا)

(د) محاوروں میں صرف تین یاد آتے ہیں۔

پٹیوں پر آجانا یعنی کنگال ہو کر اپنی اوقات پر آجانا۔ اس کی اصل یہ ہے کہ بھوپال میں مکانوں کے باہر دو پتھر رکھ کر ان کے اوپر پتھر کا بڑا سا ٹکڑا رکھ دیتے ہیں جو ایک قسم کی عوامی بینچ کا کام کرتا ہے۔ اس پر بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے ہیں۔ صوفے اور کرسی سے گر کر پٹیوں پر بیٹھنا فلاکت کی نشانی ہے۔

جنت کی چڑیاں۔ (ہیجڑے)

بروکاٹ بھوپالی۔ برو میں واؤ معروف ہے۔ بھوپال میں اس لفظ کے معنی سرکنڈہ ہیں جس کے قلم بنائے جاتے ہیں۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں بھوپال علاقے میں بیہڑ کا عالم تھا۔ جگہ جگہ سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ شروع شروع میں جو پٹھان یہاں آکر آباد ہوئے انھوں نے سرکنڈوں کو کاٹ کر زمین صاف کی۔ ان نوآبادیاتی مقتداؤں کو بروکاٹ بھوپالی

کہتے ہیں۔ یعنی وہ قدیم بھوپالی جس کے اجداد نے یہ بستی بسائی تھی۔

بھوپال نے اُردو کو مشہور مزاح نگار ادیب مُلّا رموزی دیا۔ انھوں نے گلابی اُردو تو بہت لکھی لیکن بھوپالی روزمرہ کو مزاح کا موضوع نہ بنایا۔ اس کے لیے کسی انشا کی ضرورت نہ تھی جو بھوپالی میر غفر غینی کی زبانی یہاں کے عوامی روزمرہ کا لطف پیش کرتا۔ حیدرآبادی اُردو کی ظریفانہ تخلیقات پڑھنے میں آتی ہیں۔ بھوپالی اُردو میں بھی اسی ڈھنگ کی چیزیں ممکن ہیں اور میں نے ایک آدھ سُنی بھی ہیں۔ کاش کوئی فرزندِ بھوپال اپنی بولی پر آپ ہی ہنسنے کا سامان فراہم کر سکے۔

ڈاکٹر زور کی لسانی خدمات

ڈاکٹر زورؔ ماہر لسانیات، نقاد، محقق، مورخ، سوانح نگار، مرتب، مدیر سبھی کچھ تھے۔ اور ان کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ ان کی جولانیاں محض صفحۂ قرطاس تک محدود نہ تھیں۔ وہ میدان عمل کے بھی شہسوار تھے۔ ان کی ذات ہزار شیوہ ایک ادارہ تھی جس نے بہت سے ادارے بنائے۔

ایک بار میں نے بھوپال کے اسٹیشن پر ڈاکٹر زورؔ سے پوچھا کہ آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کس کتاب پر ملی تھی انھوں نے کہا کہ ہندوستانی صوتیات اور اردو شہ پارے پر۔ چوں کہ ڈاکٹر زور کو پی' ایچ ڈی کی ڈگری ۱۹۲۹ء میں مل چکی تھی اور یہ کتابیں اس کے بعد مرتب ہوئیں اس سے ظاہر ہے کہ ان کا تحقیقی مقالہ ان کتابوں کے نقش اوّل کا مرقع ہوگا۔

میں اکثر کہا کرتا ہوں کہ لسانیات کے باب میں اردو ہندی سے ۲۵ سال پیچھے ہے یعنی آزادی کے بعد اردو کی دکانِ لسانیات میں جو متاعِ فخر دکھائی دیتی ہے وہ ہندی میں کم از کم ۲۵ سال پہلے وجود میں آچکی تھی۔ لیکن ڈاکٹر زورؔ نے صوتیات پر جس وقت کام کیا اس وقت تک ہندی کے موجودہ علماء میں سے کسی نے لسانیات پر ایک مضمون بھی نہ لکھا تھا۔ بابو شیام سُندر داس کی بھاشا وگیان ۱۹۲۸ء تک ہندی لسانیات کی کل کائنات تھی۔ ڈاکٹر زورؔ لسانیات کی دنیا میں بڑی گھن گرج سے آئے۔ وہ نہ صرف اردو میں بلکہ ہندوستان کی جملہ زبانوں میں علم زبان کے قافلہ سالاروں میں سے ہیں۔ لیکن افسوس صد افسوس انھوں نے اپنے شوق کو جاری نہ رکھا۔ ۱۹۲۹ء میں لندن سے پی، ایچ ڈی کرنے کے بعد وہ ڈی۔ لٹ کے لیے پیرس پہنچے اور پروفیسر جیولز بلاک کی رہنمائی میں گجراتی فارم آف ہندوستانی پر مقالہ لکھنا شروع کیا لیکن اسے پورا نہ کیا۔ اگر مرحوم لسانیات سے دلچسپی لیتے رہتے تو ملک کے بڑے ماہرین لسانیات میں شمار کیے جاتے۔ لسانیات کے سلسلے میں ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ Hindustani Phonetics. ۱۶ صفحات کا یہ انگریزی کتابچہ ۱۹۳۰ء میں

پریس سے شایع ہوا۔

۲۔ ہندوستانی لسانیات ۱۹۳۲ء

ان کے علاوہ دو مضامین میری نظر سے گزرے "اُردو اور پنجابی" یہ مضمون نقوش لاہور میں غالباً پہلی بار ۱۹۵۳ء میں شایع ہوا۔ دوبارہ یہی نقوش کے ادبِ عالیہ نمبر بابت اپریل ۱۹۶۰ء میں شامل کیا گیا۔

۲۔ 'اردو کی ابتدا' یہ مضمون دلی یونیورسٹی کے رسالے "اردوئے معلّٰی" کے لسانیات نمبر جلد سوم شمارہ ۴-۵ بابت ۱۹۶۲ء میں شایع ہوا۔

ان کی کتاب ہندوستانی لسانیات اور ان کے اُردو مضامین سے قارئین اُردو متعارف ہیں۔ ان تحریروں میں اُردو کی ابتدا سے متعلق جو نظریہ پیش کیا گیا ہے، اس سے اختلاف بھی کیا گیا ہے لیکن لسانیات میں ان کا اصل کارنامہ ہندوستانی فونیٹکس ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس کا اُردو ترجمہ نہیں کیا گیا جس کی وجہ سے اُردو دنیا اس کے نام سے بھی روشناس نہیں حالانکہ ڈاکٹر زورؔ کو لسانیات کی تاریخ میں کوئی مقام دیا جائے گا تو اسی کی بدولت۔

ڈاکٹر زورؔ کی لسانی تحقیقات پر تیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس دوران میں لسانیات، بالخصوص صوتیات کا علم زمین سے آسمان تک پہنچ چکا ہے۔ آج ہمیں ڈاکٹر زور کی تحریروں میں سقم نظر آتے ہیں لیکن ۱۹۳۰ء میں یہی باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ ذیل میں ان کے کارناموں کا سرسری تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستانی فونیٹکس (انگریزی میں)۔ اُردو دنیا ڈاکٹر زورؔ کو تاریخی و تقابلی لسانیات کے ماہر کی حیثیت سے جانتی ہے لیکن ان کا زیادہ اہم کام صوتیات کے ضمن میں ہے۔ لندن اور پیرس کی تجربہ گاہوں میں ڈاکٹر زورؔ نے آوازوں کا جو تجزیہ کیا، ہندوستانی صوتیات اسی کا نتیجہ ہے۔ اس میں علمِ زبان کے وہ موتی بکھرے ہیں کہ جب بھی اس کی سیر کی جائے کوئی نہ کوئی گوہرِ غلطاں ہاتھ آہی جاتا ہے۔

تمہیدی باب میں مصنف نے اُردو کے آغاز کے بارے میں اپنا مشہور نظریہ پیش کیا ہے کہ بارھویں صدی سے قبل صوبۂ سرحد سے الٰہ آباد تک ایک زبان بولی جاتی تھی۔ بارھویں صدی کے بعد زبانوں کا اختلاف شروع ہوا۔ پنجاب میں پنجابی بن گئی یوپی میں کھڑی بولی۔ اُردو نہ پنجابی سے مشتق ہے نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس نے ان دونوں کے مشترک ماخذ سے تشکیل پائی ہے۔ میں اس

نظریے کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کیوں کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری اسے اچھی طرح پرکھ چکے ہیں۔ اس باب کے دوسرے جزو میں زور صاحب نے شمالی اور دکنی اردو کے اختلافات بڑی وضاحت اور تفصیل سے پیش کیے۔ اس سے پہلے کسی نے دکن کی خصوصیات کے بارے میں شاید ہی لکھا ہو۔ زور صاحب نے دانائے راز کی جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انھوں نے پہلے صوتیاتی اختلافات کی شرح کی ہے بعد میں صرف و نحو کی۔ یہ سب ڈاکٹر زور کے اپنے مشاہدے اور غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ آیندہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لیے ان کی یہ تحریر مشعلِ راہ ہے۔

دوسرے اور تیسرے باب میں اردو کی اصوات میں ایک ایک کو لے کر اس کا تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے اردو میں ۹ مصوتے اور ۶ جڑواں مصوتے (Diphthong) قرار دیے ہیں جس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ مصمتوں میں انھوں نے نھ۔ لھ۔ رھ۔ ڑھ۔ دھ۔ زھ کو بھی شامل کیا ہے۔ حالاں کہ ان سے پہلے یا ان کے بعد کسی اردو یا ہندی عالم نے ان آوازوں کو مفرد تسلیم نہیں کیا لیکن ہندی ڇ کو اردو مصمتوں میں جگہ دے کر انھوں نے حقیقت نگری کا ثبوت دیا ہے۔ پھر مختلف ماحولوں میں اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی شرح کی ہے۔ مزید وضاحت کے لیے کم از کم ہر آواز کا ایک (Palatograme) دیا ہے (پیلیٹوگرام تالو کے اس نقشے کو کہتے ہیں جس سے یہ واضح ہو سکے کہ کسی خاص آواز کو ادا کرتے وقت زبان تالو کے کس حصّے کو چھوتی ہے) اس کے علاوہ بعض آوازوں کے نازک اختلافات کو کائموگراف سے بنی ہوئی لکیر کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے۔ اردو کی ایک ایک آواز کو لے کر اس کا تجزیہ پیش کرنا ڈاکٹر زور کا ایسا کارنامہ ہے جس کی نظیر تا حال اردو اور ہندی کی کسی کتاب میں نہیں ملی۔ گو لوگ بہاری دُھل کی ہندی کتاب 'دھونی وگیان' میں انگریزی آوازوں کا اسی طرح تجزیہ کیا گیا ہے، ہندی آوازوں کا نہیں۔ اس میں پیلیٹوگرام دیے ہیں لیکن کائموگراف کے چارٹ نہیں دیے۔

مصمتوں کے تجزیے میں ڈاکٹر زور نے کس باریک بینی اور عمقِ نظر کا ثبوت دیا ہے وہ چند مثالوں سے واضح ہوگا۔

۱۔ لفظ کے آخری (ب) کے بعد ہم عموماً ایک نہایت خفیف مصوتہ بھی بولتے ہیں۔ ثبوت میں دو الفاظ 'تب' اور 'ڈھب' کا کائموگرافی خط درج کیا ہے جس میں ب کے بعد ایک خفیف مصوتہ صاف دکھائی دیتا ہے۔

٢۔ لفظ کا ابتدائی (ت)، درمیانی یا آخری (ت) کی نسبت زیادہ وضاحت سے ادا ہوتا ہے۔
٣۔ درمیانی (تھ) اور (دھ)، میں ابتدائی (تھ)، اور (دھ) کی نسبت تنفیس یعنی ھکاریت کم ہوتی ہے۔
٤۔ درمیانی (ٹ) ابتدائی (ٹ)، کی نسبت شدت سے ادا ہوتی ہے۔
٥۔ لفظ کے درمیان (ٹھ) کے بعد کوئی غیر مصمتی اسپھوٹ آئے تو (ٹھ)، (ٹ) کی آواز دیتا ہے مثلاً بیٹھنا اور کٹھ پتلی میں۔
٦۔ لفظ کا آخری (چ) نہایت خفیف ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ یہ پا در ہوا دعویٰ نہیں۔ ان سب کو پیلیٹوگراف یا کائموگراف کے نقشوں سے ثابت کیا گیا ہے۔

آوازوں کے تجزیے کے بعد ڈاکٹر زور نے مرکب الفاظ کی ان آوازوں کی تفصیل درج کی ہے جو متعاقب آواز کے اثر سے کسی حد تک بدل جاتی ہیں مثلاً "چپ بیٹھو" میں (پ) کی آواز (ب) سے مشابہ ہو جاتی ہے۔ 'کتبہ' میں (ت) کی آواز (د) جیسی۔ 'پیچ دار' میں (چ) کی آواز (ج) کے مانند، اور 'بات چیت' میں (ت) کی آواز (چ) سے مماثل ہو جاتی ہے۔ اصولوں اور مثالوں کی کثرت ان کے مشاہدے کی وسعت اور ہمہ گیری کی غماز ہے۔

چوتھے باب میں بَل اور سُر لہر سے بحث کی ہے۔ ان موضوعات پر لکھتے ہوئے آج بھی قلم کو لرزش ہوتی ہے۔ ڈاکٹر زور نے اُردو زبان میں بَل اور سُر لہر کی تعیین جس وقت کی اس وقت تک کسی ماہر لسانیات نے اُردو یا ہندی کے اس پہلو پر ایک مضمون بھی نہ لکھا تھا۔ اپنے زمانے کے لحاظ سے ڈاکٹر زور کے اصول غنیمت ہیں۔ انھوں نے دو رکنی اور سہ رکنی الفاظ کے بَل کو بڑی حد تک صحیح طور پر گرفت کر لیا۔ چنانچہ ان سے ٢٤ سال بعد لکھتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اپنے انگریزی کتابچے میں ان کی تائید کی۔ زور صاحب کے اصولوں سے کہیں کہیں اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ان میں ترقی کی بھی گنجائش ہے جیسا کہ راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون میں کیا لیکن ١٩٢٧ء ١٩٢٨ء کا زمانہ دیکھتے ہوئے ڈاکٹر زور کے اجتہاد کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اس باب کے دوسرے جزو میں اُردو کلام کی سُر لہر کی تشریح ہے اس موضوع پر ابھی تک کوئی دوسرا کام سامنے نہیں آیا۔

غرضکہ یہ رسالہ کوزے میں دریا سما دینے کی اچھی مثال ہے۔ اس میں محض اصول و نکات ہیں۔ حشویات یا اطناب کا نام نہیں۔ آج اُردو صوتیات کے کسی بھی مسئلے پر لکھنا ہو، ہندوستانی فونیٹکس کی ورق گردانی ناگزیر ہے کیوں کر جویائے علم کے لیے یہ رسالہ

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم   کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

کی مثال ہے۔

"ہندوستانی لسانیات" میں ڈاکٹر زورؔ نے ان موضوعات پر لکھا جو نہ صرف اس زمانے میں بلکہ اس کے بہت بعد تک اُردو میں نئے تھے مثلاً زبانوں کی صوتی تبدیلی اور اس کے اسباب، دنیا کی زبانوں کے خاندان، ہند آریائی کی گروہ بندی وغیرہ۔ صوتی تبدیلی کا بیان آج کی معلومات کے لحاظ سے تشنہ ہے لیکن ہند آریائی کی تفصیلات آج بھی بیشتر صحیح ہیں۔ اس کتاب کے حصۂ دوم میں ہندوستانی کے آغاز اور ارتقا سے بحث کی ہے جس کا مرکزی حصہ ان کے اپنے نظریے کی تشریح ہے۔ اسے سب سے پہلے وہ اپنی انگریزی کتاب میں پیش کر چکے ہیں۔

اس حصّے کا ایک عالمانہ باب "ادبی بولیاں۔ گجراتی۔ دکنی۔ شمالی" اس میں ڈاکٹر زورؔ کے ڈی۔ لٹ کے نامکمل کام "گجراتی اردو" کی ایک جھلک دکھائی دیتی ہے۔ آج کے اہلِ قلم میں کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دکنی اور گجری مختلف بولیاں ہیں۔ انھیں ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے لیکن زورؔ صاحب نے دونوں بولیوں کے چار اختلافات پیش کیے اور اس طرح دکنی کو گجری سے ممیّز کیا۔ اگر وہ اس کام کو جاری رکھتے تو اس بولی کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا۔ دکنی اور گجری میں فرق کرنے کے بعد ڈاکٹر زورؔ نے دکنی اور شمالی اُردو کے اختلافات کا مجمل بیان کیا ہے۔ یہ وہی ہیں جو انگریزی رسالے میں تفصیل سے پیش کیے جا چکے ہیں۔

اپنے دو مضامین میں ڈاکٹر زورؔ نے کوئی نئی بات نہیں پیش کی۔ اُردو سے متعلق اپنے نظریے کا اعادہ کیا ہے ۱۹۲۸ء کے بعد اُردو اور ہندی کی تاریخی تحقیق بہت آگے بڑھ گئی ہے لیکن زورؔ صاحب کو اپنے نظریے کی صحت پر یہاں تک اعتماد تھا کہ وہ بعد کی تحقیقات کی روشنی میں ترمیم کے لیے آمادہ نہ ہوئے۔

مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر زورؔ کی لسانیاتی خدمات کا صحیح اور منصفانہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ نہ عقیدت کے جوش میں ہیرو پرستی کی گئی ہے نہ ۱۹۶۳ء کی عینک سے دیکھ کر خواہ مخواہ خوردہ گیری کی گئی ہے۔ اس جائزے سے روشن ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زورؔ کی طبیعت تاریخی لسانیات سے زیادہ تجزیاتی لسانیات بالخصوص صوتیات سے مناسبت رکھتی تھی۔ وہ ہمارے ملک کے ابتدائی علمائے صوتیات میں سے تھے۔ اگر وہ لسانیات سے قطع تعلق نہ کر لیتے بلکہ خود بھی پڑھتے لکھتے اور دوسروں کو بھی پڑھنے لکھنے پر مائل کرتے تو اُردو زبان اس صنف میں اتنی پچھڑی نہ ہو کر ہندوستان کی دوسری زبانوں کے دوش بدوش ہوتی۔

اصطلاحیں

انگریزی کی طرح ہندی میں لسانیات کی اصطلاحیں معیّن اور مستند ہوگئی ہیں۔ ہر مصنف انھیں مستند اصطلاحوں کو استعمال کرتا ہے۔ اُردو میں یہ منزل ابھی نہیں آئی۔ اُردو میں لسانیات پر بہت کم لکھا گیا ہے اس لیے اصطلاحوں کے تراجم اکثر انفرادی ہیں۔ مختلف لکھنے والے مختلف ترجمہ کرلیتے ہیں۔ اصطلاحوں کا مستند ترجمہ ایک کمیٹی کے کرنے کا کام ہے۔ ترقی اُردو بورڈ اس جہت میں کوشاں ہے۔

میں نے جن تراجم سے کام چلایا ہے ان کی فہرست درج ذیل ہے۔ اس مجموعے کے مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں اس لیے بعض صورتوں میں یہ بھی ہوگیا ہے کہ ایک مضمون میں ایک اصطلاح استعمال کی گئی ہے اور دوسرے میں اسی معنی میں کچھ اور۔ میں نے جس کو ترجیح دی ہے اُسے فہرست میں شامل کرلیا ہے۔ اس طرح اگر متنِ کتاب میں اور فہرست میں مندرج ترجمے میں اختلاف ہے تو فہرست کے اندراج کو فوقیت رہے گی۔

ان میں سے بعض اصطلاحوں سے میں خود مطمئن نہیں تاآں کہ ان سے بہتر ترجمے طے نہ ہوجائیں، انھیں سے کام چلایا گیا ہے۔ ذیل میں انھیں پہلے انگریزی کے حروفِ تہجی کی ترتیب سے اور پھر اُردو ترجمے کی ہجائی ترتیب سے درج کیا گیا ہے تاکہ انگریزی اور اُردو دونوں میں بآسانی تلاش کی جاسکیں۔

ENGLISH – URDU

Acoustic Phonetics	سمعی صوتیات
Africate	ایفریکیٹ
Allophone	ہم صوت
Alveola	مسوڑا
Anthropology	بشریات
Articulation	تلفظ
Articulator	تلفظ کار
Aspirated	ہکاری
Aspiration	ہکاریت
Back vowel	پچھلا مصوتہ
Bi-labial	دولبی
Bow-Vow-Theory	حیوانی آوازوں کا نظریہ
Cordinal vowel	بنیادی مصوتے
Case	حالت
Centeral Vowel	وسطی مصوتہ
Class Language	طبقاتی زبان
Coda	اخیریہ
Code	کوڈ۔ رمز
Communication.	ترسیل ۔ ابلاغ
Comparative grammar	تقابلی قواعد
Comparative philology	تقابلی لسانیات
Complimentary distribution	تکملی بٹوارہ
Component	اجزائے ترکیبی یا اوصاف ترکیبی
Concept	تصور

Consonant	مصوتہ
Consonantal Cluster	مصمتی خوشہ
Consonantal Vowel	مصمتی مصوتہ
Contact Theory	ارتباطی نظریہ
Dental	دنتی اشتقاق
Descriptive Linguistics	تجزیاتی لسانیات
Dialect	بولی
Dialect Atlas	بولی اٹیلس
Dialect geography	بولی جغرافیہ
Diaphragm	جھلی
Ding-Dong-Theory	مادّوں کا نظریہ۔ ڈنگ ڈانگ نظریہ
Diphthong	دِفتانگ۔ جڑواں مصوتہ
Distribution	بٹوارہ
Divine Theory	الوہی نظریہ
Emphasis	زور
Environment	ماحول
Etymology	لفظ اصلیات
Falling diphthong	گراوُ دِفتانگ
Flapped	دستکی
Fortis	کرخت
Free form	آزاد روپ
Free Variation	آزادانہ تغیّر
Fricative	صیفری
Front Vowel	اگلا مصوتہ
Gesture	اشارہ

Gesture Language	اشاروں کی زبان
Glide	لغزیہ
Glottal	گلوئی
Glottal chronology	لسانی زمانیات
Heiroglyph	نقش ِ مقدس ۔ ہیروغلیف
Hiatus	انقطاع
High Hindi	عالمانہ ہندی
Historical linguistics	تاریخی لسانیات
Homorganic	ہم مخرج
Ideography	تصور نگاری
Idiolect	انفرادی بولی
Indo-European	ہندیورپی
Inflection	تصریف
Internal open juncture	داخلی کھلا اتصال
Interlude	دخلیہ
International Phonetical Alpha-bet	بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط
Intonation	سُر لہر
Juncture	اتصال
Labio dental	لب دنتی
Larynx	مخرج الصوت
Lateral	پہلوئی
Length	طول
Lexicography.	تدوین اللغات
Linguistic Palaentology	لسانی قدیمیات
Linguistics	لسانیات

Linguistic Survey	لسانی جائزہ
Loan Words	مستعار الفاظ
Long Vowel	طویل مصوتہ
Low Hindi	سوتیانہ ہندی
Manner of Articulation	طریقِ تلفّظ
Mathematical Theory of Information	اطلاع کا ریاضیاتی نظریہ
Micro juncture	اقلی اتّصال
Minimal Pair	اقلی جوڑا
Morpheme	مارفیم
Morphology	صرف
Morpho-Phonetics	صرفی تجصوتیات
Motor Unit	مشینی اکائی
Mouth gesture Theory	حرکتِ دہن کا نظریہ
Nasals	غنائیے
Nasalisation	غنائیت
Nasal Sounds	غنائی اصوات
Natural Science	طبیعی سائنس
Natural Theory	فطرت کا نظریہ
Non-homorganic	مختلف المخرج
Non-Syllabic	غیر صوت رکنی
Onomatopoeic Theory	صوت مطابقت کا نظریہ
Palatal	تالوئی
Palato Alveolar	عقب لثوی
Palatogram	تالوئی نقشہ
Patois	گنوارو بولی

Peal	چوٹی
Pitch	صوت درجہ
Pharynx	حلقوم
Philology	لسانیات
Phoneme	صوتیہ
Phonemics	تجصوتیات
Phone	صوت
Phonetics	صوتیات
Phonetic Script	صوتی رسم الخط
Phonology	تجصوتیات
Point of Articulation	مقامِ تلفظ
Pooh - pooh - Theory	فجائی نظریہ
Primary stress	خاص بَل
Prominent	نمایاں
Prosody	عروض
Resonant	گونج دار
Retroflex	معکوسی
Rising Diphthong	اٹھاؤ دِفتانگ
Rounded	مدوّر
Root	مادّہ
Script	رسم الخط ۔ لپی
Secondary Stress	ثانوی بَل
Segment	قطعہ
Semantics	معنیات
Semi Vowel	نیم مصوتہ

Short Vowel	خفیف مصوتہ
Sibilant	سینیے
Sing-Song-Theory	نغماتی نظریہ
Sonority	گونج
Sonorous	گونج دار
Speech	نطق
Standard language	معیاری زبان
Stop	بندشیہ
Stress	بُل
Stressed	بُل دار
Structure	ڈھانچہ
Stylistics	اسلوبیات
Sub-dialect	ذیلی بولی
Sub-Standard language	ساقط المعیار زبان
Summer School of Linguistics	گرمائی اسکول لسانیات
Syllabic Consonant	صوت رکنی مصمتہ
Syllabic juncture	صوت رکنی اتّصال
Syllabic Stress	صوت رکنی بُل
Syllable	صوت رکن
Syntax	نحو
System	آئینِ مقررہ
Ta-Ta-Theory	اشاری نظریہ
Tertiary stress	ثلاثی بُل
Three Language formula	سہ زبانی فارمولا
Typology	لسانی نوعیات

Unaspirated	ہکاری
Un-rounded	غیر مدوّر
Uvular	لہاتی
Velar	نرم تالوئی
Velic	خلائے بینی
Vocal Chords	صوتی تار
Voiced	مصیتی
Voiceless	غیر مصیتی
Vowel	مصوتہ
Vowel Cluster	مصوتی خوشہ
Yo-He-Yo-Theory	اجتماعی محنت کا نظریہ

اُردو - انگریزی

اتّصال	Juncture
اٹھاؤ دِفتانگ	Rising diphthong
اجتماعی محنت کا نظریہ	Yo-he-yo-theory
ارتباطی نظریہ	Contact Theory
آزادانہ تغیّر	Free Variation
آزاد روپ	Free Form
اسلوبیات	Stylistics
اشارہ	Gesture
اشاروں کی زبان	Gesture language
اشاری نظریہ	Ta-ta-Theory
اشتقاق	Derivation
اطلاع کا ریاضیاتی نظریہ	Mathamatical theory of Information
اخیریہ	Coda
انقطاع	Hiatus'
اقلی جوڑا	Minimal pair
اقلی اتّصال	Mier juncture
اگلا مصوتہ	Front vowel
انفرادی بولی	Idiolect
الوہی نظریہ	Divine theory
اوصافِ ترکیبی یا اجزائے ترکیبی	Components
آئینِ مقرّرہ	System
ایفریکیٹ	Africate
بٹوارہ	Distribution

بشریات	Anthropology
بَل	Stress
بَل دار	Stressed
بندشیہ	Stop
بولی	Dialect
بولی ایٹلس	Dialect Atlas
بولی جغرافیہ	Dialect geography
بنیادی مصوّتے	Cordinal vowel
بین الاقوامی صوتیاتی رسم الخط	International Phonetical Alphabet
پچھلا مصوّتہ	Back vowel
پہلوئی	Lateral
تاریخی لسانیات	Historical Linguistics
تالوئی	Palatal
تالوئی نقشہ	Palatogram
تجزیاتی لسانیات	Descriptive Linguistics / Analitical Linguistics
تمصوتیات	Phonemics / Phonology
تدوین اللغات	Lexicography
ترسیل	Communication
تصریف	Inflection
تصوّر	Concept
تصوّر نگاری	Ideography
تقابلی قواعد	Comparative grammer
تقابلی لسانیات	Comparative Philology

Complimentary distribution	تکملی بٹوارہ
Articulation	تلفظ
Articulator	تلفظ کارعضو
Secondary stress	ثانوی بل
Tertiary stress	ثلاثی بل
Diphthong	جڑواں مصوتہ
Diaphragm.	جھلّی
Peak	چوٹی
Case	حالت
Mouth gesture Theory	حرکتِ دہن کا نظریہ
Pharynx	حلقوم
Bow-vow-Theory	حیوانی آوازوں کا نظریہ
Primary Stress	خاص بل
Short vowel	خفیف مصوتہ
Velic	خلائے بینی
Internal open juncture	داخلی کھلا اتصال
Interlude	دخلیہ
Flapped	دستکی
Diphthong	دفتانگ
Dental	دنتی
Bilabial	دولبی
Ding-dong Theory	ڈنگ ڈانگ نظریہ
Structure	ڈھانچہ
Sub-dialect	ذیلی بولی
Script	رسم الخط

Code	رمز، کوڈ
Emphasis	زور
Sub-standard Language	ساقط المعیار زبان
Intonation	سُر لہر
Acoustic Phonetics	سمعی صوتیات
Low Hindi	سوقیانہ ہندی
Three Language Formula	سہ زبانی فارمولا
Sibilants	سیٹیے
Morphology	صَرف
Morpho Phonemics	صرفی تجصوتیات
Fricative	صفیری
Phone	صوت
Pitch	صوت درجہ
Syllable	صوت رکن
Syllabic juncture	صوت رکنی اتصال
Syllabic Stress	صوت رکنی بل
Syllabic Consonent	صوت رکنی مصمتہ
Onomatopaeic Theory	صوت مطابقت کا نظریہ
Phonetics	صوتیات
Vocal chord	صوتی تار
Phonic Script	صوتی رسم الخط
Phoneme	صوتیہ
Class Language	طبقاتی زبان
Natural Science	طبیعی سائنس
Manner of Articulation	طریقِ تلفظ

Length	طول
Long Vowel	طویل مصوتہ
High Hindi	عالمانہ ہندی
Prosody	عروض
Palato Alveolar	عقب لثوی
Non-homorganic	مختلف المخرج
Non-syllabic	غیر صوت رکنی
Un rounded	غیر مدور
Voiceless	غیر مصیتی
Un-aspirated	غیر ہکاری
Nasal Sound	غنائی اصوات
Nasdlisation	غنائیت
Nasals	غنائیے
Pooh-pooh-Theory	فجائی نظریہ
Natural Theory	فطرت کا نظریہ
Segment	قطعہ
Foetis	کرخت
Un-rounded	کشیدہ
Open juncture	کھلا سنگم
Code	کوڈ، رمز
Falling diphthong	گراؤ دفتانگ
Summer school of Linguistics	گرمائی اسکول لسانیات
Glottal	گلوئی
Patios	گنوارو بولی
Sonority	گونج

گونج دار	Sonorous, Resonant
لب دنتی	Labiodental
لپی	Script
لسانیات	Philology, Linguistics
لسانیاتی جائزہ	Linguistic Survey
لسانی زمانیات	Glotto-chronology
لسانی قدیمیات	Linguistic Palaentology
لسانی نوعیات	Typology
لغزیہ	Glide
لفظ اصلیات	Etymology
لہاتی	Uvular
ماحول	Environment
مادّوں کا نظریہ	Ding-dong Theory
مادّہ	Root
مارفیم	Morpheme
مبداء	On-Set
مختلف المخرج	Non-homorganic
مخرج الصوت	Larynx
مدوّر	Rounded
مستعار الفاظ	Loan words
مسوڑا	Alveola
مشینی اکائی	Motor Unit
مصمتہ	Consonant
مصمتی خوشہ	Consonantal cluster

Consonantal vowel	مصمتی مصوتہ
Vowel	مصوتہ
Vowel cluster	مصوتی خوشہ
Voiced	مصیتی
Retroflex	معکوسی
Sementics	معنیات
Standard Language	معیاری زبان
Point of Articulation	مقامِ تلفظ
Syntax	نحو
Velar	نرم تالوی
Heiroglyph	نقشِ مقدس
Speech	نطق
Sing-Song Theory	نغماتی نظریہ
Prominent	نمایاں
Semi vowal	نیم مصوتہ
Central vowel	وسطی مصوتہ
Homorganic n	ہم مخرج ن
Aspirated	ہکاری
Aspiration	ہکاریت
Allophone	ہم صوت
Homorganic	ہم مخرج
Indo European	ہند آریائی
Heiroglyph	ہیروغلیف

کتابیات

۱۔ انگریزی کتابیں

1. Gleason : An Introduction to Descriptive Linguistics 1961
2. Hocbett: A Cource in Modern Linguistics.
3. A Manual of Phonology, 1955.
4. Block and Trager: Outline of Linguistic Analysis 1942.
5. Jesperson: Language.
6. Gray: Foundation of Language 1960.
7. D. Jones: An Outline of English Phonetics 1956.
8. D. Jones: The Phoneme, its nature and use 1949.
9. Max Muller: Lectures on the Science of Language. London 1891.
10. Whitney: Language and its Study of Language. London 1884.
11. Sturtevant : Linguistic Change, 1961.
12. Bloomfield : Language, 1955.
13. Graff: Langaage and Languages.
14. Diamond: The History and Origin of Language 1959.
15. Jacobson: Preliminaries Survey of India Vol. IX
17. Dr. Zore : Hindustani Phonetics 1930.
18. Dr. Masud Husain Khan : A Phonetic and Phonological study of Word in Urdu.
19. Official Language Commission Report.
20. Report of the Parliamentary Committee on Official Languagc.
21. Madan Gopal: This Hindi and Devnagri 1953.
22. M. P. Desai: Our Language Problem.
23. Ambika Parshad Bajpai: Persian Influence on Hindi.

(۲) ہندی

ا۔ کتابیں:

۱۔ بھاشا وگیان از ڈاکٹر بھولاناتھ تواری۔ طبع چہارم ۱۹۶۲ء
۲۔ بھاشا وگیان از شیام سندر داس۔ طبع پنجم
۳۔ سامانیہ بھاشا وگیان از ڈاکٹر بابورام سکسینہ طبع ششم
۴۔ ہندی بھاشا کا اتہاس از ڈاکٹر دھریندر ورما طبع چہارم
۵۔ ہندی بھاشا اور لپی از ڈاکٹر دھریندر ورما۔
۶۔ گرامین ہندی از ڈاکٹر دھریندر ورما
۷۔ ہندی بھاشا کا ادگم اور وکاس از ڈاکٹر اودے نرائن تواری۔ طبع اوّل
۸۔ بھاشا شاستر کی روپ ریکھا از ڈاکٹر اودے نراین تواری طبع اوّل
۹۔ ہندی ساہتیہ کا اتہاس از رام چندر شکل مطبوعہ سمبت ۲۰۰۲
۱۰۔ بھارتیہ آریہ بھاشا اور ہندی از ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی۔ ہندی ترجمہ از گوپی ناتھ سیٹھ ۱۹۵۴ء
۱۱۔ ہندی ویاکرن از کاتنا پرشاد گرو
۱۲۔ ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا اتہاس از ایودھیا سنگھ
۱۳۔ بھاشا وگیان اور ہندی از ڈاکٹر سوریہ پرشاد اگروال
۱۴۔ بھاشا اور سماج از ڈاکٹر رام بلاس شرما
۱۵۔ دیوناگری لپی، سوروپ، وکاس اور سمسیائیں مرتبہ جوگلیکر
۱۶۔ راج رشی ابھی نندن گرنتھ میں مشمولہ چند مضامین

ب رسالوں کے مضامین:

۱۔ "راجستھانی بھاشا اور بولیاں" از جے۔ نراین ویاس۔ رسالہ پریرنا परेरणा जून ۱۹۵۴ء
۲۔ مضمون از ڈاکٹر راجیندر پرشاد مشمولہ راج بھاشا۔ ۷ر فروری ۱۹۵۶ء ناشر سندیہ ہندی پریشد
۳۔ "ہندوستان کی سبھی بھاشاؤں کے لیے ناگری لپی مانیہ ہو" از ونوبابھاوے مشمولہ راج بھاشا بابت ۲۴ر مئی ۱۹۶۰ء
۴۔ ہندی اور سنسکرت میں انوسوار اور انوناسکیہ وینجن از ڈاکٹر رمیش چند مہروترا، مشمولہ "مدھیہ بھارتی، حصہ دوم" ہندی رسالہ ساگر یونیورسٹی ۱۹۵۹ء

(۳) اُردو

۱. کتابیں:

۱۔ زبان اور علمِ زبان از پروفیسر عبدالقادر سروری طبع اوّل

۲۔ ہندوستانی لسانیات از ڈاکٹر زور طبع دوم

۳۔ ہندوستانی لسانیات کا خاکہ از جون بیمز مترجمہ احتشام حسین طبع دوم

۴۔ وضع اصطلاحات از وحیدالدین سلیم

۵۔ اردو رسمِ خط اور طباعت از ہارون خاں شروانی

۶۔ زبانِ اُردو اور اس کا رسم خط از سید مسعود حسن رضوی

۷۔ اُردو املا از غلام رسول ادارہ ادبیاتِ اُردو حیدرآباد

۸۔ مشترکہ زبان از مہاتما گاندھی طبع اول۔ انجمن ترقی اردو ہند

۹۔ سخندانِ فارس از محمد حسین آزاد

۱۰۔ انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ از عبداللہ یوسف علی

۱۱۔ ہندی ادب کی تاریخ از ڈاکٹر محمد حسن

۱۲۔ خطباتِ عبدالحق حصہ دوم طبع اوّل

۱۳۔ اُردو کی ہندی بحریں توسیع اور اضافے از گیان چند مشمولہ نذرِ ذاکر

ب۔ رسالوں کے مضامین:

۱۔ داستانِ زبانِ اُردو از ڈاکٹر شوکت سبزواری رسالہ اُردو اپریل ۱۹۵۶ء

۲۔ اُردوئے معلّٰی لسانیات نمبر۔ جلد سوم، شمارہ ۴۔ ۵۔ شعبۂ اُردو دلّی یونیورسٹی۔

۳۔ "اُردو اور ہندی کا تلفظ" از ڈاکٹر گراہم بیلی۔ اُردو ترجمہ از چودھری محمد نعیم اردو ادب دسمبر ۱۹۵۶ء

۴۔ "کشمیری زبان کے لیے ایک رسم الخط" از حیات اللہ انصاری اُردو ادب دسمبر ۱۹۶۰ء

۵۔ "اُردو کی آوازیں" از گیان چند اُردو ادب۔ شمارہ ۴۔ ۱۹۶۱ء

۶۔ "اُردو اور دوسری زبانوں کا اُردو میں املا اور صحیح تلفظ" از ڈاکٹر شہید اللہ۔ قومی زبان کراچی ۱۶ اگست و یکم ستمبر ۱۹۵۹ء

۷۔ "اُردو میں صوتیاتی اصطلاحیں" از گیان چند۔ قومی زبان کراچی جنوری تا مارچ ۱۹۶۳ء

۸۔ "اُردو الفاظ کی رومن املا" از شان الحق حقی۔ اُردو نامہ کراچی۔ اپریل تا جون ۱۹۶۱ء

۹۔ "قدیم دکنی اور اُردو کا تقابلی مطالعہ" از ڈاکٹر سہیل بخاری ۔ اردو نامہ کراچی۔ اکتوبر تا نومبر ۶۴ء

۱۰۔ ترقیِ اردو بورڈ کے املا نامے پر ایک نظر از گیان چند ماہِ نو کراچی مارچ ۱۹۶۳ء

۱۱۔ ہندوستانی صوتیات سرسوتی سرن کیف نیا دور لکھنؤ مارچ ۱۹۶۱ء

۱۲۔ اُردو مصوتوں کی صحیح تعداد از گیان چند نیا دور ستمبر ۱۹۶۱ء

۱۳۔ اُردو کی اصوات اور صوتیے از گیان چند نقوش جولائی ۱۹۶۲ء

۱۴۔ اُردو کی ہائیہ آوازیں از ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ نقوش جون ۱۹۶۳ء

۱۵۔ تحقیق و تصحیحِ متن کے مسائل از ڈاکٹر نذیر احمد نقوش مارچ ۱۹۶۳ء

۱۶۔ "اُردو کے چند گوزی تجصو تیے" از گیان چند ہماری زبان یکم اگست ۱۹۶۱ء، ۱۵ اگست ۱۹۶۱ء
۱۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء

۱۷۔ اُردو ہندی الفاظ اور انگریزی املا از گیان چند ہماری زبان ۸ مارچ ۱۹۶۲ء و ۱۵ مارچ ۱۹۶۲ء

۱۸۔ آغازِ نطق سے اُردو تک از گیان چند مجلہ سیفیہ۔ سیفیہ کالج بھوپال ۶۲-۱۹۶۱ء

۱۹۔ اُردو ٹائپ میں تلفظ کا مسئلہ نوائے ادب جولائی ۶۲ء

۲۰۔ سترھویں صدی کی ادبی دکھنی کے مخلوط الصرف الفاظ از آزاد نصیر الدین شماتوف۔ سب رس
حیدر آباد مارچ ۱۹۶۵ء

۲۱۔ اُردو کا قدیم ترین ادب از ڈاکٹر سہیل بخاری نقوش۔ شمارہ ۱۰۲

مطبوعات

انیس کے مرثیے

مرتبہ: صالحہ عابد حسین   20/- روپے

زبان اور قواعد

رشید حسن خاں   17/- روپے

فنِ طباعت

بلجیت سنگھ مطیر   7.25 روپے

یورپ کے عظیم سیاسی مفکرین

ڈاکٹر ہاشم قدوائی   15.50 روپے

معاشیات کے بنیادی اصول (حصّہ اوّل)

سراج الحسن   12.25 روپے

آریہ سماج کی تاریخ

(ترجمہ) کشور سلطان   10/50 روپے

انسانی ارتقا

ڈاکٹر ایم. آر. ساہنی   13.75 روپے

اُجرتیں

(ترجمہ) عبدالرشید   10.50 روپے